معاصر مذہبیات

چند فکری اور سماجی پہلو

سید ثاقب اکبر

البصیرہ پبلی کیشنز اسلام آباد

نام کتاب	:	معاصر مذہبیات: چند فکری اور سماجی پہلو
مصنف	:	سید ثاقب اکبر
اہتمام اشاعت	:	مولانا عرفان حسین
ناشر	:	البصیرہ، پاکستان
اشاعت	:	اول، 2020ء
کمپوزنگ	:	اکرام حسین
ڈیزائننگ	:	حیدر نقوی
قیمت	:	700 روپے

ISBN:978-969-9438-26-4

ڈاک کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 1416 اسلام آباد
البصیرہ، شاہ اللہ دتہ، اسلام آباد
0306-5566771 --- 051-2218005
Email:ukhuwat@gmail.com
facebook/albasirahpublication

انتساب

خیر طلب روحوں،

خیر اندیش عقلوں،

خیر خواہ دلوں اور

خیر زاد قلموں

کے نام

سید ثاقب اکبر

حرفِ چند

دینی ومذہبی مسائل پر مطالعے، غوروفکر، تبادلۂ خیال اور مذاکرے کے دوران میں گوناگوں مسائل پیش آتے رہتے ہیں، حقائق آشکار ہوتے رہتے ہیں اور مختلف مواقع پر بیان ہوتے رہتے ہیں۔ تجربات ومشاہدات کی بھی ایک دنیا ہے۔ بدلتے حالات بھی نئے زاویہ ہائے نگاہ کو واضح کرتے ہیں۔ ایجادات کا بھی ایک سلسلہ ہے اور دریافتیں بھی ہیں جو تھمنے کا نام نہیں لیتیں۔ انسان کی فطرت بھی حقائق شناسی کا ایک سرچشمہ ہے۔ عقل انسانی کے اپنے کرشمے ہیں۔ عالمی سیاسی حالات بھی نئے دھاروں کا پتہ دیتے ہیں۔ تاریخ بھی قوموں کے تجربات کی امین ہے اور اتار چڑھاؤ کی جائیگاہ ہے۔ قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں اپنے اندر موجود کچھ قوانین وضوابط کا پتہ دیتی ہیں۔ بڑے لوگوں کی پیش گوئیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ماضی میں ان کی پے در پے صداقتوں کے نشان ملتے ہیں۔ دینی ادبیات اور دینی متون کی شناخت معنی خیز بھی ہے، معرکہ آراء بھی۔ کلام قدیم اور کلام جدید کی بحثیں ہیں۔ الحاد ودین گریزی کی ابھرتی اور پھیلی لہریں ہیں۔ قدیم روایت سے جڑے لوگوں کے ساتھ بزم آرائیاں ہیں۔ تعلیم یافتہ افراد کے طرح طرح کے سوال ہیں۔ جب شب وروز ان سب کا سامنا کرتے، ان موضوعات اور پہلوؤں کا مطالعہ ومشاہدہ کرتے، سنتے، دیکھتے، سوچتے اور کلام کرتے گزرتے ہوں تو پھر رخشِ قلم کی جادہ پیمائیاں ''معاصر مذہبیات'' ہی کو معرض دید میں لاتی ہیں۔

ہر کسی کا اپنا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ اس لیے کیا ضروری ہے کہ دو افراد کی فکر ایک جیسی ہو! البتہ دلائل وشواہد ہم آہنگی کو وجود میں لا سکتے ہیں اور لاتے بھی رہتے ہیں۔ فکر وکلام الجھنیں پیدا بھی کر سکتے ہیں اور انھیں سلجھا بھی سکتے ہیں۔ ہماری نیت البتہ ایجاد ہم آہنگی کی اور سلجھانے کی ہے۔ اختلاف رائے کا ہم حق دیتے ہیں، یہی حق طلب بھی کرتے ہیں۔ حسن نیت البتہ ضروری

ہے۔ خطا کا امکان دونوں طرف ہے، جہاں عصمت کا دعویٰ نہیں وہاں یہ امکان ہونا بھی چاہیے۔ سچ کا سفر جاری رہتا ہے۔ حق کی تلاش جاری رہنا چاہیے کہ جمود بہت خطرناک ہے۔ بدگمانی بھی حق شناسی کی راہ کو مسدود کر دیتی ہے۔

ہم نے اپنا توشۂ فکر ونظر احباب کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے خطاؤں اور کوتاہیوں کی بخشش اور عفوودرگزر کی عاجزانہ درخواست ہے۔

''معاصر مذہبیات'' کے مطالعے اور بازنگری میں عزیزم مفتی امجد عباس کے تعاون پر ان کا ممنون ہوں۔ دیگر تمام احباب جن کے تعاون کے بغیر یہ اوراق اس صورت میں آپ کے ہاتھوں میں نہ پہنچ سکتے تھے، ان سب کا شکر گزار ہوں۔

احباب کی رائے ہمارے لیے ہمیشہ معتبر ہوتی ہے۔

ربنا تقبل منا O اللّٰھم صلی علی محمد و آلہ الابرار الاطہار

ثاقب اکبر

۲۲ رمضان کریم ۱۴۴۱ھ

شاہ اللہ دتہ......اسلام آباد

باب اول

******

معاصر کلامی واجتہادی مباحث

۱۔۱۔علم کلام کے جدید مباحث

۱۔۱۔۱۔کیا عقلی مسائل میں بھی تقلید ہوسکتی ہے

برصغیر میں جدید علم الکلام کی ضرورت کے سب سے پہلے نقیب سرسید احمد خان تھے۔ پھر دیگر بہت سے افراد نے بھی اس ضرورت کی وضاحت میں اپنا حصہ ڈالا۔ یہ ممکن ہے کہ سرسید کے انداز فکر، نتائج فکر، ان کی فکر کے منبع و مصدر سے اختلاف کیا جا سکے لیکن اس بات کو بہر حال قبول کرنا پڑے گا کہ انہوں نے بڑی جرأت مندی سے دنیا میں نئے علوم کی پیش رفت کے نتیجے میں جو نئے سوالات دین و دینی فکر کو پیش آئے، ان کا سامنا کیا اور ان کا جواب دینے کی کوشش کی۔ ان کے بعد کچھ اور لوگ بھی آئے جنہوں نے جزوی طور پر اس کام کو آگے بڑھایا لیکن یہ سلسلہ جس بیدار مغزی وقوت سے آگے بڑھنا چاہیے تھا اس قوت سے آگے نا بڑھ سکا۔ میرے خیال میں ہمیں سب سے پہلے یہ طے کرنا ہے کہ کیا عقلی مسائل میں بھی تقلید ہوتی ہے؟ علم الکلام میں جو مسائل زیر بحث آتے ہیں اگر وہ عقلی ہیں اور وحی کے تناظر میں زیر بحث نہیں آتے تو کیا اس میں بھی ہمیں تقلید ہی کرنا ہے؟ میرا خیال ہے کہ اس میں ہمیں واضح طور پر کہنا چاہیے کہ نہیں، ہم ان مسائل میں تقلید نہیں کریں گے۔

۱۔۱۔۲۔اکابر اور عقل کا استعمال

جو موضوعات ہیں ہی عقلی اور ہمارے اکابر و اسلاف نے بھی ان پر عقلی انداز سے ہی بات کی ہے، ان پر ہم آج اپنی دانش و بصیرت کے مطابق ہی بات کریں گے۔ جیسے یہ ان کا حق تھا اسی طرح یہ ہمارا بھی حق ہے۔ اسی سے ہم جدید علم الکلام کے دائرے میں داخل ہوں گے۔ عموماً اہل تشیع کے ہاں یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ کہی جاتی ہے، اگرچہ اس پر اس طرح عمل نہیں ہوتا کہ اصول دین میں کوئی تقلید نہیں ہے، یعنی توحید کی شناخت میں، نبوت کے مسئلے میں یا معاد کے

مسئلے میں تقلید نہیں ہے، تقلید فروع دین میں ہے۔ میرے خیال میں اسے مزید کھول کے بیان کیا جانا چاہیے کہ اگر ان امور میں تقلید نہیں ہے تو ہمیں شناخت و مسلک کو بچانے کے لیے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ فلاں نے اس مسئلہ میں یہ عقیدہ و نظریہ اختیار کیا اور چونکہ اس کا قد اور مرتبہ اتنا بڑا ہے اس لیے میں اس کی پیروی کروں گا۔

ا۔ا۔۳۔کیا واقعاً وحی یہ بات کہتی ہے؟

اسی طرح ایک مسئلہ وحی کا ہے کہ وحی یہ کہتی ہے اور وحی کا یہ موضوع ہے۔ میرے خیال میں یہ فیصلہ بھی کرنا چاہیے کہ وحی یہ بات کہتی بھی ہے یا نہیں کہتی؟ بہت ساری جگہوں پر وحی نہیں کہہ رہی ہوتی بلکہ کسی مولوی صاحب یا کسی امام کا فہم وحی ہوتا ہے جسے ماننے پر اصرار کیا جا رہا ہوتا ہے۔ اس مسئلے کو بھی بہت واضح ہونا چاہیے۔ اسی طرح قرآن کے بارے میں یہ واضح ہونا چاہیے کہ کیا قرآن نے یہ بات زمان و مکان کے حدود میں کی ہے یا اپنے اولین مخاطبین کو سامنے رکھ کے کوئی بات کی ہے ؟ اور یہ بات کیا آگے چلے گی؟ اس میں کیا چیز ہمارے لیے اسوہ ہے؟ میرے خیال میں ہمارے لیے اتنی چیز اسوہ ہے کہ مخاطبین اولین کے سطح علم، فہم وتعامل کو سامنے رکھ کر کوئی حکم دیا گیا، جن بنیادوں پر یہ حکم دیا گیا، کیا ان بنیادوں اور شرائط کے تبدیل ہو جانے پر بھی یہ حکم اپنی جگہ برقرار رہے گا؟ اس کی مثال قرآن کریم کی وہ آیت ہے کہ جس میں دشمن کے خلاف طاقت جمع کرنے کے لیے گھوڑے وغیرہ پالنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا آج بھی یہ حکم بعینہ ایسے ہی چلے گا یا آج کے گھوڑے کچھ اور ہو جائیں گے؟ ایسی چیزوں کو دوبارہ دیکھنا پڑے گا۔ میں کئی دفعہ عورت کی گواہی کے مسئلہ میں سوچتا ہوں کہ لوگ کہتے ہیں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ مجھے تو یہ بات قرآن میں نظر نہیں آتی۔ قرآن کہتا ہے دوسری اس لیے ہے کہ اگر پہلی بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔ تو گواہی تو ایک ہی کی ہوئی نا، گواہی تو دو کی نا ہوئی۔ اب میرا سوال یہ ہے کہ اگر مرد بھول جائے تو کیا کوئی عورت یا مرد اس کو یاد نا دلائے؟ یہ عام انسان کے سوالات ہیں، ان سوالات کو زور زبردستی سے روکنا مسائل کا حل نہیں۔ فتویٰ کے زور پر انسانی سوچ پر پہرا اور قدغن لگانا بہت بڑا ظلم ہے۔ آپ مضبوط و عمدہ دلیل کی بنیاد پر بات کریں۔ پھر مخاطب آپ کی دلیل قبول کر لے یا مقابلے

میں کوئی اس سے عمدہ و مضبوط دلیل پیش کر دے، یہ طریقہ ہونا چاہیے۔

۱۔۱۔۴۔ظنی دلیل اور عقاب

ایک اور نقطہ یہ ہے کہ ہمارا فہم نظامِ اسلامی فقہی تصورات کے گرد گھومتا ہے اور فقہی استنباطات زیادہ تر ظنیات سے ماخوذ ہیں۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ظنی دلیل پر عمل نا کرنے کی وجہ سے عقاب دے گا! اگر اس سوال کا جواب صحیح مل جائے تو فہم دین اپنے اصل دائرے میں واپس آجائے اور جو چیزیں انسانی تجربات و مشاہدات سے تعلق رکھتی ہیں انھیں ہر دور کے اہل علم و بصیرت کی طرف راہنمائی کے لیے لے کے جانا پڑے گا۔ اس بات پر اب کتابیں آ گئی ہیں کہ نبی کریمؐ نے سوسائٹی میں پہلے سے رائج کون کون سے احکامات کو اس بنیاد پر باقی رکھا کہ وہ آپؐ کی تعلیمات سے متصادم نہیں تھے۔ کیا ایسے ہر حکم کے پیچھے وحی ہے؟ وحی کا تقاضا یہی معلوم ہوا ہے کہ اگر کوئی خاص زمانہ یا خاص دور شریعت کے کسی ظاہری حکم سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہاں شریعت کے اُس حکم کے مقصد کی حفاظت کی جائے۔ اس کی مثال وہ واقعہ ہے جس میں حضور اکرمؐ کے والد گرامی حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کے بدلے سو اونٹ قصاص کے طور پر ایک انسانی جان کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ اب انسانی جان کی قیمت کے پیش نظر یہ ایک معیار معاشرے میں رائج تھا جس کو آپؐ نے دیت کے طور پر باقی رکھا۔ اب ایسے ہر حکم کے پیچھے کہ جو معاشرے میں پہلے سے رائج تھا، ہم نے وحی کو ماننا ہے یا پھر یہ ماننا ہے کہ نبی کریمؐ یہ سمجھتے تھے کہ یہ میرے مقاصد دینی اور شرعی کے زیادہ مطابق ہے اس لیے اسے رائج ہونا چاہیے۔ اسی طرح پہلے سے رائج مسائل میں کوئی ترجیح و ترتیب قائم ہو سکتی تھی تو وہ قائم کی گئی، جیسے غلامی کے مسئلے میں کہ جتنا انسان کی آزادی کے مسئلے پر عمل ہو سکتا تھا آپؐ نے کیا اور باقی کو تدریج پر چھوڑ دیا۔ اب غلامی بالکل ختم ہو چکی ہے۔

۱۔۱۔۵۔فلسفہ، کلام اور فقہ کا باہمی تعلق

ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ فقہ و کلام اور فلسفہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ فلسفے نے کلام کو متاثر کیا ہے اور پھر کلام نے فقہ کو۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ نہ ہمارے مدارس میں اور

نہ ہی یونیورسٹیوں اور دانش گاہوں میں ان موضوعات پر مطالعات ومباحث ہوتے ہیں کہ کیسے جدید فلسفہ، کلام وفقہ کو متاثر کر رہا ہے۔ کاش کہ ہم مدارس میں ان موضوعات پر کوئی کتاب یا دستاویز فراہم کرسکیں جوان سوالات پر مشتمل ہو جو جدید دور میں پیدا ہوئے ہیں، تا کہ دین کے فہم کی طرف آنے والا طالب علم ان سوالات کا سامنا کرے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کے ماحول میں وسعت زیادہ ہوتی ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہاں پر بھی جدید کلامی مسائل کے موضوعات پر ریسرچ نا ہونے کے برابر ہے۔

۱۔۱۔۶۔ عالمگیریت اور دین

اسی طرح عام طور پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا عالمگیریت کے اس دور میں دین کی کوئی ضرورت باقی بھی رہی ہے یا نہیں؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ میرا خیال ہے کہ دین کا وہی تصور باقی بھی رہے گا اور عالمگیریت کی راہنمائی بھی کرے گا جو آفاقی ہوگا۔ چھوٹی چھوٹی جزیات کے گرد گھومنے والا تصور دین یا تصور مذہب مفید نہیں رہے گا۔ اس سے نکل کر دین کی وہ آفاقی تعلیمات اور کلیات جو سب نبیوں کے مابین مشترک ہیں، انہیں دریافت کرنا پڑے گا اور فقہی طور پر یہ نظریہ درست معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے تعاملات میں جو مشترکات ہیں انہیں بنیاد بنانا پڑے گا لہذا نماز، روزہ، زکوۃ، حج کو اسی تناظر میں دیکھنا ہوگا اور جزوی معاملات اور بہت سے دیگر معاملات کو انسان کے تجربے وعقل پر چھوڑ دینا ہوگا۔ گویا انسانی کی عقل کی توہین سے ہمیں اجتناب کرنا پڑے گا۔ وحی کی عظمت، معجزات کی ماہیت پر سوالات ہوں گے، سوال کو آنے دیں، سوال ہوگا تو آپ جواب دیں گے، دلیل دیں گے تو دوسرا آپ کی دلیل کو اہمیت دے گا اور ماننے کا امکان پیدا ہوگا۔

۱۔۲۔علم کلام اور بدلتے تقاضے

۱۔۲۔۱۔علم کلام کیسے معرض وجود میں آیا

عرب کے سادہ صحرائی معاشرے میں سادہ مگر گہرے دلائل کے ساتھ دین کی بنیادی تعلیمات پہنچا دی گئیں۔اجڈ بدو گہری علمی دلیلوں کو کب مانتے تھے۔وقت گزرتا گیا مسلمان معاشرے میں جغرافیائی توسیع ہوتی رہی۔سرزمین حجاز کتابوں اور مطالعے کی سرزمین نہ تھی۔اس لیے بھی ''اقرا'' سے آغاز سخن ہونا زیادہ معنی خیز ہو جاتا ہے۔لکھنے پڑھنے کا شوق آسمان ہدایت سے اترنے والی کتاب کی برکت اور پیغمبر اسلام کی ترغیب وتشویق سے پروان چڑھنے لگا۔

جب تہذیب وتمدن کے عالمی مراکز سے رابطہ ہوا تو دانش مندانِ عالم کی کتب سے آگاہی شروع ہوئی، کتابوں کے ترجمے ہوئے۔فلسفہ، ریاضی، طب اور ہیئت وغیرہ کے قدیمی علوم نے علم کے نئے معرکے برپا کر دیے۔سماجی اور عقیدتی موضوعات پر مبنی کتابوں نے نئے موضوعات چھیڑ دیے۔نئے نئے سوالات پیدا ہوئے۔کیا، کیوں اور کیسے زبانوں پر آنے لگا۔اسلامی تعلیمات اور خاص طور پر عقائد کے بارے میں نئی موشگافیاں ہونے لگیں۔ان پر کلام ہونے لگا۔کلام کے جواب میں کلام کیا جانے لگا۔عرب محاورے کے مطابق ''الکلام یجرّ الکلام'' حقیقت بن گیا اور یوں علمِ کلام معرض وجود میں آنے لگا۔بعض موضوعات زیادہ اہمیت اختیار کر گئے۔سوال اور پھر سوال، جواب اور پھر جواب سے کلامی مکاتب فکر پیدا ہونے لگے۔اس حوالے سے افراط وتفریط بھی ہوئی۔دینی عقائد اس کا موضوع تھے لہٰذا ان کلامی نظریات کو تقدس بھی حاصل ہونے لگا۔اس سے بات بڑھ بھی گئی۔تاہم اپنے مقام پر علم کلام کی ضرورت اور عقائد کی پڑتال، تبیین اور تعریف اور نتیجۃً دینی عقائد کی حفاظت میں اس کے کردار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔جہاں تک افراط وتفریط کے اثراتِ بد کا تعلق ہے وہ آج سبق آموز بھی ہو سکتا ہے۔ہماری نظر میں خاص طور پر

اس کا جدلی انداز قابل نقد ہے۔

۱۔۲۔۲۔مظاہر تہذیب کا تغیر اور علم کلام

تہذیبوں میں ارتقاء کے مختلف مراحل ہوتے ہیں کبھی تبدیلیاں تیز رفتار ہوتی ہیں کبھی تیز رفتار ہونے کے ساتھ ساتھ گہری بھی ہوتی ہیں۔تہذیبوں میں اتار چڑھاؤ کا علوم وافکار کے اتار چڑھاؤ سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ انسانی آگاہی اور طرز فکر ہے جو حکمتِ عملی اور اندازِ عمل میں تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ یہ سلسلہ وسیع ہوتا جائے تو مظاہرِ تہذیب وتمدن کی تبدیلی پر منتج ہوتا ہے۔

مغرب میں کلیسا کے زوال اور سیکولرزم کے رواج نے عقل وخرد کی دنیا ہی بدل دی۔ جدید فلسفے کی جرأتِ رندانہ نے افکار کی رنگا رنگی کو جنم دیا۔ مادی کائنات کی تسخیر کے انسانی عزم نے معجزے کر دکھائے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی سرعت انگیز ترقیوں نے آنکھیں چندھیا دیں۔تبدیلیاں سرحدوں اور سمندروں کے اس پار اثرات مرتب کرنے لگیں۔عالمِ مشرق کی دنیائے مذہب تک بھی یہ غلغلہ آ پہنچا۔ اہلِ مذہب نے مختلف انداز سے اس کا استقبال کیا۔ انکار،توجیہ،دفاع،تصدیق،شک،مرعوبیت اور عدم التفات جیسے کئی انداز تھے۔اُدھر تبدیلیوں کا سلسلہ جاری ہے اور اِدھر کم وبیش مذکورہ انداز بھی جاری ہیں۔کبھی اقبال گلہ مند ہوئے:

ے اُدھر دگرگوں ہے لحظہ لحظہ
اِدھر بدلتا نہیں زمانہ

مذہب کو درپیش چیلنجز اور مذہبی عقائد کے سامنے اٹھتے سوالات متقاضی تھے کہ اہلِ مذہب سینہ سپر ہوں،قبول کریں یا جواب دیں۔ جو صورت بھی اختیار کریں اس کا مطلب نئے علم کلام کی ضرورت کو قبول کرنے کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔

ہندوستان،مصر،ایران وغیرہ سے ایسے مردانِ کار اٹھے جنھوں نے اس تقاضے کو سمجھا اور اپنے اپنے سلیقے اور فہم کے مطابق دادِ سخن دی۔ان کے جواب سے اتفاق یا عدم اتفاق،جزوی اتفاق یا جزوی اختلاف کا حق تو آزاد اندیشوں کو پہنچتا ہے لیکن ان کے اقدام کی داد دیے بغیر چارہ نہیں۔

اس سلسلے کی ایک مشکل دور غلامی کا ساختہ ذہن ہے اور اس سے بھی پہلے اسباب غلامی کا عدم

ادراک۔ شاید اسے ایک ہی مطلب کے لیے دو پیرایۂ اظہار کا نام دے دیا جائے، بہر حال دونوں باتیں یا دونوں انداز قابل غور ہیں۔ زوال و عروج کی وجوہ تو ہوتی ہیں۔ قومیں حیات و موت اور ارتقاء و تنزل کی حامل بھی ہوتی ہیں۔ جب تک معاشرے میں وہ ذہن غالب نہ آجائے جو عالمِ تنزل میں وجوہِ تنزل اور اسبابِ پیش رفت کا ادراک رکھتا ہو، مثبت تبدیلیوں کا خواب نہیں دیکھا جاسکتا۔

۱۔۲۔۳۔ نئے علم کلام کی مشکل

نئے علم کلام کی بھی یہ مشکل ہے۔ مغرب نے نئے افکار کی بنیاد پر نئی دنیا تعمیر کی وہ افکار، رائج مذہبی فکر سے بغاوت سے عبارت تھے۔ ان افکار کا کلیسا کی قیادت کو ہی سامنا نہ تھا اہل قبلہ بھی مسئول اور جواب دہ تھے۔ اہل قبلہ کی مذہبی قیادت نے اپنے آپ کو واقعاً مسئول سمجھا یا نہیں، اس سے قطع نظر سطحِ فہم کا مسئلہ جواب سے بھی زیادہ اہم تھا۔ مختلف طرح کے جوابات جن کی طرف سطور گذشتہ میں اشارہ کیا گیا، ان کے تنوع کی وجوہات اسی مخمصے میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

برصغیر میں مختلف نام، مختلف ردِّعمل اور اس ردِّعمل کی مختلف نوعیت پر، شہادت کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، امیر علی، نیاز فتح پوری، علامہ اقبال، غلام احمد پرویز، بانیانِ دارالعلوم دیوبند، مولانا مودودی وغیرہ اس کی مختلف مثالیں ہیں۔ افراط یا تفریط کا الزام تو کسی پر بھی لگایا جاسکتا ہے، جو ایک آسان کام ہے لیکن مجموعی طور پر یہ بات سب کے بارے میں کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے بدلتی دنیا کا احساس کیا اور نئے پیش آمدہ مسائل کے سامنے اپنے آپ کو مسئول سمجھا۔

مسلمان خطوں کی سیاسی آزادی کے بعد روشوں میں کچھ تبدیلی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ آزادی کا احساس بھی تحریروں میں بہتر طور پر جلوہ گر ہے لیکن ایک طرف یہ آزادی کامل نہیں، دوسری طرف اہل مذہب بحیثیت مجموعی وسائل فکر اور طرز فکر کے حوالے سے بنیادی مسائل کی طرف ابھی نہیں آئے۔

بعض سیاسی و مذہبی انقلابات اور علاقائی سطح کے اتار چڑھاؤ نے بھی افکار میں جوار بھاٹا پیدا کیا ہے۔ بعض بنیادی بحثیں چھڑی ہیں اور بعض اساسی سوالات سامنے آئے ہیں، اُن پر ردِّعمل کی

کیفیت زوال سے کمال کی طرف سفر کو سرعت بخشنے کی صلاحیت کی نشاندہی نہیں کرتی۔

ا۔۲۔۴۔ نئے سوال کا جرأت سے سامنا کیجیے

بات مختصر کی جائے، ہماری رائے یہ ہے کہ علم کلام کے حوالے سے ہمیں جرأت کے ساتھ ایسے سوالوں کا سامنا کرنا ہوگا:

(۱) دین کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے؟

(۲) دین کی ضرورت کیا ہے؟

(۳) نبی کی ضرورت اور مقصد بعثت نبوی کیا ہے؟

(۴) وحی کی ماہیت اور حیثیت کیا ہے؟

(۵) عقل اور وحی کا تعلق کیا ہے؟

(۶) دین شناسی میں عقل کی حیثیت کیا ہے؟

(۷) احکام دینی انسان کے لیے ہیں یا انسان ان کے لیے ہے؟

(۸) کیا فلسفۂ احکام کا یقینی تعین کیا جا سکتا ہے؟

(۹) اجتہاد میں زمان و مکان کی حیثیت کیا ہے؟

(۱۰) انسانی فطرت اور مذہبی احکام کا باہمی تعلق کیا ہے؟ وغیرہ

ایسے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے افراط وتفریط کا امکان بھی ہے جیسے کہ پہلے اس کا وقوع ہو چکا ہے لیکن آزادیٔ رائے، احترام آزادی اور باہمی اعتماد کے ساتھ مکالمے کی فضا پیدا کر کے ہم بالآخر پیش آمدہ کلامی مسائل کا بہتر جواب دینے کے قابل ہو جائیں گے۔ عدم برداشت، جمود اور تحجر نے پہلے بھی نقصان پہنچایا ہے اور اب بھی اسی راستے سے مذہب اور اہل مذہب کے لیے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ دین کی آفاقیت کا تقاضا اور دفاع دین کی ضرورت بھی یہی ہے۔ ایسے ہی سوالات کا علی وجہ البصیرت جواب دینے سے نیا علم کلام معرض وجود میں آئے گا اور آ رہا ہے۔

۱۔۳۔فہم دین میں زمان ومکان کے عناصر کی اہمیت

۱۔۳۔۱۔دین کے مستقل عناصر

دین کے بعض پہلوتو ایسے ہیں جہاں زمان ومکان اثر انداز نہیں ہوتے، ہاں البتہ معارف اور فہم کی گہرائی اور وسعت میں فرق آسکتا ہے، جیسے علوم کی بنیادیں ہوتی ہیں۔علوم کی کلیات عام طور پر نہیں بدلتیں، جیسے علم الحساب پرائمری سطح کے بچے کے لیے جو بنیادیں فراہم کرتا ہے، وہی اگلے مرحلے پر وسعت اور گہرائی کے ساتھ طالب علموں پر کھلتی رہتی ہیں۔مڈل کا طالب علم ایک قدم آگے بڑھتا ہے، علم الحساب میں میٹرک کا طالب علم ایک قدم اور آگے بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ پی ایچ ڈی تک علم الحساب کی وہ بنیادیں اور کلیات تبدیل نہیں ہوتیں جو پرائمری کے طالب علم کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔

دینی معارف بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں اور انسانوں کی ان تک رسائی بھی مختلف درجے کی ہوتی ہے، حتیٰ کہ انبیاء کی بھی۔

ہماری پہلی بات کہ انبیاء ورسل کے لیے معارف کی کلیات تبدیل نہیں ہوتیں، کی تائید قرآن حکیم کی اس آیت سے ہوتی ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ[1]

ہم اپنے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

دوسری بات کہ فہم کی گہرائی اور وسعت میں فرق آسکتا ہے یا دوسرے لفظوں میں معرفت کی گہرائی اور وسعت میں فرق آسکتا ہے، کے لیے اس آیہ مجیدہ سے شہادت لی جاسکتی ہے:

---

[1]) بقرہ:۲۸۵

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ [1]

یہ رسول ہیں جن میں بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت عطا کی ہے۔

بعض روایات میں مختلف آسمانوں پر معراج کی رات آنحضرتؐ کا مختلف نبیوں سے ملاقات کرنا شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جیسا کہ روایات میں آیا ہے کہ پہلے آسمان سے لے کر ساتویں آسمان تک آنحضرتؐ کی ملاقات مختلف انبیاء سے ہوئی۔

پہلے آسمان پر آپؐ کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور پھر مختلف آسمانوں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی جب کہ ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آسمان دراصل انبیاء کے مدارج و مراتب کی طرف اشارہ ہیں۔ اس میں شک نہیں ہونا چاہیے کہ یہ فرق درجۂ معرفت کے فرق پر منتج ہوتا ہے جس میں حقیقت معرفت تبدیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں انبیاء کی معرفت کے ایک سرچشمے اور اس کی ایک حقیقت کی طرف مختلف آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْکَ کَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِہٖ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰہِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِیْسٰی وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْنُسَ وَ ہٰرُوْنَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا [2]

ہم نے آپ پر یوں وحی کی جیسے ہم نے نوح اور ان کے بعد کے نبیوں پر وحی کی اور اسی طرح ہم نے وحی کی ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اسباط، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر اور داؤد کو ہم نے زبور عطا کی۔

اس سلسلے میں ایک اور آیت میں لفظ دین کے ساتھ اس مسئلے کی صراحت کی گئی ہے:

شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْکَ

[1] بقرہ: ۲۵۳

[2] نساء: ۱۶۳

وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰۤى[1]

اس نے تمھارے لیے دین میں سے وہی کچھ مقرر کیا جس کی وصیت نوح کو کی گئی تھی اور جسے (اے محمد!) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی وصیت ہم ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو کر چکے ہیں۔

جب کہ کمال کے مرحلے طے ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہنچی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا[2]

آج کے دن ہم نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا ہے۔

البتہ ہماری گفتگو زیادہ تر دین کے دوسرے حصے سے متعلق ہے جو تبدیلیوں کا میدان ہے۔

علمائے اسلام کے مابین اس بات پر اتفاق ہے کہ پوری تاریخ انبیاء میں دین اپنی کلیات کے اعتبار سے تبدیل نہیں ہوا لیکن شریعتیں تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ توحید اور آخرت کا عقیدہ تبدیل ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اخلاقیات، انسانوں کے باہمی تعاون اور شرف انسانیت کا قانون واصول بھی تبدیل ہونے والا نہیں۔ کسی معاشرے میں دوسروں کے قبول شدہ حقوق پر تجاوز کو بھی ہر دور میں ظلم ہی قرار دیا گیا ہے۔ اللہ کے بندے اس کی معرفت حاصل کریں اور اس کے نتیجے میں ان کے دلوں میں اس کی طلب پیدا ہو جائے جس کا اظہار وہ عبودیت اور بندگی سے کریں، دین کا یہ تصور بھی تبدیلی کی گنجائش نہیں رکھتا۔

۱۔۳۔۲۔ شریعتیں بدلتی رہتی ہیں

تبدیل ہونے والے قوانین معاشرے سے متعلق ہی ہو سکتے ہیں۔ گزشتہ نبیوں کے ادوار میں اس تبدیلی کو شریعت کی تبدیلی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاہم اگر جذبۂ بندگی غیر متبدل

[1] شوریٰ: ۱۳

[2] مائدہ: ۳

ہے تو اظہارِ عبودیت کا انداز ضرور تبدیل ہوسکتا ہے۔اس کی ایک مثال آخری پیغمبرؐ کے دور میں قبلہ کا تعین ہے۔گزشتہ اقوام میں قبلہ کا تصور کچھ ایسا مضبوط دکھائی نہیں دیتا۔بعض میں ہے، بعض میں اس کے تصور کی تاریخ شہادت نہیں دیتی۔اسی طرح روزے کے تفصیلی احکام بھی مختلف دکھائی دیتے ہیں۔نماز کا انداز نیز نماز میں پڑھی جانے والی عبارتیں بھی مختلف رہی ہیں اور ہوسکتی ہیں۔اللہ کو یاد کرنے کے لیے اور احکامِ دین کو بیان کرنے کے لیے زبانیں بھی مختلف رہی ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ عبادت کا طریقہ انبیاء ہی تعلیم دے سکتے ہیں اور وہی امتوں کے لیے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے تو اس پر ہمارے نزدیک کلام کی گنجائش کم ہے البتہ اس کم گنجائش کو ہم اجتہادی معیارات کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور ایسے مسائل کو اجتہادی مسائل میں سے سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں علماء کے استنباط میں فرق اس امر کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ یہ مسائل زیادہ تر اجتہادی حدود کے اندر ہیں۔اس کی مثال قبلہ کا رخ واضح نہ ہونے کی صورت میں نماز کے لیے رخ کا تعین ہے۔

۱۔۳۔۳۔سماجی مسائل اور مظاہر تہذیب

جہاں تک سماجی مسائل اور معاملات زندگی کا تعلق ہے تو اس میں شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہی تغیرات کا محل ہے۔کبھی زمانہ اثر انداز ہوتا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ حکم بدل جائے تو کبھی مکان، جغرافیہ اور علاقہ کی تبدیلی حکم کی تبدیلی کی متقاضی ہوتی ہے۔

انسانی تہذیب وتمدن کے ارتقاء اور تیز رفتار تبدیلیوں نے حکم کی تبدیلیوں کے تقاضے بڑھا دیے ہیں۔کائنات کی معرفت کی وسعت نے، انسانی علوم کے ارتقاء نے، تجربات وشواہد کے پھیلاؤ اور تنوع نے، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہوش ربا ترقی نے، ایک سیارے سے دوسرے سیارے تک انسان کی رسائی نے اور نئے جہانوں کی دریافت نے دنیا ہی بدل دی ہے۔

میڈیکل سائنس کے متنوع شعبوں کی پیش رفت نے، علم نفسیات اور بشریات وسماجیات کے علوم کے ارتقاء نے انسانی فکر کے انداز کو تبدیل کر دیا ہے۔

عالمی اداروں اور عالمی قوانین کے بننے سے، تجارت کی نئی شکلوں کے پیدا ہونے سے، لین دین کے طریقوں کی تبدیلی سے، ریاستوں کے جدید تصور سے، آئین وقانون کی بنیادوں پر معاشروں کے چلن سے، فلسفۂ قانون وفلسفۂ تعلیم میں پیدا ہونے والے تصورات سے بھی بہت کچھ تبدیل ہوگیا ہے۔

زبان و بیان کے علوم نے نئی جہتیں پیدا کر دی ہیں۔ متون کی پرکھ کے لیے نئے نئے علوم وجود میں آچکے ہیں۔ زبانوں کے ارتقاء کے بارے میں نظریات اور فلسفوں میں گہرائی پیدا ہوگئی ہے۔ حروف اور لفظوں کی شناخت کا چند صدیاں پہلے کا علم جو پہلے آسمان پر ٹھہرا ہوا ہے، جب اوپر کے دیگر آسمانوں کی طرف دیکھتا ہے تو حیرت میں کھو جاتا ہے۔

پوری دنیا میں بچوں، عورتوں اور مردوں کے حقوق اور قانونی مساوات کی طرف پیش رفت کا سلسلہ جاری ہے۔ تشکیل خاندان کے معاملات بھی طرح طرح سے زیر بحث ہیں۔

ایسے میں دین کے حقائق پر ایمان رکھنے والوں کو انسانیت کے لیے کوئی مثبت اور تعمیری کردار ادا کرنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تمام حقائق کو سامنے رکھیں۔ جمود، تحجر، رجعت پسندی اور ٹھہراؤ کا رویہ اپنانے سے ارتقاء کے تیز رفتار قافلوں اور کاروانوں کا راستہ نہیں روکا جاسکتا۔

انسان کی کلوننگ کے امکانات نے تو سوچنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ خدا جانے کلوننگ سے تیار کردہ افراد کی قانونی حیثیت پر کیا سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کے سماجی کردار کا تعین کیسے ہوگا اور بڑی طاقتوں نے اپنی ٹیکنالوجی کی قوت سے ایسے ہزاروں، لاکھوں انسان بنا لیے تو وہ موجود انسانیت کے ساتھ کیا کھلواڑ کریں گے۔ انسان جتنا سوچتا چلا جاتا ہے حیرت کی نئی دنیا نمودار ہوتی چلی جاتی ہے۔

انسان جمادات کی الیکٹرونک ٹرانسمیشن کر کے اب حیات کی ٹرانسمیشن کے امکانات پر تجربات کر رہا ہے۔ جنس کی تبدیلی کے تو بہت سے کامیاب تجربات ہو چکے ہیں۔

اگر ہماری ان باتوں میں سچائی کا عنصر موجود ہے تو پھر جمود پر اصرار تنزل اور پستی کی طرف لے

جانے کے سوا کسی نتیجے پر نہیں پہنچائے گا۔ کسی ایک مسئلے کی مختلف جہتوں کے پیش نظر، ہر جہت کے ماہر کو اس مسئلے کے حل کے لیے شریک مشورہ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ثبوت و اثبات اور حقائق تک پہنچنے کے طریقے مختلف ہو گئے ہیں۔ اب اگر زبان نہ بولے تو اسی دنیا میں ہاتھ شہادت دینے لگے ہیں۔ ایسے میں قدیم قانون شہادت کے طریقوں پر جم جانا علم و دانش کے کس اصول کے تحت روا ہے؟

ا۔۳۔۴۔علوم کے ارتقا پر نظر ضروری ہے

ہم جانتے ہیں کہ اہل مذہب کی ایک بڑی تعداد اجتہاد کی ضرورت و اہمیت کی قائل ہے بلکہ زیادہ تر علماء کی رائے ہے کہ وہ اجتہاد سے ہی گزر کر کسی حکم تک پہنچتے ہیں، تاہم ہماری رائے یہ ہے کہ جزوی طور پر اس بات میں صداقت ہونے کے باوجود، جاری اور مروج اجتہاد، علوم کے ارتقاء اور دریافت شدہ حقائق کی وسعت اور تاثیر سے بڑی حد تک بے گانہ ہے۔ اگر ہر شعبے کے متعلقہ ماہرین سے مسئلے میں رجوع نہیں کیا جاتا، اگر مسئلے کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مشاورت اور مذاکرہ سے نہیں گزرا جاتا اور اگر کہیں کوئی مجلس فقاہت قائم بھی ہے تو وہ زمان و مکان کی گوناگوں تبدیلی اور علوم میں ہونے والی پیش رفت پر نظر نہیں رکھتی تو وہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نتیجوں تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔

ا۔۳۔۵۔کاروبار حیات چل رہا ہے

اہل مذہب کو اس حوالے سے اس بات کو بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ دنیا کی بیشتر جمعیت اور بڑی تعداد میں ممالک ان کے نتائج فکر پر نظر کیے بغیر کاروبار حیات میں مگن ہیں اور ریاستوں اور اداروں کا نظام چلا رہے ہیں۔ خود مسلم دنیا میں بھی علمائے دین کہلانے والے محترم احباب کے مبلغِ علم اور طرزِ تفکر کی طرف اعتناء نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے، بعض معاشروں کا استثناء البتہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف مذہب کے نام پر شدت پسندی بلکہ تشدد و دہشتگردی نے مذہب کو نئے چیلنجز سے دوچار کر دیا ہے۔ بڑی تعداد میں ایسے لوگ دین اور مذہب کی ترجمانی کے منصب پر آ بیٹھے ہیں جو تمام تر عصری پیشرفت اور تہذیبی مظاہر کو ملیامیٹ کر دینے کو ہی دین کا تقاضا سمجھتے ہیں۔

ا۔۳۔۶۔دانشِ فقہ کی بازنگری

ہماری ناچیز رائے میں دانشِ فقہ کی حدود اور رائج اصولوں کی بازنگری اور ان پر ایک نگاہ

بازگشت بہت ضروری ہوگئی ہے۔ وہ دور بدل گیا جب استنباط کے فقہی اصول اخذ کیے گئے تھے اور جنھیں اب بھی اجتہادی عمل میں بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اصول فقہ کی تاریخِ ارتقاء پر نظر ڈالی جائے تو ماضی میں یہ اصول تبدیل ہوتے رہے ہیں اور ان کے اندر داخلی شرائط اور قیود میں بھی تبدیلی آتی رہی ہے۔ قواعد بھی نئے سے نئے بنتے رہے ہیں اور تبدیل ہوتے رہے ہیں، جب ماضی میں یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے تو اب کیوں نہیں ہوسکتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خود اصول فقہ کے ڈھانچے اور استنباط کے معیارات اور طرزِ عمل پر ازسرِنو غور وفکر کی ضرورت ہے۔

ا۔۳۔۷۔ سماجی قوانین میں ارتقا کا اصول

یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ انبیاء کے ادوار میں اور خاص طور پر آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں معاشرتی اور سماجی قوانین کا ارتقاء کس طرح سے ہوا۔ کن اصولوں کی بنیاد پر موجود قوانین کو اپنا لیا گیا اور کس فلسفے کی بنیاد پر ان میں تبدیلی کی گئی۔ کیا کسی رائج قانون کا اپنایا جانا یا کسی موجود قانون میں تبدیلی پیغمبر کی معرفت کلی کی بنیاد پر تھی یا ڈکٹیشن کی بنیاد پر؟ پیغمبر کی معرفت کلی اور باطنی حقائق کے ادراک کا سرچشمہ یقینی طور پر باطنی تھا اور عالم غیب سے ان کے اتصال کا نتیجہ تھا لیکن ان کی عقل وخرد اور فہم وفراست کو اس اتصال نے معطل نہیں کر دیا تھا۔ ہاں البتہ عالم قدس وغیب سے ان کے ارتباط کی وجہ سے ان کے فیصلے کی نہج یقیناً الٰہی تھی۔

ا۔۳۔۸۔ جزئیات کے لیے دائمی قانون نہیں ہوسکتا

ایک اور پہلو سے دیکھیں تو وہ دین جسے ہر دور اور ہر علاقے کے لیے بھیجا گیا ہے اور جسے ہمیشگی ودوام حاصل ہے، اس کا دارومدار کلیات اور اصولوں پر ہی ہوسکتا ہے۔ زندگی کی ہر تفصیل اور ہر جزئی کے بارے میں دائمی فیصلہ نہ فقط انسانی عقل وخرد کو معطل کر دینے اور معاشرے میں جمود کا باعث بنتا ہے بلکہ بدلتی ہوئی حقیقتوں کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے سماج سے غیر متعلق ہوجاتا ہے اور ایسا خالق کائنات کی طرف سے پسندیدہ دین کے لیے فرض نہیں کیا جاسکتا جو خود انسان کی عقل و فطرت کا خالق ہے۔

۱۔۴۔علامہ اقبال کے تصور اجتہاد کی اہمیت و معنویت

علامہ اقبال نے اسلام کے تصور اجتہاد کے بارے میں اپنے خطبے کی اساس اجتہاد کے حوالے سے اپنے اس نظریے پر رکھی ہے کہ یہ اسلام کا اصول حرکت ہے۔ اقبال کے اس تاریخی خطبے پر گذشتہ تقریباً ایک صدی میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ جہاں اقبال کے پیغام کو خوش آمدید کہنے والے اہل دانش وفکر کی کمی نہیں وہاں اس ضمن میں ان کے افکار کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانے والوں کی بھی ایک دنیا آباد ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ علامہ اقبال کے اجتہاد کے بارے میں خطبے کی بعض تفصیلات اور مثالوں پر زیادہ تنقید کی گئی ہے البتہ روح مطلب پر اعتراض کی گنجائش بہت کم ہے۔ ہماری نظر میں ان کے خطبے کی بنیادی بات یہ ہے کہ وہ ہر دور میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھنے پر اصرار کرتے ہیں اور فقہ کی دنیا میں جمود اور ٹھہراؤ کے مخالف ہیں۔ یہ وہ بات ہے جو آج عالم اسلام کے بیشتر علماء اور دانشور قبول کرتے ہیں۔ علامہ اقبال سے پہلے اور بعد میں ایسے قدآور علمائے اسلام اور مفکرین گزرے ہیں اور آج بھی ہیں جو اس نظریے کی اصابت کے قائل ہی نہیں مروج بھی ہیں۔ علامہ اقبال کے پیش نظر خطبے کی دوسری اہم بات عمل اجتہاد کو عصری تقاضوں کی روشنی میں آگے بڑھانے سے متعلق ہے۔ پارلیمنٹ کے ذریعے اجتہاد کے بارے میں ان کی تجویز کا مقصد اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اسی کے ضمن میں یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ علامہ اقبال انفرادی اجتہاد کے بجائے دور حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کے قائل ہیں۔ ہم اقبال کے تصور اجتہاد کی انھیں اساسات کی روشنی میں چند نکات ذیل میں اہل نظر کی خدمت میں غور وفکر کے لیے پیش کرتے ہیں:

☆ انسان کی فکری کاوشوں کو انسانی سطح پر رکھا جائے اور انھیں الٰہی سطح پر قرار نہ دیا جائے۔ تمام علماء کے فتاویٰ اور اجتہادات انسانوں کی اپنی فکری کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

☆ جیسے استنباطِ حکم انسانی کاوش ہے اسی طرح علم اصول فقہ بھی انسانی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ غور وفکر اور نقد ونظر کا کام ہر دو سطح پر جاری رہنا چاہیے۔

☆ حدیث کی جمع آوری، تطبیق، علم حدیث میں کانٹ چھانٹ اور بحث ومباحثہ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا ہے۔ ترکی میں حال ہی میں حدیث کی تدوینِ نو کا مرحلہ سر کیا گیا ہے۔ ماضی میں دیے گئے فتاویٰ کا نئی کاوشوں کی روشنی میں جائزہ لیا جانا اور بازنگری ضروری ہے۔

☆ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علمائے حدیث اور ائمہ حدیث نے حدیث کے مجموعے مرتب کیے۔ ماضی میں فقہ کی تدوین اپنے اپنے مکاتب فکر سے متعلقہ احادیث کے مجموعوں کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے۔ اب تو مشترکہ احادیث کے مجموعے موضوعی لحاظ سے مرتب ہو چکے ہیں۔ اس لیے فقہ کی تدوینِ نو یا ماضی کے مستنباطات کی نئی معلومات اوران ذخائر کی روشنی میں پرکھ کی ضرورت ہے۔

☆ انسانی سوسائٹی کے نئے تجربات، نئی تخلیقات کے انسانی زندگی پر اثرات، آئینی حکومتوں کے قیام، بہت سے مسلمان ملکوں میں قانون سازی کے جدید اداروں کی تشکیل، عالمی اداروں کے قیام، عالمی قوانین سے مسلمان ملکوں اور معاشروں کی وابستگی، نئے سے نئے اقتصادی اداروں کے قیام، پیچیدہ اور تہ در تہ اقتصادی وتجارتی قوانین کا نفاذ، مواصلات کی تیز رفتار ترقی کے انسانی زندگی پر اثرات، طبی حوالے سے پیدا ہونے والے نو بہ نو مسائل، خلانوردی کے بڑھتے ہوئے امکانات، مختلف قوموں، مذاہب، اور تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی مشترکہ زندگی کے نئے پہلو اور انسانی زندگی کے ایسے بہت سے جوانب انسانی زندگی کی مسلسل حرکت اور بہاؤ کا پتہ دیتے ہیں۔ عرف بدلتے جا رہے ہیں اور زندگی نئی سہولیات کے ساتھ ساتھ نئی پیچیدگیوں اور امکانات کا سامنا کر رہی ہے۔ اسی کو زمانے کا بدلنا کہتے ہیں اور عمل اجتہاد میں حکم زمان ومکان سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ اجتہاد ہی نہیں کہلا سکتا۔ کبھی موضوع بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے اور کبھی موضوع نہیں بدلتا خارجی حالات تبدیل ہو جاتے ہیں جو حکم کی تبدیلی پر منتج ہوتے ہیں۔

☆ پہلے ہی ہر مکتب فقہ میں ایک ایک حکم پر ایک سے زیادہ فتاویٰ موجود ہیں جو ماضی میں فقہاء

کے عدم جمود کے نظریے پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ماضی کی کاوشیں ہمارے لیے آج بھی راہنما ہیں لیکن اس سرمائے سے عصری تقاضوں کی روشنی میں استفادے کی ضرورت ہے۔

☆ اجتہاد کا اصل میدان پیش آمدہ مسائل ہیں۔ اصل نظام عبادات اور عبادات کی بنیادی شکلیں تبدیل نہیں کی جاسکتیں۔ امت واحدہ کی تشکیل، شکل وصورت اور خارجی تشکل انھیں عبادات کی شکل وصورت اور ان کے مسلمہ نظام الاوقات سے جڑی ہوئی ہے۔ زمان ومکان کے بعض ناگزیر تقاضے ان پر بہت جزوی اور وقتی اثرات ڈالتے ہیں اور حکم ثانوی کا ایک مورد شاید اسلام کا نظام عبادات ہے جبکہ حکم ثانوی اضطراری اور وقتی ہوتا ہے۔

☆ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ عقائد وکلام کے اثرات استنباط حکم پر مرتب ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ہوتے ہیں۔ اگر ہم اجتہاد کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں تو کلام جدید کی طرف بھی توجہ دینا پڑے گی۔ لہٰذا ہمارے علمائے کرام کو جدید کلامی موضوعات کی طرف بھی آنا پڑے گا اور آج کے تعلیم یافتہ اذہان اور دانشوروں کے افکار میں ابھرنے والے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

☆ فقہی عمل میں عقل کے کردار کا تعین بھی ضروری ہے۔ جب دین کی بنیادوں اور اصولوں کی شناخت کے لیے پہلے عقل کی طرف رجوع ضروری ہے اور جب قرآن کریم بار بار عقل وفکر سے کام لینے کی دعوت دیتا ہے تو فقہی حکم کی تلاش میں عقل کی حیثیت کا تعین بھی ضروری ہے۔ نصوص کو سمجھنے اور ان کی حیثیت کے تعین کے لیے بھی عقل کی کارفرمائی ضروری ہے۔ البتہ اس کے لیے تفصیلی بحث کی ضرورت ہے تاکہ اس کی حدود وقیود کو طے کیا جاسکے۔

☆ دنیا میں آج قومی ریاستوں کا وجود ہے۔ ملکوں کے اپنے اپنے آئین اور قانون موجود ہیں۔ مملکتوں کے آئین وقانون کی حیثیت کا تعین بھی ضروری ہے۔ خاص طور پر ان موارد میں جہاں کوئی آئینی شق یا قانون کسی کے فقہی مکتب یا فہم سے ٹکراتا ہو۔

☆ معرفت انسان کے حوالے سے مختلف علوم معرض وجود میں آچکے ہیں ان تمام علوم میں پیش

رفت جاری ہے۔ فقہی حکم اگر انسانوں کے لیے ہے تو پھر انسان کی معرفت، حکم کے بیان سے پہلے ضروری ہے۔ اگر ہمارا یہ مقدمہ درست ہے تو پھر علماء کو معرفت انسان کے اہم موضوعات کو نہ فقط خود پیش نظر رکھنا ہوگا بلکہ انھیں اپنے نصاب تدریس تعلیم کا حصہ بھی بنانا ہوگا تاکہ حکم بیان کرنے سے پہلے جس کے لیے حکم بیان کیا جارہا ہے اس کی شناخت ہو سکے۔

☆ قرآن حکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جن احکام کو ہم الٰہی احکام کہیں وہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہوں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ جس نے انسان کی فطرت بنائی ہے وہ اس کی فطرت کے خلاف حکم دے سکے۔ ہماری رائے میں فطرت کا موضوع اصول فقہ کے مرحلے پر زیر بحث آنا چاہیے۔

☆ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر دانا اور فہمیدہ شخص خطاب کرتے ہوئے اپنے مخاطبین اولین کی سطح معلومات اور فہم وضروریات کو ضرور پیش نظر رکھتا ہے۔ ایسے میں کیسے ممکن ہے کہ قرآن یا پیغمبر اکرمؐ نے اس اصول کو اختیار نہ کیا ہو۔ اگر یہ بات درست ہے تو قرآن وسنت میں سے آج کے دور کے انسانوں کے لیے یا کسی بھی سرزمین کے لوگوں کے لیے کسی حکم کے بیان کرنے سے پہلے ان کی سطح معلومات اور فہم وضروریات کا ادراک ضروری ہے۔

☆ دور نبوی میں قانون کے ارتقاء کی حکمت عملی کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے کیونکہ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آپؐ نے بعض رائج قوانین کو اپنی تعلیمات سے ہم آہنگ پایا، انھیں من وعن باقی رہنے دیا۔ بعض میں جزوی ترمیم کی اور بعض کی جگہ پر متبادل قانون متعارف کروایا۔ آپؐ نے عرف کا خیال رکھا۔ قانون سازی کے اسی اصول کو ہر دور میں اختیار کیا جانا چاہیے اور اُس دور کے قوانین کو آج پر منطبق کرتے ہوئے قانون سازی کی یا نفاذ قانون کی پیغمبرانہ روش کو سامنے رکھا جانا چاہیے۔

☆ تمام علوم میں تخصص کا طریقہ کار اختیار کرلیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مختلف حوالوں سے پیش رفت کررہا ہے۔ انسانی معاشرہ پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ آج یہ امکان نہیں رہا کہ ایک شخص زندگی کے تمام شعبوں سے متعلقہ قوانین پر یا قانون سازی کے طریقے پر مہارت رکھتا

ہو۔ اس لیے بہت سے دانشوروں کی رائے یہ ہے کہ اجتہاد کو بھی موضوعی ہونا چاہیے اور اسلامی قانون کے شعبے میں بھی تخصص سے استفادہ کرنا چاہیے۔ کوئی ایک فقیہ تمام شعبوں میں ضروری آگاہی حاصل نہیں کر سکتا، لہٰذا ماہرین اور متخصصین پر مشتمل کمیٹیوں کو یہ کام سپرد کیا جانا چاہیے۔

☆ اس سوال کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ کیا مقصد متعین کے لیے ہر دور اور ہر علاقے میں ایک ہی قانون پر اصرار کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف زمانوں اور علاقوں کی ضروریات اور شرائط مختلف ہوتی ہیں جو مختلف قوانین کی متقاضی ہوتی ہیں۔ یہ بات کم از کم جزوی لحاظ سے درست ہے۔

☆ یہ امر بھی اپنی جگہ پر حقیقت ہے کہ آج مسلم اور غیر مسلم دنیا میں قانون سازی جاری ہے۔ علمائے اسلام کا اس میں کردار کتنے فیصد رہ گیا ہے؟ ہمارے علمائے کرام جن امور پر اپنے فہم قانون کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں وہ عالمی طور پر قانون کے مختلف شعبوں کے پیش نظر بہت کم ہیں۔

☆ بہت سے روشن فکر علماء دین شناسی اور شرعی قوانین کے حوالے سے مقاصد شریعت پر نظر رکھنے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پہلو بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہم اس سلسلے میں صرف ایک بات کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ مقاصد شریعت پر بحث کرنے سے پہلے انبیاء کی بعثت کے مقصد پر بحث کر لینا ضروری ہے اور پھر اگلے مرحلے میں قانون کو اس مقصد سے ہم آہنگ رکھنا بھی ضروری ہے۔

ا۔۵۔احیائے فکر دینی میں علامہ اقبالؒ
اور استاد مرتضیٰ مطہریؒ کا کردار

پیش نظر مطالب البصیرہ کے زیر اہتمام 20 نومبر 2011 کو منعقد ہونے والے سیمینار ''احیائے فکر دینی میں علامہ اقبال اور استاد مرتضیٰ مطہری'' میں میزبان کی حیثیت سے پیش کیے گئے۔ یہ سیمینار مقتدرہ قومی زبان (جس کا اب نام بدل دیا گیا ہے) کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ (ادارہ)

ا۔۵۔ا۔ابتدائے سخن

صدر مجلس اور خواتین و حضرات! میں اپنا یہ خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں کہ ملک کے طول و عرض سے آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہوں۔ انھوں نے ہمارے شارٹ نوٹس پر ہماری دعوت کو پذیرائی بخشی اور ہماری درخواست پر انھوں نے مقالے بھی لکھے اور آج اس سیمینار ''احیائے فکر دینی میں علامہ اقبال اور استاد مطہری کا کردار'' میں وہ اپنے اپنے افکار پیش بھی کر رہے ہیں۔ ہمارے مہمانان گرامی ملک کے گوشے گوشے سے تشریف لائے اور راولپنڈی و اسلام آباد سے بھی ہمارے دانشور حضرات نے اس سیمینار میں شرکت کر کے واقعی اسے ایک قومی سیمینار کی شکل دے دی ہے۔

ا۔۵۔۲۔معماران انقلاب اور اقبال

دیکھنا یہ ہے کہ آج ہم اس سیمینار میں علامہ اقبال اور استاد مطہری کو جو اکٹھا یاد کر رہے ہیں یہ کس تناظر میں ہے۔ انھوں نے جو خدمات اسلامی فکر کی تعبیر نو کے لیے انجام دی ہیں وہ اہل دانش

سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اقبال کے پیغام نے نہ صرف مسلمانوں کے اذہان کو متاثر کیا بلکہ اس کے اندر وہ قوت موجود ہے جو دلوں کو گرماتی ہے اور یہ پیغام لہروں کی طرح دلوں سے اٹھتا ہے اور قوموں کے اندر ایک اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب اسلامی ایران سے وابستہ تمام معماران انقلاب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے انقلاب میں بنیادی روح جن ہستیوں کی فکر نے پیدا کی ان میں حکیم الامت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا نام سرفہرست ہے۔ یہ بات ہمیں عجیب اس لیے نہیں لگتی کہ ایران کے موجودہ روحانی پیشوا آیۃ اللہ سید علی خامنہ ای فرماتے ہیں کہ ''من مرید اقبال ہستم'' (میں اقبال کا مرید ہوں)۔ اگر اس اسلامی ملک کا روحانی رہبر جو آج اس مملکت کی راہنمائی کر رہا ہے، اس طرح کہہ رہا ہو تو پھر یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اس انقلاب کی رشد و نمو میں علامہ اقبال کی فکر کا کس قدر اثر ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری اور بیشتر کلام بھی فارسی زبان میں ہے۔ وہ فارسی بھی اس طرح کی ہے کہ آج کے تہران کا ایک سکالر بھی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اقبال نے ان کی زبان میں، انہی کی طرز سے ان سے بات کی ہے۔ آج کا ایران کا پڑھا لکھا نوجوان بھی علامہ کے فارسی کلام اور آپ کی فکر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ آپ کے فارسی کلام کی تاثیر اسلامی ممالک میں اس قدر زیادہ ہے کہ پورا عالم اسلام اس سے قوت حاصل کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

۱۔۵۔۳۔ اقبال کے تراجم کا اثر

آپ کے کلام کا عربی میں بھی ترجمہ ہوا اور انگریزی میں بھی اس کے تراجم ہوئے ہیں جس کی وجہ سے علامہ کی فکر سے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم اقوام بھی متاثر ہیں کیونکہ علامہ اقبال کا اپنے دور کے بڑے بڑے دانشوروں سے رابطہ بھی رہا جن میں جرمنی، فرانس اور انگلینڈ کے بڑے بڑے دانشوروں کے نام نمایاں ہیں۔ اس لیے ان کا پیغام پوری دنیا میں پہنچا۔ علامہ اقبال کو جدید فلسفی اصطلاحات پر بھی عبور تھا۔ مغربی فلسفے اور فکر نیز جدید تہذیب کی فکری بنیادوں پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پیغام خاصا موثر طریقے سے مشرق و مغرب میں پہنچا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جس طرح باقی قومیں اپنے محسنوں کا دن مناتی ہیں پاکستان میں وہ حق ادا

نہیں ہو رہا۔ ایسی شخصیات کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ میدان فکر و عمل سے خارج ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہی کچھ پاکستان میں علامہ اقبال کے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔

ایک وقت تھا جب ملک میں یوم اقبال بڑے شایان شان طریقے سے منایا جاتا تھا۔ سکولوں اور کالجوں میں سیمینار، کانفرنسیں، جلسے اور محافل ہوتی تھیں۔ اُس وقت علامہ اقبال کی فکر اور فلسفے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں ہوتی تھیں۔ آج وہ سب کچھ نظر نہیں آتا۔ آج اس مقام پر مقتدرہ قومی زبان کے آڈیٹوریم میں، میں یہ بات کہتا ہوں کہ جس طرح اردو زبان سے انحراف اور اس کی جگہ انگریزی زبان کا تسلط ہوتا چلا جا رہا ہے اگر یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا رہا تو شاید آنے والے وقتوں میں علامہ اقبال، وارث شاہ، بلھے شاہ، مرزا غالب اور ان جیسے ہمارے دیگر مفکرین و شعراء کے کلام اور ان کی فکر سے ہماری آئندہ نسلیں بلا واسطہ مستفید نہیں ہو سکیں گی اور جس طرح آج ہم اپنی تہذیب اور تاریخ کو مغربی دانشوروں کے ذریعے سے پڑھ رہے ہیں علامہ اقبال بھی وہی ہمیں پڑھایا کریں گے کیونکہ علامہ اقبال کی زبان ہم سے آہستہ آہستہ متروک ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جس طرح ہم ذہنی طور پر غلام ہوتے چلے جا رہے ہیں اسی طرح عملی طور پر بھی غلام ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ذہنوں کی آزادی ہی قوموں کو عملی طور پر آزاد کرتی ہے اور اس میں زبان جس طرح بڑا کردار ادا کرتی ہے وہ کسی اہل دانش سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کاش ہم مل بیٹھ کر سوچ سکیں کہ کس طرح ہم اس المیے سے اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو نکال سکتے ہیں۔

۱۔۵۔۴۔ استاد مطہری اور دینی فکر کی تعبیر نو

مجھے یہاں کچھ ذکر استاد مطہری کا بھی کرنا ہے۔ استاد شہید مطہری کا نام بھی انہی عظیم شخصیات میں شامل ہے جنھوں نے قوموں کی تقدیر بدلی۔ شہید مطہری نے بھی دین کی تعبیر نو کے حوالے سے اُسی کام کو آگے بڑھایا جو ان سے پہلے علامہ اقبال نے شروع کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ کلام جدید کی بنیاد سر سید احمد خان نے رکھی۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کو اُن کی فکر سے اختلاف ہو لیکن دین کی تعبیر نو کے حوالے سے سر سید احمد خان کے کام سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ذرائع علم کے مرحلے پر ان کا اشتباہ خاصا نمایاں ہے تاہم انھوں نے ری کنسٹرکشن کے حوالے سے ایک بنیاد ضرور

رکھی ہے۔اس پہلو سے ان سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔اس سلسلے میں عالم اسلام کے دوسرے خطوں میں کئی ایک دانشوروں نے کردار ادا کیا ہے۔خاص طور پر مصر اور ایران کا نام اس حوالے سے لیا جاسکتا ہے۔جن افراد نے عالم اسلام میں دین کی تعبیر نو کے کام کو آگے بڑھایا ہے ان میں استاد شہید مطہری کا نام بہت بلند ہے۔استاد مطہری نے اس زمانے میں علامہ اقبال کی فکر کو قریب سے پڑھا اور فارسی میں جو کچھ ان کے افکار موجود تھے اُن کا مطالعہ دقت نظر سے کیا۔علامہ اقبال کی Reconstruction of religious thought (تشکیل جدید الہیات) کا ترجمہ بھی ان دنوں فارسی میں ہو چکا تھا۔یہ ترجمہ احمد آرام نے کیا تھا۔اس میں نبوت اور ختم نبوت کے حوالے سے علامہ اقبال کے افکار بھی شامل ہیں۔استاد مطہری نے علامہ اقبال کے افکار سے خاصا استفادہ کیا ہے۔اس کے بعد شریعتی وغیرہ نے بھی بہت استفادہ کیا ہے لیکن گہرائی میں جا کر علامہ اقبال کے فلسفے اور کلام جدید کے پہلوؤں سے جس شخصیت نے باریک بینی سے جائزہ لیا اور اُس پر اپنی آرا کا اظہار کیا وہ استاد شہید مطہری ہیں اور بلاشبہ جن شخصیات نے علامہ اقبال کے افکار کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ہمیں انھیں بھی پڑھنا اور سمجھنا چاہیے کیونکہ ان افکار کو ناقدانہ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔اس میں شک نہیں کہ ناقدانہ نظر سے دیکھنا انسان پر ادراک کے نئے دروازوں کو کھولتا ہے۔

۱۔۵۔۵۔ایک فرق

میرا خیال ہے کہ علامہ اقبال کی بعض چیزیں اس زمانے میں استاد مطہری تک نہیں پہنچی تھیں۔لہٰذا ختم نبوت کی جو بنیادیں علامہ اقبال نے بیان کی ہیں اس پر استاد مطہری نے بڑا کھل کر اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ استاد مرتضیٰ مطہری بنیادی طور پر ایک فلسفی تھے تو یہ بجا ہوگا کیونکہ انھوں نے فلسفۂ الٰہیات کو منظم طور پر تمام پہلوؤں سے پیش کیا ہے۔ان کی کتاب اصول فلسفہ وروش رئالیسم (Realism) بنیادی طور پر استاد علامہ طباطبائی کی کتاب پر ان کے حواشی پر مبنی ہے۔علاوہ ازیں انھوں نے حکیم سبزواری کی منظومہ کی بھی مبسوط شرح کی ہے جو دراصل ان کے دروس پر

مشتمل ہے۔ مزید برآں انھوں نے بوعلی سینا کی الٰہیات شفاء کی بھی شرح کی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انھوں نے اسلامی فلسفے کے بنیادی متون پر کام کیا ہے۔ دوسری طرف سرسید اور اقبال کے کام کا جائزہ لیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اسلامی فلاسفہ کے متون کو اس طرح سے نہیں دیکھا تاہم مغربی فلسفے اور کلام پر ان کی نظر وسیع تر معلوم ہوتی ہے۔

علامہ اقبال نے مغربی فلسفے کے اصطلاحیں استعمال کی ہیں، شاید ضرورت بھی تھی کہ انہی کی اصطلاحوں میں اُن سے بات کی جاتی اور ان کے فلسفی افکار میں موجود جھول کی نشاندہی انہی کی زبان میں کی جاتی۔ علامہ اقبال نے اس کام کی بہت اچھی بنیاد فراہم کی ہے۔ استاد مطہری کو مغربی زبانوں پر دسترس حاصل نہیں تھی۔ انھوں نے مغربی فلسفے کا مطالعہ عربی اور فارسی میں ہونے والے تراجم کی مدد سے کیا تھا، تاہم اُن کا یہ مطالعہ بھی خاصہ وسیع معلوم ہوتا ہے۔

۱۔۵۔۶۔ استاد مطہری کی تنقیدی روش

استاد مطہری نے جہاں بھی مغربی فلسفے پر تنقید کی ہے وہاں ان کی روش یہ رہی ہے کہ وہ ان کے ہاں موجود جزوی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں اور پھر اپنی بات پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے فلسفی اور کلامی موضوعات میں یہی طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ مثال کے طور پر انسان کامل کے بارے میں ان کے نظریے کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اشتراکیت کی نظر میں انسان کامل کا جائزہ لیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے نطشے کے انسان کامل کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے مختلف فلسفی مکاتب فکر کے انسان کامل کا ذکر کیا ہے۔ پھر انھوں نے عرفاء اور صوفیاء کے انسان کامل کو بھی پیش کیا ہے۔ انھوں نے قرآن کے انسان کامل کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ اس طرح ہر مکتب فکر کے انسان کامل میں موجود کمال کے کسی نہ کسی پہلو کی نشان دہی کرتے ہوئے انھوں نے انسان کامل کی جامع تصویر اس طرح سے پیش کی ہے کہ اسے دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

۱۔۵۔۷۔ مسئلہ فطرت اور استاد مطہری

استاد مطہری نے فطرت کے مسئلے پر بھی اسی انداز سے بات کی ہے۔ اُن کی بحث کا طریقہ بہت شاندار اور عمدہ ہے۔ انھوں نے عقل کو انسان کا مابہ الامتیاز قرار دیا ہے۔ فطرت کی بحث میں

انھوں نے انسان اور حیوان کے مابین موجود مشترکات کی نشان دہی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جبلی پہلوؤں سے انسان اور حیوان آپس میں مشترک ہیں لیکن فطری پہلو سے انسان حیوان سے مختلف اور عظیم تر ہے۔ یہاں وہ اپنے نظریہ فطرت کو بیان کرتے ہوئے قرآن کی اس آیت کو بنیاد بناتے ہیں۔ فِطْرَتَ اللہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا (روم: ۳۰)۔ وہ علم دوستی اور انسان کی جمال دوستی کو انسانی فطرت میں موجود جوہر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ انسان کی احسان شناسی، جذبہ ایثار اور حق کی شناخت کے لیے بے قراری کو انسان کی فطرت ہی کے مظاہر قرار دیتے ہیں۔ وہ انسان کے ان پہلوؤں کو اس کی فطرت کے اندر تلاش کرتے ہیں۔ وہ ایمان باللہ اور غیب پر ایمان کی توجیہ بھی اپنے نظریہ فطرت کی بنیاد پر کرتے ہیں۔

۱۔۵۔۸۔ فلسفے کو پڑھ کر اس پر تنقید کریں

میری رائے یہ ہے کہ وہ علمائے کرام یا دانشور جو فلسفے کو علم کا عنوان دینے کے لیے تیار نہیں ان کے لیے بھی ضروری ہے کہ فلسفے کو پڑھیں تاکہ وہ بہتر طور پر اس پر تنقید کر سکیں۔ پڑھے بغیر مخالفت یا تنقید کرنا کوئی علمی روش نہیں ہے۔ اگرچہ ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ کوئی یہ رائے رکھے کیونکہ ہر انسان کا حق ہے کہ وہ آزادانہ طور پر کسی مسئلے میں کوئی رائے اختیار کرے۔ مجھے یہاں پر صرف یہ کہنا ہے کہ جب ہمارے مقابلے میں ابھرنے والی تہذیب اور اس کے حامی دانش ور ایک خاص علم کی اصطلاحات استعمال کر رہے ہیں اور وہ اپنے تہذیبی تصور کی خاص علم کے ذریعے سے توجیہ کر رہے ہیں تو پھر ہمیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اس علم سے رجوع کیے بغیر اور اس کی اصطلاحات برتے بغیر چارہ نہیں۔

مغرب کے دانشور مغربی فکر و فلسفہ کو اپنی تہذیب کی بنیاد قرار دے رہے ہیں۔ اس کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں ان کے نظریات وافکار کی بنیادوں کو پڑھنا اور سمجھنا ہوگا۔ امام غزالی کو بھی آخر کار یہی راستہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ جدید فلسفے کے بانی ڈیکارٹ سے لے کر آج تک مغربی فلسفیوں نے جو افکار پیش کیے ہیں ان کا گہری نظر سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ فلسفہ وجودیت اور کانٹ کی اس پر تنقید کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ملا صدرا نے مسلمان فلسفیوں کے افکار کو جس طرح سے

کمال تک پہنچایا ہے اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ گذشتہ فلسفیوں کے ہاں جو مسائل لاینحل رہ گئے تھے انھیں ملاصدرا کے فلسفے نے کس طرح حل کیا ہے اس کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ ابن سینا نے خداشناسی کے لیے کیا دلائل پیش کیے ہیں اور ان میں ملاصدرا نے کیا اضافات کیے ہیں اور آج کے مسلمان فلسفی اس حوالے سے کیا کر رہے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ہمیں یہاں اس کی بالکل خبر نہیں۔

ا۔۵۔۹۔ پاکستان میں زوال فلسفہ

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری دانشگاہوں میں صرف پنجاب یونیورسٹی میں ایک فلسفے کا شعبہ ہے لیکن چند سال پہلے پتہ چلا کہ انتظامیہ اسے بند کرنے کے درپے ہے کہ اب طالب علم اس میں نہیں جاتے۔ ظاہر ہے جب طلبہ اس شعبے میں نہیں جائیں گے تو وہ شعبہ بند ہی ہو جائے گا۔ پھر چند دوستوں نے یہ کوشش کی کہ وہاں کچھ طلبہ بھیجیں تا کہ یہ شعبہ چلتا رہے لیکن یہاں یہ بات جاننا نہایت ضروری ہے کہ وہاں جو استاد ہیں ان کا مبلغ علم کیا ہے، وہ فلسفے کو کتنا جانتے اور کتنا سمجھتے ہیں۔ یہ صرف فلسفے کی بات نہیں تمام انسانی علوم، تمام سوشل سائنسز پاکستان جیسے ملک میں جس طرح زوال کا شکار ہیں دل اُس پر کڑھتا ہے۔ ہم نے چونکہ مغرب کی مادی ترقی کو دیکھا ہے وہاں کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے ارتقائی سفر کو نہیں دیکھا اس لیے ہم نے جو دیکھا ہے اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ ہم نے وہاں یہ نہیں دیکھا کہ انسانی فکر کی آزادی نے انسانوں کو سوچنے پر مجبور کیا اور کلیسا کے فکری جمود اور استبداد کے خلاف انھوں نے قیام کیا اور اپنی ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ ان کی تہذیب کے اندر ایک فکر موجود ہے، ایک فلسفہ موجود ہے جس کے نتیجے میں آخر کار انھوں نے مادی کائنات کا سراغ لگایا اور ٹیکنالوجی کے بہت سارے شعبوں میں پیش رفت کی۔ میرا یہ خیال ہے کہ ہم نے ظاہری ترقی کو دیکھا لیکن اس کے پیچھے جو انسانی دانش نے کرامات کی ہیں اُسے نہیں دیکھا اور نہیں سمجھا۔

ا۔۵۔۱۰۔ مغرب اور انسانی علوم کی خدمت

ولیم جیمز جیسے لوگوں نے انسان شناسی پر جو کام کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ مغرب نے انسانی علوم میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ عام طور پر ہماری نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ ہم نے انہی

ظواہر کو دیکھا اور اس تہذیب کے مظاہر کی نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ نتیجتاً ہم ذہنی طور پر اُن سے مرعوب ہو گئے اور اسی مرعوبیت کے سبب ہم اُن کے غلام بن کر رہ گئے اور ایک فیشن کے طور پر ہم نے میڈیکل سائنسز اور کمپیوٹر سائنسز کو ہی علم گردان کر اُسی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ہم نے اس پر غور نہیں کیا کہ انسان کی کیا ضرورت ہے، معاشرے کی کیا ضرورت ہے، ریاستوں کی بنیادیں کن افکار اور کس فلسفے پر ہونی چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ ہم سماجی علوم کے ماہرین کو اہمیت نہیں دیں گے تو بہت پیچھے رہ جائیں گے اور پہلے ہی بہت پیچھے رہ چکے ہیں۔ جب ہم سماجی علوم اور سوشل سائنٹسٹ کو معاشرے میں عزت نہیں دیں گے، اُسے مقام نہیں دیں گے، جب ہم تھنک ٹینکس نہیں بنائیں گے اور حکومت کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہوگی تو پھر اسی طرح ہم اغیار کے غلام بنے رہیں گے۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ ہم سماجی علوم کی طرف متوجہ ہوں، سوشل سائنسز کی طرف رجوع کریں اور معاشرے کے اندر ان علوم کا احیاء کریں۔ سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو آگے لائیں بلاشبہ ڈاکٹر قدیر خان اور ڈاکٹر ثمر مبارک مند ہمارا قومی اثاثہ ہیں لیکن ان کو بھی سوشل سائنسز کے ماہرین کے زیر نظر ہونا چاہیے۔ اُن لوگوں کے ہاتھوں میں جنھوں نے قوموں کا ہدف معین کرنا ہے، جنھوں نے قوموں کے مقاصد اور ترجیحات کا تعین کرنا ہے۔

۱۔۵۔۱۱۔البصیرہ کے مقاصد

ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم البصیرہ کے پلیٹ فارم سے انہی مقاصد کے لیے کام کریں گے۔ بلاشبہ ہم اس پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے اتحاد کے لیے کام کر رہے ہیں مگر مسلمانوں کا اتحاد ویسے ہی، بے ہدف نہیں ہے، اس اتحاد کو نتیجہ خیز بھی بنانا ہے اور اس اتحاد کی طاقت سے ملک وقوم کو طاقت ور بھی بنانا ہے تاکہ ہم اغیار کی غلامی کی تمام زنجیریں توڑ ڈالیں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ترقی یافتہ قوموں کے برابر آکھڑے ہوں۔ مسلمانوں کو اتحاد کر کے آگے کی طرف بڑھنا ہے۔ اگر آگے کی طرف نہیں بڑھنا تو پھر اتحاد کی کوئی ضرورت نہیں۔

۱۔۵۔۱۲۔ایک مردِ حُر کی ضرورت

ہمیں اپنے تنزل اور زوال کے اسباب کو سمجھنا ہوگا اور پھر ترقی وارتقا کی طرف جانا ہوگا۔ اس

کے لیے ضرورت ہے کہ ہم علامہ اقبال اور استاد مطہری جیسے عظیم مفکرین کو پہچانیں، اُن کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دیں اور آج ہمیں ایسے ہی مفکرین کی ضرورت ہے۔ مغربی تہذیب کی بنیادیں جنھیں اقبال نے کمزور بنیادوں سے تعبیر کیا وہ واقعی کمزور پڑ گئی ہیں۔ اشتراکیت کا زوال مکمل ہو چکا ہے، مغربی سرمایہ داری کا سفینہ ڈوبنے والا ہے۔ کیا ہمارے پاس کوئی مردِ حر موجود ہے جو اس مغربی زوال پذیر تہذیب کے مقابلے میں ایک عظیم تر، ایک جامع تر اور ایک ایسی تہذیب پیش کر سکے جو کائنات کی جامع شناخت اور معرفت پر مبنی ہو، جو انسان کی صحیح شناخت پر مبنی ہو۔ ایک ایسا شخص چاہیے جو مغرب و مشرق کے پرانے تجربات کی روشنی میں ایک جامع تر روحانی تہذیب کو پیش کر سکے۔ ہم اس حقیقت کو ضرور تسلیم کریں کہ ہم علمی انحطاط کی اس سطح پر پہنچ چکے ہیں کہ ہم مغربی تہذیب کے اترن کو اپنے لیے باعث فضیلت سمجھتے ہیں اور اپنے فکری سماجی فلسفہ کو جو ہماری میراث ہے اسے فرسودہ جانتے ہیں۔ چنانچہ ضرورت ہے کہ ہم ان حقائق کو سمجھ کر من حیث القوم اپنی ترقی کی راہوں کا تعین کریں اور اغیار کی غلامی سے نجات حاصل کریں۔

۱۔۶۔غیر مسلموں کے نیک اعمال کی حقیقت

۱۔۶۔۱۔موضوع کی اہمیت

عدل الٰہی کی بحث میں یہ موضوع بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ غیر مسلموں کے اعمال خاص طور پر ان کے نیک اعمال کے بارے میں اسلام کی رائے کیا ہے۔کیا ان کے نیک اعمال بھی مقبول بارگاہ الٰہی قرار پاتے ہیں اور ان کی قربت الٰہی کا باعث بنتے ہیں؟ یہ سوال اگرچہ قدیمی ہے لیکن عصر حاضر میں یہ بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ سوال کئی پہلو رکھتا ہے ہم ذیل میں مختصر طور پر اس کے اہم پہلوؤں کا جائزہ لیں گے۔

۱۔۶۔۲۔مختلف نقطہ ہائے نظر

یہ بات پیش نظر رہے کہ مجموعی طور پر اس سوال کے متعدد جوابات ہیں۔بعض لوگوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ چونکہ رب العالمین ہے وہ مسلم وغیر مسلم،موحد ومشرک،نیک و بد سب کے نیک اعمال کو قبول کرتا ہے اور سب کو اس کا اجر دے گا۔دوسری طرف بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ جو لوگ ان کے دین سے تعلق رکھتے ہیں فقط وہی بخشش کے لائق ہیں بلکہ ایک دین کے ماننے والوں میں مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والوں کا بھی یہی حال ہے۔ ہر مسلک کے بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ انہی کے مسلک سے تعلق رکھنے والے لوگ بخشے جائیں گے۔ یہ بات کوئی آج کی نہیں ہے بلکہ قدیم زمانے سے مختلف ادیان کے ماننے والوں کا یہی نظریہ چلا آرہا ہے۔قرآن حکیم نے یہود ونصاریٰ کے ایسے ہی دعوے نقل کیے ہیں مثلاً ایک مقام پر یہودیوں کی بات یوں بیان کی گئی ہے:

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

النَّارِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ O[1]

اور انھوں نے کہا ہمیں بجز گنے چنے ایام کے آگ نہ چھوئے گی۔ کہو کیا اس سلسلے میں تم نے خدا سے کوئی وعدہ لیا ہے کہ جس کی خلاف ورزی خدا نہ کرے گا یا خدا کے بارے میں تم وہ بات کہہ رہے ہو جس کا تمھیں علم نہیں؟ یقیناً جو گناہ کمائے اور اس کی خطا اس کا احاطہ کرلے تو یقیناً وہ لوگ اہل جہنم ہیں اور ہمیشہ وہیں رہیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال انجام دیے تو وہ اہل جنت ہیں ہمیشہ وہیں رہیں گے۔

ان آیات سے البتہ یہ ظاہر ضرور ہوتا ہے کہ یہودیوں کا خیال تھا کہ وہ اگر جہنم میں گئے بھی تو چند گنتی کے دنوں کے لیے بطور سزا جائیں گے بعد ازاں انھیں جنت میں منتقل کردیا جائے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ بہت سے مسلمانوں میں بھی یہ نظریہ پایا جاتا ہے۔ اس نظریے کا جائزہ ہم آئندہ سطور میں لیں گے۔

ایک اور مقام پر یہود و نصاریٰ دونوں کا یہ زعم نقل کیا گیا ہے:

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ O بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ [2]

یہودی کہتے ہیں کہ یہودیوں کے سوا اور عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کے سوا کوئی اور جنت میں نہ جاسکے گا۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔ (اے رسولؐ) کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ۔ ہاں جس نے خدا کے سامنے سر تسلیم خم کردیا اور اچھے کام بھی کرتا رہا تو اس کے لیے اس کے پروردگار کے پاس اس کا اجر

---

[1] بقرہ: ۸۰۔۸۲

[2] بقرہ: ۱۱۱ و ۱۱۲

ہے اور ان پر نہ تو کسی قسم کا خوف ہے اور نہ ہی یہ غمگین ہوتے ہیں۔

اصطلاحی طور پر مسلمان کہلانے والوں کا بھی یہی حال ہے۔ مسلمان اپنے نظریے کے اثبات کے لیے اس آیت سے بھی استفادہ کرتے ہیں:

وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ[۱]

اور جو بھی اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو تھامے گا تو اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

اس سے یہ مطلب بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کا پیروکار ہے تو وہ جو بھی نیک عمل کر لے اسے بارگاہ الٰہی میں پذیرائی حاصل نہیں ہوگی۔

آگے بڑھنے سے پہلے مندرجہ بالا آیات سے ہم چند نتائج اخذ کرتے ہیں:

۱۔ اپنے اپنے مکتب یا مسلک کے ماننے والوں کے لیے بخشش کا نظریہ کوئی نیا نہیں ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کسی خاص مسلک یا مکتب کے ماننے والوں کی بخشش کا وعدہ کرنے کے بجائے اپنی رضا اور بخشش کے اصول بیان کرتا ہے اور اپنی بخشش کا دعویٰ کرنے والوں کے نظریے کو رد کر دیتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی قسم کا امتیازی سلوک روا نہیں ہے۔

۳۔ یہود و نصاریٰ کے بحیثیت یہود و نصاریٰ بخشش کے دعووں کو پروردگار قبول نہیں کرتا تاہم کسی یہودی یا نصرانی کی بخشش سے انکار بھی نہیں کرتا بلکہ یہ فرماتا ہے کہ:

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ[۲]

ہاں جس نے خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اچھے کام بھی کرتا رہا تو اس کے لیے اس کے پروردگار کے پاس اس کا اجر ہے اور ان پر نہ تو کسی قسم کا

---

۱) آل عمران: ۸۵

۲) بقرہ: ۱۱۲

خوف ہے اور نہ ہی یہ غمگین ہوتے ہیں۔

ہمیں بعد میں ذکر کی گئی آیت کے حقیقی معنیٰ کا تعین کرنے کے لیے اس آیت کو ملحوظ نظر رکھنا پڑے گا۔ ایک مقام پر یہ آیا ہے مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ یعنی جو اللہ کے حضور پورے وجود کے ساتھ سر تسلیم خم کردے اور دوسرے مقام پر آیا ہے کہ جو کوئی ''اسلام'' کے علاوہ کوئی اور دین لے کر آئے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ گویا ایک مقام پر اثبات کے ذریعے سے بات بیان کی جارہی ہے اور دوسرے مقام پر نفی کے ذریعے وہی بات سمجھائی جارہی ہے۔

۴۔ مذکورہ بالا آیات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ روح تسلیم کے ساتھ اگر حسن عمل انجام دیا جائے تو اللہ کی بارگاہ میں اجر و جزا کا استحقاق پیدا کرلیتا ہے۔ لہٰذا کوئی بھی نیک عمل ہو اپنی تاثیر رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی تاثیر کو ضائع نہیں کرتا۔ البتہ اس کا اجر اس عمل کی حقیقت اور اخلاص پر عطا فرماتا ہے۔

۱۔۶۔۳۔ نیک عمل اور ایمان کی تاثیر

بعض اوقات انسان خود اپنے عمل کی تاثیر کو مٹا دیتا ہے۔ جب کوئی شخص ایک اچھا عمل کرتے ہوئے دنیا میں اس کے اجر اور مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے تو پھر آخرت میں اسے اس عمل کے اجر کی توقع بھی نہیں کرنا چاہیے۔ جب اس نے وہ کام اللہ کے لیے کیا ہی نہیں تو پھر وہ اللہ سے اس کا اجر طلب کرنے کا حق دار نہیں ہے۔ اللہ کے لیے عمل کرنے کا تصور بڑا آفاقی ہے گویا اس شخص نے اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر وہ کام اللہ کی مخلوق کی بہتری کے لیے انجام دیا ہے اور اس میں اس نے فقط اپنی انسانی فطرت کی آواز پر لبیک کہا ہے وہی فطرت جسے اللہ نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے تو وہ عمل اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوگا اور اس کا اجر اس شخص کے لیے محفوظ ہوگا اور وہ عمل کرنے والا انسان آخرت پر یقین رکھتا ہے تو یہ یقین اس کے حسن عمل میں اضافہ کردے گا اور اسے پائیدار بنا دے گا۔ اس کا اجر اسے آخرت میں بھی ملے گا تاہم اگر کسی انسان نے کوئی کام اپنی ذات کے لیے نہیں کیا بلکہ اللہ کی مخلوق کی بہتری کے لیے انجام دیا ہے تو بھی اللہ اس کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ جو لوگ صرف دنیا طلبی کے لیے کوئی کام انجام دیتے ہیں ان کے بارے میں

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا[۱]

جو شخص جلدی سے کوئی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم جسے چاہیں اسے دنیا میں ہی جو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں پھر آخرت میں ہم نے اس کے لیے جہنم قرار دی ہے جس کی گرمی وہ مذمت اور لعنت میں گرفتار ہونے کے عالم میں برداشت کرے گا۔

یقیناً وہ شخص جس کے پیش نظر اللہ ہے، آخرت ہے اور حیات بعد از موت ہے وہ اپنے عمل کا نتیجہ جلدی نہیں چاہتا لیکن جو ان حقیقتوں پر ایمان نہیں رکھتا وہ اپنے کیے کا جلدی نتیجہ چاہتا ہے۔

۱۔۶۔۴۔ قاصر اور مقصر

دینی معارف پر ایمان نہ رکھنے کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس شخص تک دین کا پیغام صحیح طریقے سے پہنچا ہی نہیں ہے جب تک یہ پیغام اس تک نہیں پہنچا ہم اسے قاصر کہیں گے۔ دوسرا آدمی وہ ہے جس تک پیغام رسالت پہنچا ہے مگر اس نے قبول نہیں کیا، وہ مقصر ہے۔ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ مقصر کا کوئی عمل قابل قبول نہیں کیونکہ وہ جان بوجھ کر حق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ پھر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے وہ عمل اخلاص کے ساتھ انجام دیا ہے چنانچہ عمل کا اخروی اجر اسے اسی صورت میں ملے گا جب اس کے اندر خلوص ہوگا۔ اس میں خلوص کا نہ ہونا اس بات سے ثابت ہے کہ اس پر حق کے ظاہر ہو چکنے کے باوجود اس نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس لیے اس کا دعویٰ اخلاص ہو بھی تو جھوٹا ہے، جس کی وجہ سے اس کا وہ عمل خالص عمل قرار نہیں پائے گا اور اجر سے محروم رہے گا۔ دوسرا وہ شخص جو قاصر ہے اس پر اسلام حقیقتاً آشکار ہی نہیں ہوا یا اس نے جو مسلمان دیکھے ان کے عمل پر وہ مطمئن نہیں ہے لیکن اندر سے حق کی تلاش رکھتا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو حق کی تلاش میں نکلا ہے اور جوں جوں اس پر حق ظاہر ہوتا

۱) بنی اسرائیل ۱۸ تا ۲۰

جاتا ہے وہ اسے قبول کرتا چلا جاتا ہے گویا اس کے اندر روحِ تسلیم موجود ہے جبکہ وہ مذکورہ شخص جس پر حق ظاہر ہو گیا مگر اس نے اپنی ہٹ دھرمی، جھوٹی انا اور بعض دیگر وجوہات کی بنا پر حق کو تسلیم نہیں کیا۔ گویا اس شخص کے اندر روح تسلیم موجود نہیں ہے اور روح تسلیم کا نہ ہونا بارگاہ خداوندی میں اس کے ظاہری نیک اعمال کی عدم قبولیت کا باعث بنتا ہے۔ سورہ بقرہ کی جن آیات کو اوپر بیان کیا گیا ہے اور جن میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ''وہ شخص جس نے اپنے رخ کو اللہ کے حضور جھکا دیا اور وہ نیکوکار بھی ہے'' دراصل ایسے ہی انسان کے بارے میں ہے اگرچہ اصطلاحی طور پر وہ مسلمان نہیں ہوا لیکن وہ اپنے اندر روح تسلیم رکھتا ہے۔ اس کے نیک اعمال بارگاہ خداوندی میں قبول اور اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ چاہے کوئی ظاہری طور پر مسلمان ہو یا کافر، اللہ تعالی کے ہاں پیمانہ نجات و بخشش قلب سلیم ہی ہے۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر فرمایا گیا ہے:

اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ۝[1]

البتہ فائدے میں وہی رہے گا جو اللہ کے حضور قلب سلیم لے کر حاضر ہو گا۔

۱۔۶۔۵۔ حبط اعمال

بعض نیک اعمال بعض خرابیوں اور گناہوں کی وجہ سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں بعض لوگوں کے اعمال حبط ہو جانے کا ذکر آیا ہے۔ ہم چند ایک آیات کا یہاں ذکر کرتے ہیں:

وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَتَعۡسًا لَّہُمۡ وَ اَضَلَّ اَعۡمَالَہُمۡ ۝ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَرِہُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَہُمۡ ۝[2]

اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے ہلاکت ہے، اللہ ان کے اعمال غارت کر دے گا یہ اس لیے کہ اللہ کی نازل کردہ چیز انھیں ناگوار گزری پس اللہ نے ان کے اعمال حبط کر لیے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَ لَا

۱) شعراء:۸۹

۲) محمد:۹

تَجۡهَرُوۡا لَهٗ بِالۡقَوۡلِ كَجَهۡرِ بَعۡضِكُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ○[1]

اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ ان سے اس طرح اونچی آواز سے بات کرو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال حبط ہو جائیں اور تمھیں خبر بھی نہ ہو۔

ان آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کافروں کے اعمال بھی غارت ہو جائیں گے اور بعض مومنوں کے بھی اعمال حبط کے خطرے سے دوچار ہیں۔

کافر سے یہاں کیا مراد ہے اس پر تفصیلی گفتگو کرنے کی ضرورت ہے لیکن مسلمان حکماء جس چیز پر اتفاق کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو روح تسلیم سے عاری ہیں اور حق آشکار ہو جانے کے باوجود انکار اور ''میں نہ مانوں'' کی روش پر ڈٹے رہتے ہیں، وہی بخشش سے محروم رہیں گے۔ مندرجہ بالا سطور میں مقصر کا جو مفہوم ہم نے بیان کیا ہے وہ ایسے ہی کافروں پر صادق آتا ہے۔ علاوہ ازیں سورہ حجرات کی مندرجہ بالا آیت اس امر کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ انبیائے کرام جن کے سید و سردار آخری نبی ہیں، کی بے ادبی بھی اعمال کے ضائع ہو جانے کا باعث بنتی ہے۔ بعض دیگر اعمال بھی ایسے ہیں کہ جن کی انجام دہی اللہ کی قربت اور بخشش سے محرومیت کا باعث بنتی ہے مگر یہ کہ انسان متوجہ ہو اور اللہ کی طرف لوٹ آئے، توبہ اور انابت کا راستہ اختیار کرے۔ ہم یہاں پر ایک اور آیہ کریمہ کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتے ہیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِكُمۡ بِالۡمَنِّ وَالۡاَذٰى[2]

اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر باطل نہ کرو۔

لہٰذا فقط اسلام کا دعویٰ اور ظاہری طور پر مسلمان ہونا اور ظاہری طور پر عبادات کا انجام دینا ہی کافی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں چند ایک احادیث کا بھی ذکر مفید معلوم ہوتا ہے۔

[1] حجرات: ۲

[2] بقرہ: ۲۶۴

ایک حدیث میں حسد کو نیک اعمال کے ضائع ہونے کا سبب گردانا گیا ہے:

الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب۔۔۔[۱]

حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا:

قال النبی لایدخل الجنة قاطع رحم[۲]

اسی طرح غیبت[۳] اور تہمت[۴] ایسے جرائم ہیں جنھیں عام نظر سے معمولی سمجھا جاتا ہے مگر یہ وہ گناہان کبیرہ ہیں جو انسان کے کیے ہوئے نیک اعمال کو غارت کر دیتے ہیں۔ چغل خور کا بھی یہی حال ہے۔ رسول اللہؐ سے ایک حدیث میں مروی ہے:

لایدخل الجنة نمام[۵]

چغلخور جنت میں نہیں جا سکتا۔

مسلمان صرف اس خوش فہمی میں نہ رہیں کہ انھوں نے اسلام کو قبول کر لیا تو وہ سیدھا جنت میں ہی جائیں گے، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ قرآن میں جہاں ایمان کی بات ہوئی ہے وہاں ساتھ اعمال صالح کا بھی ذکر ہوا ہے اور اجر کا دارومدار اعمال صالح ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح قتل مومن، مومن کی آبروریزی، دھوکا اور کسی کی کردار کشی یہ وہ اعمال قبیحہ ہیں جو جہنم کے شعلوں کو بھڑکا دیتے

---

۱) محمد بن یزید قزوینی، سنن ابن ماجہ، ج ۲، ص ۱۴۰۸، ح ۴۲۱۰

۲) شیخ طوسی، المبسوط، ج ۳، ص ۳۰۷ و مسلم نیشاپوری، صحیح مسلم، ج ۸، ص ۸

۳) شیخ صدوق، امالی، ص ۵۱۵ نیز مجلسی، بحار الانوار، ج ۷۲، ص ۲۵۸

۴) امام صادقؑ نے فرمایا: **اذا اتهم المومن اخاه انماث الایمان من قلبه کما ینماث الملح فی الماء۔۔۔**

جب کوئی مومن اپنے بھائی پر تہمت لگاتا ہے تو ایمان اس کے قلب سے ایسے زائل ہو جاتا ہے جیسے پانی میں نمک زائل ہو جاتا ہے۔ (کلینی، کافی، ج ۲، ص ۳۶۱)

۵) احمد بن حنبل، مسند احمد، ج ۵، ص ۳۹۱

ہیں۔حدیث شریف میں آیا ہے:

□

مومن کا دوسرے مومن بھائی پر پہلا حق یہ ہے کہ وہ جو کچھ اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے مومن بھائی کے لیے پسند کرے۔[۱]

ایک مشہور حدیث میں نبی کریمؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ مسلمان ہی نہیں جس کی زبان یا ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو اذیت پہنچے:

المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ[۲]

ثابت ہوا کہ ایک مسلمان بظاہر مسلمان ہونے کے باوجود اور نیک اعمال کے باوجود گاہے ایسے برے اعمال کر بیٹھتا ہے جن کی وجہ سے اس کے کیے ہوئے نیک اعمال بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ریا کاری بھی انسان کے نیک اعمال کو ضائع کر دیتی ہے۔گاہے انسان راتوں کو جاگ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے لیکن پھر لوگوں کو بتا کر اسے ضائع کر بیٹھتا ہے۔گاہے انسان اپنے نیک اعمال پر فخر وغرور میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس سے بھی انسان کے عمل ضائع ہو جاتے ہیں۔حضرت بابا بلھے شاہؒ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

راتیں جاگیں، کریں عبادت
راتیں جاگن کتے: تیتھوں اتے
بھونکن توں بند مول نہ ہندے
جا روڑ ی تے ستے:تیتھوں اتے
خصم اپنے دا، در مول نہ چھڈدے
بھانویں وجن جتے: تیتھوں اتے
بلھے شاہ! کوئی رخت دیھاج لے
نھیں تے بازی بازی لے گئے کتے تیتھوں اتے

۱) کلینی، کافی، ج ۲، ص ۱۶۹، باب حق المومن، ح ۲

۲) احمد برقی، المحاسن، ج ۱، ص ۲۸۵ نیز بخاری، صحیح بخاری، ج ۷، ص ۱۸۶

یہ بات بلھے شاہ نے تکبر کو ختم کرنے کے لیے کہی ہے کہ تو رات کو جاگتا ہے اور اپنے رات کو جاگنے پر فخر کرتا ہے، رات کو تو کتے بھی جاگتے رہتے ہیں اور اپنے ہی مالک کا پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ انسان جب اپنے نیک کام پر فخر کرتا ہے تو اس کام کا اجر ضائع کر بیٹھتا ہے۔ اسی طرح دیگر ایسے کام بھی ہیں جن کی وجہ سے آدمی کے نیک اعمال بھی اجر سے محروم ہو جاتے ہیں۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ کافر بھی دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ کافر جو خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، دوسرے وہ کافر جو خدا اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ جب کوئی شخص اللہ اور روز آخرت پر ایمان ہی نہیں رکھتا، اللہ کو مانتا ہی نہیں تو پھر وہ اس سے آخرت میں اپنے اعمال کا صلہ کیسے مانگ سکتا ہے۔ یہ جو روح تسلیم والی بات ہم نے کی ہے یہ ان کافروں کے بارے میں ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر ہمارے رسول اور دیگر بعض عقائد کو نہیں مانتے ان کے اندر اگر روح تسلیم موجود ہے اور وہ خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے عمل سرانجام دیتے ہیں تو ان کو ان کے نیک اعمال کا صلہ ضرور ملے گا یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اہل کتاب کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کی دعوت دی ہے۔

ارشاد رب جلیل ہے:

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ...[۱]

کہیے: اے اہل کتاب! آؤ اس ایک بات پر اکٹھے ہو جائیں جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے۔

یہ دعوت اہل کتاب ہی کو دی گئی ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس طرح کی کوئی دعوت مشرکین کو نہیں دی گئی۔ اسی لیے مسلمانوں کا قرآن حکیم کی واضح دعوت اور توحید کے فلسفے کی ماہیت اور حقیقت کو جاننے کی بنا پر یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ مشرک جنت میں نہیں جائے گا۔ موحد اور توحید پرست کی بات الگ ہے۔ اس کے جنت میں جانے کے امکانات موجود ہیں یعنی ہم اس کے جنت میں جانے کی نفی نہیں کر سکتے۔ اس کے باقی اعمال کے بارے میں اللہ بہتر فیصلہ

۱) آل عمران: ۶۴

کرنے والا ہے۔ البتہ مشرک کے بارے میں ہمارا عقیدہ بڑا واضح ہے کہ وہ ہرگز جنت میں نہیں جائے گا۔ بعید نہیں کہ مندرجہ ذیل آیت سے بھی یہی استفادہ کیا جا سکے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِئُوْنَ وَ النَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ[۱]

وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو لوگ یہودی ہوئے (نیز) صابئین اور عیسائی جو بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے اور عمل صالح انجام دے بس انھیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

دوسری طرف ہٹ دھرم کافروں کے اعمال کی حقیقت کو بھی قرآن حکیم میں بہت ہی عمدہ مثالوں سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْــٴًـا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗؕ وَ اللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ یَدَهٗ لَمْ یَكَدْ یَرٰىهَاؕ وَ مَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ[۲]

اور صاحبان کفر کے اعمال ریگستان کے سراب کی مانند ہیں جنھیں پیاسا پانی سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس سراب کے پاس آتا ہے تو وہاں وہ کچھ نہیں پاتا اور وہاں خدا کو پاتا ہے جو اس کی پوری پوری حساب رسی کرتا ہے اور خدا بہت جلد حساب چکاتا ہے۔ یا گہرے سمندر کی تہ میں ظلمتوں کی مانند کہ جسے پے در پے موج اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ اس پر ابر بھی ہے۔ اوپر نیچے ظلمتیں، عالم یہ ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا۔

۱) مائدہ:۶۹

۲) سورہ نور:۳۹ و ۴۰

جس کے لیے خدا نور قرار نہ دے پھر اس کے لیے ہرگز کوئی نور نہیں۔

۱۔۶۔۶۔ مشرکین کا انجام

جیسا کہ مشرکین کے نیک اعمال کے بارے قرآن کی آیت ہم نے بیان کی ہے کہ ان کے نیک اعمال صرف اس وجہ سے حبط کر لیے جائیں گے کہ ان کا خدا اور روز آخرت پر یقین نہیں تھا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ ان کے نیک اعمال کی تاثیر ہی ختم ہو جائے گی اور ان کا انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اس سے مراد ہے کہ ان نیک اعمال کی پرواز ان سے سلب ہو جائے گی۔ کچھ نہ کچھ نتیجہ انھیں ملے گا۔

یہ بات بہر حال ذہن نشین رہنا چاہیے کہ مشرک چاہے جتنے بھی نیک اعمال انجام دیتا رہے جنت میں نہیں جا سکتا کیونکہ توحید کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ تمام انبیاء و مرسلین اسی مسئلے پر زور دیتے رہے ہیں اور اس کی تاکید فرماتے رہے ہیں کہ اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کرنا ہی نجات کا راستہ ہے۔ جیسا کہ رسول اللہؐ فرمایا کرتے تھے:

قولو لا الہ الا اللہ تفلحوا[۱]

کہو کے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور فلاح پا جاؤ۔

قرآن حکیم میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کرنے والے کی ہرگز مغفرت نہیں فرمائے گا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ[۲]

یقیناً اللہ اس امر کی مغفرت نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہے گا معاف کر دے گا۔

یاد رکھیے کہ ذات احد سے انحراف اللہ کو ہرگز پسند نہیں ہے حتیٰ کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے کہا گیا کہ وہ اپنے چچا آزر کے لیے دعا مغفرت نہ کریں، اس کے مشرکانہ عقائد کی وجہ سے

---

۱) ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب، ج ۱، ص ۵۱ نیز احمد ابن حنبل، مسند احمد، ج ۴، ص ۳۴۱

۲) نساء: ۴۸

حضرت ابراہیم کی پرورش جیسے اعمال بھی حبط کر لیے گئے۔ یہ بات ہمارے ثابت شدہ عقائد میں سے ہے کہ مشرک کے لیے بخشش نہیں ہے، وہ جہنم ہی میں جائے گا۔ جیسے حاتم طائی کے بارے میں ہے کہ وہ بہت بڑا سخی تھا اور لوگوں کا خیر خواہ انسان تھا لیکن جنت اسے بھی میسر نہ آئی کیونکہ وہ اللہ کی وحدانیت پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کو جہنم کے کم تر درجے میں رکھا گیا۔ جہاں اگرچہ جہنم کا شدید عذاب موجود نہیں لیکن جنت والی نعمات بھی میسر نہیں۔ یہ بات ہمارے ذہن نشین رہنا چاہیے کہ جس طرح جنت کے درجے ہیں اسی طرح جہنم کے بھی درجے ہیں۔ ہر انسان کو عدل الٰہی کے تقاضوں کے تحت اس مقام میں رکھا جائے گا جس کا وہ اہل ہوگا۔ جنت کے اعلیٰ درجوں میں وہ جائیں گے جو اللہ کی وحدانیت، اس کے رسول کی رسالت اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوں گے اور اس کے احکام کی پابندی روح تسلیم کے تحت کرتے ہوں گے۔ مسلمانوں میں سے بھی وہ لوگ جنت میں نہیں جائیں گے جو ظالم، باغی، اور توحید و رسالت کے عملاً منکر ہوں گے کیونکہ تسلیم سے مراد فقط زبانی اقرار نہیں ہے بلکہ خدا اور رسول کی اتباع اور احکامات شریعت کی صحیح طور پر بجا آوری ہے۔ روحِ تسلیم عمل کو پرواز کی طاقت بخشتی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کا منکر ہے اس کا عمل پرواز کی طاقت نہیں رکھتا۔ قرآن حکیم کی سورہ فاطر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ۔۔۔[1]

پاک کلمے اس کی طرف عروج کرتے ہیں اور نیک عمل اس کی طرف بلند ہوتے ہیں۔

۱۔۶۔۷۔ظالم کا انجام

حقیقت یہ ہے کہ شرک ہی ظلم عظیم ہے لہٰذا مشرک کا انجام تو واضح ہے تاہم انسانیت پر ظلم کرنے والے لوگ اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے والے ظالم ہی قرار پاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ظالموں پر لعنت کی گئی ہے۔ احادیث میں بھی ظالموں کو برے انجام کی خبر دی گئی ہے۔ محمد بن مسلم کا کہنا ہے کہ میں نے امام محمد باقرؑ کو فرماتے سنا:

---

۱) فاطر: ۱۰

جو بھی خدا کی عبادت کرے اور اس کی عبادت میں اپنے آپ کو زحمت میں ڈال دے اور خدا کے معین کردہ اپنے امام کو نہ مانے تو اس کا عمل غیر مقبول، وہ خود گمراہ اور سرگرداں ہے اور خداوند اس کے اعمال کو دشمن رکھتا ہے۔۔۔اور اگر اس حال میں مرجائے تو اس کی موت اسلام پر نہیں بلکہ اس کی موت کفر و نفاق کی موت ہے۔ اے محمد بن مسلم! جان لو کہ ظلم کے بانی اور ان کے پیروکار دین خدا سے خارج ہیں، وہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ ان کے انجام دیے ہوئے اعمال اس راکھ کی مانند ہیں جو ایک طوفانی اور تیز ہواؤں کا بازیچہ بن جائے کیونکہ یہ لوگ اپنی کمائی ہوئی کسی چیز کو نہ پاسکیں گے۔ یہی گہری گمراہی ہے۔[1]

۱۔۶۔۸۔رسالت مآبؐ پر ایمان کا نتیجہ

خدا اور آخرت پر ایمان عمل کو پرواز عطا کرتا ہے اور ایمان انسان کے عمل میں گہرائی پیدا کرتا ہے کیونکہ ان حقائق پر ایمان رکھنے والا صرف کائنات کے ظواہر کو نہیں دیکھ رہا ہوتا بلکہ اس کے باطن پر بھی اس کی نظر ہوتی ہے اس لیے اس کے عمل میں قوت پرواز آجاتی ہے لیکن یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ اگر مومن و کافر یعنی وہ کافر جو اللہ اور روز آخرت پر یقین رکھتا ہے، دونوں روح تسلیم کے ساتھ عمل بجالائیں تو دونوں کے عمل میں جزا کے اعتبار سے کیا فرق ہوگا یا کیا دونوں کو ایک جیسا ہی اجر عطا ہوگا؟

ہم جواباً یہ کہیں گے کہ دونوں کے عمل خیر میں بہت بڑا فرق ہے۔ رسالت مآبؐ کے آنے کی وجہ سے جو معارف اور حقائق منکشف ہوئے اور حسن عمل کے جو کامل طریقے آپؐ نے بتائے یا جو اخلاص و تسلیم کا درس آپؐ نے دیا اور جو عبادات کے خوبصورت طریقے آپؐ نے سمجھائے اور جو عبد و معبود کے درمیان رشتۂ عبودیت کو مضبوط بنانے والے معارف، احکام اور ارشادات آپؐ سے ظاہر ہوئے ان کا اپنا مقام ہے اور اس کی اپنی ایک اعلیٰ درجے کی تاثیر کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آپؐ تمام سابقہ انبیاء کرام کی روحانی معراج بن کر تشریف لائے۔ آپؐ کے وجود سے معارف اپنے کمال کو پہنچے۔ جو ایمان کی گہرائیاں آپؐ کو تسلیم کرنے اور آپؐ کی اتباع کے ذریعے پھوٹتی ہیں یہ کسی

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱، جزاول، صفحہ ۹۰

غیر مسلم کو نصیب نہیں ہو سکتیں۔ ایمان جتنا وسیع، گہرا اور کامل تر ہوتا چلا جاتا ہے عمل بھی اتنا ہی صالح سے صالح تر ہوتا جاتا ہے اور عبد و معبود کا رشتہ محکم تر ہوتا چلا جاتا ہے یہی ایک کافر اور مومن کے عمل کے درمیان فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روح تسلیم رکھنے والے کافر سے روح تسلیم رکھنے والے مومن کا مقام بلند ہوتا ہے اور اسی مقامِ بلند کی وجہ سے جنت میں اس کا درجہ بھی کافر سے بلند تر ہوتا ہے اور یہ بھی ہے کہ جنت کا وعدہ اللہ نے صاحبان ایمان سے کیا ہے جنت کافروں کے نیک اعمال کا نتیجہ نہیں ہے، مومنین کے نیک اعمال کا نتیجہ ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دین حق کسی ایک وقت میں ایک ہی ہوتا ہے آج کے دور میں آنحضرتؐ پر ایمان کے ساتھ ہی دین اپنی کامل حقانیت تک پہنچتا ہے اور اس سارے نظام عبادات و احکام کے ساتھ دین اپنے کمال تک رسائی حاصل کرتا ہے اور ان حقائق و کمالات سے وہ شخص محروم رہتا ہے جو آپؐ کی ذات پر ایمان نہیں رکھتا۔ گویا آپؐ پر کامل ایمان ہی میں انسانیت کی معراج کا راز پوشیدہ ہے۔ علاوہ ازیں کسی شخص کے بارے میں جب یہ معلوم ہو جائے کہ اُس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو یہ دعویٰ سارے انسانوں کے لیے ایک امتحان بھی بن جاتا ہے۔ اگر دعویٰ کرنے والا اس دعوے میں سچا ہے اور اس کا سچ کسی شخص پر ثابت ہو جاتا ہے تو پھر اس کا انکار کرنا ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں اور جیسا کہ ہم نے کہا کہ یہ ہٹ دھرمی ہی ہے جو کسی شخص کو حقیقی معنی میں کافر بناتی ہے نیز کسی انسان کے لیے یہ روا نہیں کہ جب اسے معلوم ہو جائے کہ کسی شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو وہ اس سے صرف نظر کرے کیونکہ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے اور اپنی عظمت کے اعتبار سے مخاطب کو معرض امتحان میں ڈال دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ فقط نبوت کا دعویٰ کیا بلکہ اپنے خاتم النبیین ہونے کا بھی اعلان کیا اس اعتبار سے قرآن حکیم اللہ کی آخری نازل کردہ کتاب ہے لہٰذا جس جس تک یہ خبر پہنچے اُس اُس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی حقیقت کا سراغ لگائے اور اس سے بے نیاز نہ رہے۔ درجہ بدرجہ یہی صورت حال دیگر اہم حقائق کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی بھی ہے۔ جیسا کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں اشارہ کیا گیا ہے:

عن اسحاق ابن راهویه قال لما وافی ابو الحسن الرضا علیه السلام نیسابور و ۔۔۔وقال سمعت ابا موسی بن جعفر یقول سمعت ابا جعفر بن محمد یقول سمعت ابا محمد بن علی یقول سمعت ابا علی بن الحسین یقول سمعت ابی الحسین بن علی یقول سمعت ابی امیر المومنین علی بن ابی طالب علیهم السلام یقول سمعت رسول اللہ (ص) یقول سمعت جبرئیل (ع) یقول سمعت اللہ عز و جل یقول لا اله الا اللہ حصنی فمن دخل حصنی امن عذابی فلما مرت الرحلة نادانا بشروطها و من شروطها۔[1]

اس حدیث شریف کا مفہوم یہ ہے:

اسحاق ابن راھویہ کہتے ہیں جب امام رضاؑ مامون کی طرف جاتے ہوئے نیشاپور سے گزرے تو لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اور عرض کیا: اے رسول خداؐ کے بیٹے! آپ ہمارے پاس سے گزرے لیکن ایسی کوئی حدیث بیان نہیں کی جس سے ہم فائدہ اٹھائیں آپ اس وقت عماری میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنا سر باہر نکالا اور فرمایا: میں نے اپنے والد موسی ابن جعفر سے سنا انھوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد جعفر بن محمد سے سنا انھوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد محمد بن علی سے سنا انھوں نے فرمایا میں نے اپنے والد علی ابن الحسین سے سنا انھوں نے فرمایا میں نے اپنے والد حسین بن علی سے سنا انھوں نے فرمایا: میں نے امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہم السلام سے سنا انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول خداؐ سے سنا آپ فرماتے ہیں کہ میں نے جبرائیل سے سنا انھوں نے خدا سے سنا کہ وہ فرماتا ہے لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جو اس میں داخل ہوگیا وہ میرے

[1] شیخ صدوق، الامالی (قم، مرکز الطباعة والنشر فی موسسة البعثة، طبع اول، ۱۴۱۷ھ) ص ۳۰۶، ح ۳۴۹

عذاب سے بچ گیا۔ پھر آپ کچھ آگے چلے اور ہمیں بلا کر فرمایا لیکن اس کی
کچھ شرائط ہیں اور میں ان شرائط میں سے ایک ہوں۔

البتہ مسلمان اور مومن کو بھی چاہیے کہ اپنے ایمان اور نیک اعمال کی حفاظت کرے کہ کہیں کسی برے عمل کی وجہ سے وہ ضائع نہ ہو جائیں۔

یقین جانیے شفاعت بھی انہی کی ہوگی جو لائق شفاعت ہوں گے۔ شفاعت کے نظریے کے تحت مت اپنے نفس کو گناہوں سے آلودہ کریں۔ ہم صدیوں سے دوسروں پر انگشت اٹھا رہے ہیں کہ فلاں ایسا تھا اور فلاں ایسا ہے۔ ہم اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم کیسے ہیں۔

اوروں کا احتساب تو کرتے ہیں روز روز
آؤ کہ آج اپنے گریباں میں جھانک لیں

ہم گزرے ہوئے لوگوں پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ امت تھی گزر گئی ان کا حساب کتاب بھی ہو گیا۔ ہم سے ہمارے بارے میں پوچھا جائے گا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ
عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ [1]

وہ ایک امت تھی جو گزر گئی جو اس نے کمایا وہ اس کے لیے ہے اور جو تم کماؤ گے وہ تمھارے لیے ہے اور تم سے ان کی کارگزاریوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔

زیر بحث موضوع کے حوالے سے چند مزید پہلو بھی لائق تحقیق ہیں تاہم مطالب کی طوالت کے پیش نظر یہاں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

---

[1] بقرہ: ۱۴۱

□

۱۔۷۔ جائز ہدف کے لیے وسیلے کا جائز ہونا

۱۔۷۔۱۔ سیرت رسول کا ایک پہلو

مندرجہ بالا موضوع کی طرف راقم کی پہلی مرتبہ توجہ اس وقت ہوئی جب ہم استاد مرتضیٰ مطہری کی کتاب ''سیری در سیرۂ نبوی'' کا مطالعہ کر رہے تھا۔ انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے بنیادی نکات بیان کرتے ہوئے ایک باب ''**کیفیت استخدام وسیله**'' (وسیلے سے استفادہ کرنے کا طریقہ) کے عنوان سے باندھا ہے۔ وہ اس مسئلے کو اٹھاتے ہوئے نہایت عمدگی سے بیان کرتے ہیں:

> **مسئله ای که مطرح است این است که آیا همین کافی است که هدف، انسانی باشد و بالاتر اینکه هدف الٰهی باشد؟ اگر هدف الٰهی بود دیگر وسیله فرق نمی کند و از هر وسیله ای برای آن هدف مقدس می توان استفاده کرد؟ فرض این است که هدف ماهدف مقدسی است۔ آیا برای هدف مقدس از هر وسیله ولو وسائل نامقدس وپلید می توان استفاده کرد؟ یا نه، برای هدف مقدس از وسیلۂ مقدس باید استفاده کرد۔۔۔**
>
> جو مسئلہ زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ کیا یہی کافی ہے کہ ہدف اور مقصد انسانی ہو یا اس سے بڑھ کر یہ کہ الٰہی ہو اور کیا ہدف کا الٰہی ہونا ہی کافی ہے اور اگر ہدف الٰہی ہو تو پھر اس بات میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وسیلہ کوئی بھی ہو اسے حاصل کرنے کے لیے؟ اور اس مقدس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے کسی بھی وسیلے سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟ اس بات میں فرض یہ کیا گیا ہے کہ

ہمارا ہدف مقدس ہے تو کیا مقدس ہدف کے لیے کسی بھی وسیلے سے یہاں تک کہ نامقدس اور ناپاک وسائل سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟ یا نہیں، بلکہ مقدس ہدف کے لیے ضروری ہے کہ مقدس وسیلے سے استفادہ کیا جائے۔[1]

آگے چل کر استاد مطہری بیان کرتے ہیں کہ اس بات کو علامہ طباطبائی نے تفسیر المیزان میں واضح کیا ہے کہ تمام انبیاء جن میں رسول اکرمؐ بھی شامل ہیں اپنی تبلیغ میں جن اصولوں کو ملحوظ رکھتے تھے ان میں سے ایک یہی ہے کہ حق کے حصول کے لیے باطل سے استفادہ نہیں کرتے تھے بلکہ حق کے حصول کے لیے خود حق ہی سے استفادہ کرتے تھے۔[2]

یہ بات ہمارے دل و دماغ میں رہی اور قرآن و سنت کے مطالعے کے دوران میں اس اصول پر ہم غور وفکر کرتے رہے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ قرآن کی تعلیمات میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روش حیات میں یہ اصول پوری طرح سے دمکتا اور چمکتا ہوا موجود ہے۔

اس بات کو آگے بڑھانے سے پہلے ہم یہاں یہ بھی کہنا چاہیں گے کہ استاد مطہری کے بعد بہت سے علماء، مفسرین اور دانشور اس موضوع کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے انبیاء اور آئمہ کی سیرت کی روشنی میں اس مسئلے کو مزید وضاحت سے بیان کیا ہے۔ تاہم اردو زبان میں ابھی تک ہماری نظروں سے کوئی ایسی تحریر نہیں گزری جس میں آنحضرتؐ کی پاک سیرت کی روشنی میں اس مسئلے کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہو۔ سطور ذیل میں ہم کوشش کریں گے کہ قرآن حکیم اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی روشنی میں اس مسئلے کو کچھ وضاحت سے بیان کریں۔

۱۔۷۔۲۔ تقویٰ قبولیت کا زینہ

قرآن حکیم میں ارشاد رب العزت ہے:

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ[3]

---

۱) مطہری، مرتضیٰ: سیری در سیرۃ نبوی (تہران، انتشارات صدرا، اشاعت دوم، محرم ۱۴۰۸ھ) ص ۱۱۹

۲) مطہری، مرتضیٰ: سیری در سیرۃ نبوی (تہران، انتشارات صدرا، اشاعت دوم، محرم ۱۴۰۸ھ) ص ۱۲۲

۳) مائدہ: ۲۷

خدا صرف صاحبان تقویٰ سے قبول کرتا ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مومن جب اللہ کی رضا کے لیے کسی مقصد اور ہدف کی طرف قدم اٹھاتا ہے تو وہ راستہ بھی ایسا اختیار کرتا ہے جسے اختیار کرنا اللہ کی رضا کا باعث ہو۔ تقویٰ درحقیقت ایک ایسی استعداد اور صلاحیت کا نام ہے جو ایک پاک دل انسان میں پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اسے ایسے راستے کی طرف جانے سے روکتی ہے جو اللہ کی نافرمانی کا راستہ ہو۔ اس کیفیت ہی کے پیدا ہونے سے ہدایت کے دروازے بھی انسان پر کھلتے ہیں جیسا کہ سورہ بقرہ کے شروع میں ارشاد فرمایا گیا:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ[1]

یہ وہ کتاب ہے جس میں شک نہیں (یا جس کے بارے میں شک نہیں کہ) متقیوں اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔

۱۔۷۔۳۔ نیکی اور تقویٰ کا باہمی تعلق

قرآن حکیم میں نیکی اور تقویٰ کا نہ ٹوٹنے والا رابطہ بیان فرمایا گیا ہے۔ تقویٰ اہل ایمان کے لیے روح عمل سے عبارت ہے جو نیکی کی منزل سے ہمکنار کرتا ہے لہٰذا خرابی وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں روح عمل تقویٰ سے خالی ہو چنانچہ ارشاد رب العزت ہے:

لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُھُوْرِھَا وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ[2]

نیکی یہ نہیں کہ گھروں میں ان کے پیچھے سے داخل ہو بلکہ نیکی اس کی ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو کہ شاید فلاح پا جاؤ۔

---

[1] بقرہ:۲

[2] بقرہ:۱۸۹

۱۔۷۔۴۔صحیح منزل کے لیے صحیح راستہ

حقیقت تو یہ ہے کہ غلط راستہ غلط منزل تک ہی پہنچاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان ہر روز بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ[1]

اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا یا سیدھے راستے پر قائم رکھ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ آپ سیدھے راستے پر ہیں۔چنانچہ سورہ یٰسین کے آغاز میں ہے:

يٰسٓ O وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ O اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ O عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ O[2]

یٰسین! حکمت والے قرآن کی قسم ہے کہ یقیناً آپ مرسلین میں سے ہیں (اور) سیدھے راستے پر ہیں۔

۱۔۷۔۵۔اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

رسول اللہؐ کے بارے میں اہلِ ایمان کو مخاطب قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ[3]

تمھارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں حسین اور پیارا نمونہ عمل ہے۔

اُسْوَةٌ کا معنی ہے نمونۂ عمل یا ایسی چیز جس سے تسلی حاصل ہو جب کہ حَسَنَةٌ "حَسَنٌ" کا مونث ہے جس کا معنی ہے حسین، پیارا اور خوبصورت۔لفظ خوبصورت یا بہترین حَسَنَة کے معنی کو ذہن کے قریب کرنے کے لیے مددگار تو ہے لیکن حقِ مطلب ادا نہیں ہوتا کیونکہ حَسَنَة صرف صورت کے خوب ہونے کی حکایت نہیں کرتا۔اسی طرح بہترین دوسروں کے مقابلے میں زیادہ

---

۱) فاتحہ:۵

۲) یٰسین:۱تا۴

۳) احزاب:۲۱

اچھا ہونے کا مطلب دیتا ہے جبکہ حَسَنَۃ سر تا پا پیارا، جاذب، زیبا، جو ظاہری اور باطنی تمام تر حسن و خوبی کا حامل ہو، پر صادق آتا ہے۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودِ مقدس میں ایک ایسا پیارا اور حسین نمونہ عمل موجود ہے جو سراسر ظاہری و باطنی حسن و زیبائی سے عبارت ہے۔ خاص طور پر جب مسئلہ اللہ کے رسول کے وجود میں نمونہ عمل کا ہو تو پھر دائمی اور باطنی حسن کی تمام تر خوبیوں کے حامل ہونے کا معنی دیتا ہے۔ آپؐ کے وجود میں ایک ایسا حسین نمونہ عمل موجود ہے کہ جس سے انسان کے باطن کو بھی تسلی حاصل ہوتی ہے اور یہ تسلی اس وقت زیادہ کمال کے ساتھ ظہور میں آئے گی جب انسان قیامت کے دن اللہ کے حضور پیش ہوگا۔ اس وقت اس پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ آنحضرتؐ کے نمونہ عمل کو اختیار کرنے سے خود اس کا باطن بھی حسن و زیبائی کا حامل ہو گیا ہے۔ آنحضرتؐ کی ذات حسن و زیبائی کا ایک ایسا سرچشمہ ہے کہ جس سے ہر انسان حسن و زیبائی کسب کر سکتا ہے۔

اس معنی اور مفہوم پر غور کرنے کے بعد کیا اس امر کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ آنحضرتؐ کی سیرت میں پاک اور مقدس ہدف کے حصول کے لیے نعوذ باللہ کوئی غیر مقدس راستہ اختیار کرنے کی گنجائش باقی ہو؟

۱۔۷۔۶۔ حسنِ مجادلہ اور حسنِ کلام

قرآن حکیم نے اپنے پیروکاروں کو ہر پہلو سے حسن و خوبی سے آراستہ ہونے کا حکم دیا ہے، یہاں تک کہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ[1]

اہل کتاب سے صرف زیادہ اچھے اور حسین انداز سے مجادلہ کرو۔

مجادلے کی روش میں عام طور پر مخالف یا طرفِ دیگر پر غالب آنا پیش نظر ہوتا ہے۔ اس کے لیے جو بھی راستہ اختیار کرنا پڑے فریقینِ مجادلہ عام طور پر اس سے نہیں چوکتے لیکن قرآن حکیم اپنے پیروکاروں کو حکم دیتا ہے کہ اہل کتاب سے مجادلہ کرتے ہوئے فکر، روش، مطلب اور حکمت گویا

۱) عنکبوت:۲۹: ۴۶

ہر پہلو سے ''احسن'' کو ملحوظ رکھو۔ مجادلے کے دوران میں قبیح راستہ و دلیل اختیار کرنا ایک مومن کو زیبا نہیں۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں سے بات کرنے کے انداز میں بھی حسن کا طالب ہے:

وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا[1]

اور انسانوں سے حسین انداز سے بات کرو۔

اور ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ

اللہ جمیل و یحب الجمال[2]

اللہ خود حسین ہے اور حسن کو پسند کرتا ہے۔

۱۔۷۔۷۔ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز نہیں

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے لیکن اسلام اس نظریے کو قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ ارشاد رب العزت ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ[3]

اے ایمان والو! اللہ کی خاطر عدل و قسط کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس امر پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو بلکہ عدل کرو کہ یہی تقوی سے نزدیک ترین ہے اور اللہ کا تقوی اختیار کرو کہ یقیناً اللہ تمھارے کاموں سے بہت باخبر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جنگوں میں مختلف قومیں ہر طرح کے غیر انسانی ہتھکنڈوں کو روا رکھتی ہیں۔ یہاں تک کہ انسانوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ جھوٹا پراپیگنڈا تو ایسے لوگوں کا ایک

---

[1] بقرہ: ۸۳

[2] احمد ابن حنبل (م ۲۴۱): مسند احمد (لبنان، بیروت، دار صادر) ج ۱، ص ۳۹۹

[3] مائدہ: ۸

معمولی سا ہتھیار ہوتا ہے۔ وحشی درندے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں تک کو قتل کرنے سے باز نہیں آتے لیکن انبیاء کی تعلیمات اس طرزِ عمل کی شدت سے نفی پر استوار ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا آیہ کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیروکاروں کو جنگ کے انسانی اصول تعلیم فرمائے تھے۔

رسول اکرمؐ نے تلوار چونکہ الٰہی مقاصد کے لئے اٹھائی تھی اس لیے آپ جنگوں میں جنگل کے اس قانون کے ہرگز قائل نہ تھے ''جنگ میں سب کچھ جائز ہے'' بلکہ آپؐ نے نوعِ انسانی کو جنگ کے لیے بھی ایسے آداب کی تعلیم دی جو ایک طرف آپؐ کی رحمۃ العالمین ہونے کی غماز ہے اور دوسری طرف رہتی دنیا تک انسان کے لیے مشعل راہ ہے۔ ایک حدیث میں امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

> رسول اللہ جب کسی لشکر کو جنگ کے لئے روانہ کرنے لگتے تو پہلے سب سپاہیوں کو جمع کر کے سامنے بٹھا لیتے اور فرماتے:
>
> اللہ کا نام لے کر اور اس کے سہارے اور اس کی راہ پر اور رسول خدا کی ملت پر چلو۔ کسی کو زنجیروں میں نہ جکڑو، کسی کے اعضاء نہ کاٹو، دھوکا دہی سے کام نہ لو، کسی بوڑھے ضعیف، کسی بچے اور عورت کو قتل نہ کرو اور جب تک ضروری نہ ہو کسی درخت کو نہ کاٹو۔''[1]

رسول کریمؐ اور آپؐ کے صحابہ حملے میں پہل نہ کیا کرتے تھے۔ پہلے مقابل پر آنے والے کو دعوتِ توحید و اسلام دیا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے شہروں اور آبادیوں میں زہر ڈالنے سے بھی منع کیا۔[2]

عصر حاضر میں جو وحشی قومیں آبادیوں کو جلانے کے لیے نیپام بم اور انسانوں کو اپاہج کرنے کے لئے کیمیائی ہتھیار تیار اور استعمال کرتی ہیں، انھیں رسول اسلامؐ سے انسانیت کا درس حاصل کرنا

---

۱) کلینی (م ۳۲۹): الکافی (ایران، تہران، دار الکتب، طبع دوئم، ۱۳۶۷ش) ج ۵، ص ۲۷

۲) کلینی (م ۳۲۹): الکافی (ایران، تہران، دار الکتب، طبع دوئم، ۱۳۶۷ش) ج ۵، ص ۲۸

چاہیے۔ افسوس تو یہ ہے کہ خود رسول اللہؐ کے دشمنوں نے آپؐ کے شہید ساتھیوں کے ساتھ اس درندگی کو روا رکھا۔

آپؐ کے جاں نثار چچا سید الشہداء حضرت حمزہ کی لاش کا مثلہ کیا گیا۔ مشرکین مکہ کے سربراہ ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے جنگ احد میں آپ کا سینہ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور اسے چبایا نیز ناک اور کان کاٹ کر ان کا ہار بنا کر گلے میں ڈالا اور اپنی بہیمیت کا مظاہرہ کیا۔[۱]

اس کے مقابل رسول اللہ کے جانثار بھائی حضرت علی نے جنگ خندق میں عمرو ابن عبدود کو قتل کیا تو اس کے بدن سے قیمتی زرہ تک نہ اتاری، اس لیے کہ اس کا جسم عریاں نہ ہو۔ اس بلند ظرفی کی داد خود عمرو کی بہن نے ان الفاظ میں پیش کی:

اسے کسی کریم انسان نے قتل کیا ہے۔[۲]

۱۔۷۔۸۔ حضرت داوُد پر اہل کتاب کی تہمت

اسلامی نظریے کے مطابق تمام انبیاء معصوم ہیں اور مقام عصمت، مقام نبوت کا ناگزیر حصہ ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بنی اسرائیل کی کتابوں میں بعض انبیائے الٰہی کے بارے میں نہایت ہی ناروا باتیں درج کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک وہ تہمت ہے جو حضرت داوُد علیہ السلام پر لگائی گئی ہے۔ نقل کفر، کفر نباشد کے تحت ہم اسے نقل کرتے ہیں:

> ایک دن حضرت داوُدؑ اپنے گھر کی چھت پر کھڑے تھے۔ ان کی نگاہ ہمسائے کے گھر کے صحن میں پڑی جہاں ایک خاتون نہا رہی تھی جو بہت حسین و جمیل تھی۔ حضرت داوُدؑ کے دل میں اس کے لیے خواہش پیدا ہوگئی اور وہ اس عورت کو کسی نہ کسی طرح اپنے گھر میں لے آئے اور اس سے ہم بستری کی۔ جس سے وہ حاملہ ہوگئی۔ اس عورت کا شوہر ایک پاکباز فوجی

---

۱) یعقوبی، احمد بن ابی یعقوب ابن واضح: تاریخ یعقوبی، اردو ترجمہ ثاقب اکبر (اسلام آباد، البصیرہ پبلیکیشنز، دسمبر ۲۰۱۰ء) ص ۲۵۲

۲) تاریخ خمیس، ج ۱

افسر تھا۔ داؤد نے ایک سازش کے تحت اسے ایک خطرناک جنگ پر بھیج دیا جس میں وہ شہید ہوگیا اور آپ نے اس کی بیوی سے شادی کر لی۔ [نعوذ باللہ من ذالک][1]

شاید ایسی ہی خرافات ہیں جن کی بنیاد پر آج بہت سے اہل کتاب جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز کا نعرہ بلند کرتے ہیں مغرب کی مادر پدر آزاد تہذیب اور سفاکانہ جنگوں کا عالمی سلسلہ ان کے اسی نعرے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

انفرادی طور پر بھی بہت سے لوگ اپنے مجازی محبوب کے حصول کے لیے ہر طرح کی شرافت اور اخلاق کی حد پھلانگ جاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے۔ یہ ایک انتہائی گمراہ کن نظریہ ہے۔ اگر بے اصولی کے اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اخلاق اور شرافت کا کوئی معنی باقی نہیں رہ جاتا۔

۱۔۷۔۹۔ رسول اکرمؐ نے کفار کی ہر ترغیب ٹھکرا دی

آنحضرتؐ نے جب تبلیغ رسالت کا آغاز کیا تو قریش نے طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچا کر آپؐ کو اس کام سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جب آپؐ کے ارادے کو انھوں نے استوار اور محکم پایا تو پھر ترغیب کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی چنانچہ محدثین اور مورخین نے اس سلسلے میں کئی ایک واقعات کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک روایت آنحضرتؐ کے عم زاد حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے:

> ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قریش نے رسول خداؐ سے کہا کہ ہم آپ کو اتنا مال دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے امیر ترین آدمی بن جائیں گے، جس خاتون سے کہیں ہم اس سے آپ کی شادی کر دیں گے، اس کے بدلے میں آپ ہمارے خداؤں کو برا بھلا نہ کہیں۔ اگر آپ یہ بھی نہیں مانتے تو ہم ایک اور پیشکش کرتے ہیں جس میں آپ کے لیے فائدہ ہے۔ فرمایا وہ کیا: کہا ایک

۱) کتاب دوئم اشموئیل فصل ۱۱، آیت ۲ تا ۲۷

> سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں گے۔ اس وقت سورہ کافرون نازل ہوئی۔[1]

یہ رسول اکرمؐ کی روش حیات کا تقاضا تھا کہ آپؐ نے ترغیب وترہیب کے ہر ہتھکنڈے کو ٹھکرا دیا۔ کوئی ایسا شخص ہوتا جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے وسیلے اور سبب کے پاک ہونے پر یقین نہ رکھتا ہوتا تو ممکن ہے وہ سوچتا کہ ایک دفعہ اقتدار ہاتھ میں آجائے تو پھر آسانی سے میں اپنا عقیدہ اور طریقہ لوگوں سے منوالوں گا لیکن آنحضرتؐ جو انسانوں کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ نفس پر مامور تھے انھوں نے دنیاوی مال ومنال، عہدہ ومنصب اور دیگر ترغیبات کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا اور دین مقدس کی سربلندی کے لیے دکھ اور تکلیف کا راستہ اختیار کرلیا کیونکہ یہی راستہ ٹھیک مقصد الٰہی تک پہنچاتا تھا۔

اس سلسلے میں ایک اور بھی روایت ہے جسے بہت سے مورخین ومحدثین نے نقل کیا ہے ہم یہاں اسے تفسیر قمی سے نقل کرتے ہیں:

> جب رسول خداؐ نے اعلانیہ تبلیغ شروع کی تو قریش کا ایک وفد حضرت ابو طالب کے پاس آیا اور کہا کہ تیرا بھتیجا ہمیں بیوقوف سمجھتا ہے ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتا ہے، ہمارے نوجوانوں کو خراب کررہا ہے۔ ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کررہا ہے۔ اگر وہ یہ سب کچھ مال ودولت کے لیے کررہا ہے تو ہم اسے اتنا مال دیتے ہیں کہ وہ مکہ کا سب سے امیر آدمی بن جائے گا اور ہم اسے اپنا سردار بھی تسلیم کرلیں گے۔ حضرت ابو طالب نے یہی بات رسول خداؐ سے کہی تو آپ نے فرمایا اگر یہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں اپنے مشن سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ ہاں اگر یہ میری ایک بات مان لیں تو پورے عرب پر ان کی حکمرانی

---

[1] ابن ابی حاتم (۳۲۷) تفسیر ابن ابی حاتم، صیدا، المکتبۃ العصریہ، ج ۱۰، ص ۳۴۷۱، ح ۱۹۵۱۸
نیز طبری (۳۱۰) تاریخ طبری، بیروت، لبنان، موسسۃ الاعلمی، ج ۲، ص ۷۵

ہو جائے گی اور عجم بھی ان کے آگے سر جھکائیں گے اور یہ جنت کے بھی
مالک بن جائیں گے۔ جب انھوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے تو فرمایا توحید اور
میری رسالت کی گواہی دے دیں۔[1]

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کو خود اپنے طریقے اور ہدف پر سب سے بڑھ کر ایمان تھا۔ وہ تو آپ کو فقط مکے کی سرداری پیش کر رہے تھے آپ انھیں عرب و عجم کی حکمرانی کی پیشکش کر رہے تھے۔ واقعاً دین اسلام پر حقیقی ایمان کا تقاضا دنیا و آخرت کی سربلندی ہے۔

۱۔۷۔۱۰۔ سورج گرہن اللہ کی آیت ہے

ام المومنین حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے آنحضرت کو اللہ تعالیٰ نے ایک فرزند عطا فرمایا جس کا نام آپ نے ابراہیم رکھا۔ یہ بیٹا آپ کو نہایت عزیز تھا لیکن افسوس کہ ابھی ڈیڑھ برس ہی کا ہوا تھا کہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ آج بھی جنت البقیع میں ان کی قبر مبارک موجود ہے۔ ابراہیم کی وفات پر اللہ کے پیارے رسولؐ نہایت ہی غمگین تھے۔ آپؐ کے صحابہؓ بھی اس غم واندوہ میں آپؐ کے شریک تھے۔ اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ اس روز سورج کو گرہن لگ گیا۔ صحابہؓ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آنحضرتؐ کو بہت محبوب رکھتا ہے۔ انھوں نے خیال کیا کہ آج ساری کائنات آنحضرتؐ کے غم میں غمزدہ ہے اور سورج گرہن بھی ایک طرح سے اس غم کا اظہار ہے۔ اس واقعے کو مختلف محدثین نے نقل کیا ہے مسند احمد ابن حنبل میں ہے:

جس دن رسول خداؐ کے بیٹے ابراہیم فوت ہوئے اسی دن سورج گرہن لگا تو
صحابہ نے کہا: یہ ابراہیم کی وفات کی وجہ سے لگا ہے۔
رسول خداؐ نے فرمایا:
سورج اور چاند اللہ کی آیات میں سے ہیں، انھیں گرہن لگنا کسی کی موت یا
زندگی سے مربوط نہیں ہے۔[2]

---

۱) علی بن ابراہیم قمی (۳۲۹) تفسیر قمی، نجف، مطبعۃ النجف، ج ۲، ص ۲۲۸

۲) احمد بن حنبل (۲۴۱) مسند احمد، بیروت، لبنان، دار صادر، ج ۵، ص ۴۲۸

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے نہیں چاہا کہ کائنات میں رونما ہونے والی ایک تبدیلی جسے آپ کے صحابہؓ آپ کے غم سے مربوط سمجھ رہے تھے اسے ان کے ایمان کی تقویت کے لیے استعمال کریں۔ ممکن ہے کوئی اور شخص ہوتا تو یہ سمجھتا کہ اگر اس کے ماننے والے اس واقعے کی وجہ سے اس سے زیادہ گہری وابستگی پیدا کرلیں گے تو اس موقع پر کم از کم خاموش ہی رہتا لیکن آنحضرتؐ نے نہ چاہا کہ ایسی غلط فہمی کو ایمان کی تقویت کے لیے استعمال کریں۔ آپؐ سچائی اور صداقت ہی کی بنیاد پر اپنے ماننے والوں کی تقویت چاہتے تھے اور ہمیشہ اسی راستے پر کاربند رہے۔

استاد مطہری نے بھی اس واقعے کو اسی پس منظر میں ذکر کیا ہے۔[1]

---

[1] مطہری، مرتضیٰ: سیری در سیرۂ نبوی (تہران، انتشارات صدرا، اشاعت دوم، محرم ۱۴۰۸ھ) ص ۱۳۶ و ۱۳۷

ا۔۸۔ایران و پاکستان میں کلام جدید کا ارتقاء اور اس کا ردعمل

ا۔۸۔ا۔ایران میں استاد مطہری

ایران میں جدید علم کلام کا بہت غُلغلہ ہے۔اس موضوع کو زیادہ شرح وبسط سے استاد مرتضیٰ مطہری (م ۱۹۷۹) نے اٹھایا ہے۔اُن کے معاصرین اور اُن سے قبل کے بعض اہل علم نے بھی جدید کلامی روش کو اختیار کیا ہے۔تاہم کلام جدید کے معاصر ایرانی اساتذہ کا کہنا ہے کہ یہ اصطلاح سب سے پہلے ایران میں استاد مطہری نے ہی استعمال کی ہے۔[۱]

ا۔۸۔۲۔برصغیر میں سرسید اور شبلی

پاکستان و ہند میں اس حوالے سے نظر ڈالی جائے تو سرسید احمد خاں (۱۸۹۸۔۱۸۱۷) وہ پہلے مردِ کلام دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے اس کی ضرورت کا ادراک کیا اور واضح طور پر اعلان کیا کہ:

> ''اس نئی صورت حال میں جب کہ پرانے علوم مسترد ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ نئے علوم لے چکے ہیں، اس بات کی ضرورت پیدا ہوئی ہے کہ ایک نیا علم کلام مرتب کیا جائے۔جس سے یا تو ہم علوم جدید کے مسائل کو باطل کر دیں یا ان کو مشتبہ کر دیں یا اسلامی مسائل کو ان کے مطابق کر دکھائیں۔''[۲]

پھر اس حوالے سے انھوں نے تازہ افکار بھی پیش کیے۔البتہ بعض معاصر ایرانی دانشوروں کو اشتباہ ہوا ہے کہ ''کلام جدید'' کے پیش رو شبلی نعمانی (م ۱۹۱۶) ہیں۔[۳] یہ اشتباہ شاید ان کی کتاب ''علم الکلام'' سے پیدا ہوا ہے۔انھیں تو بعض دانشوروں نے ''سرسید کا پرتو''[۴] قرار دیا ہے۔

---

۱) جعفر سبحانی: مدخل کلام جدید در علم کلام، قم (ایران): موسسہ امام صادق، ۱۳۷۵ھ ش، ص ۱۰

۲) سرسید احمد خان کا سفرنامہ پنجاب، ص ۲۶۹، مرتبہ مولوی سید اقبال علی

۳) جعفر سبحانی: مدخل کلام جدید در علم کلام، قم (ایران): موسسہ امام صادق، ۱۳۷۵ھ ش، ص ۱۰

۴) ڈاکٹر ابواللیث نے اپنی یہ رائے ڈاکٹر آفتاب احمد کی کتاب ''شبلی۔ایک دبستان'' کے مقدمے میں تحریر کی ہے۔

تاہم قاضی جاوید بجا کہتے ہیں:

بایں ہمہ یہ امر واقعہ ہے کہ سید احمد خان اور شبلی نعمانی کے رویوں میں اساسی اختلافات موجود تھے اور یہ کہ انھوں نے جن مکاتب فکر کی بنا ڈالی وقت کے ساتھ ساتھ ان میں دوری بڑھتی گئی۔[۱]

ا۔۸۔۳۔اہل تشیع کے چند نام

اس سلسلے میں اہل تشیع میں سے مولوی چراغ علی (۱۸۹۵۔۱۸۴۴) اور سید امیر علی (م ۱۹۲۸) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ تاہم کیا ایسے افراد جو روایت شکنی کے بعد فکر ونظر کی تازہ دنیا آباد کرتے ہیں انھیں شیعہ وسنی کے روایتی حصار میں قید رکھا جاسکتا ہے یا نہیں، یہ سوال اپنی جگہ پر نہایت اہم ہے۔ البتہ مولانا قمر الزمان سبزواری (م ۱۹۶۰) اس حوالے سے قدرے مختلف آدمی تھے۔ سرسید احمد خان نے تو اپنے بارے میں خود کہا تھا کہ ''میں نیم چڑھا وہابی ہوں''۔ تاہم ان کے جدید کلامی افکار کا مطالعہ ان کے اس قول کی جدید تاویل کا متقاضی ہے۔ جہاں تک محمد ابن عبدالوہاب کی تحریک کا تعلق ہے وہ رفتہ رفتہ ظاہریت میں تبدیل ہوگئی ہے۔

ا۔۸۔۴۔پاکستان کے چند مزید دانشور

اس تحریک کے لیے علامہ اقبالؒ (۱۹۳۸۔۱۸۷۶) نے بھی اجتہاد کے بارے میں اپنے معرکۃ الآرا خطبے میں کچھ ایسی ہی رائے کا اظہار کیا تھا۔[۲] خود اقبال کی کلام جدید میں خدمات کو نظر

---

[۱] قاضی جاوید: سرسید سے اقبال تک، نگارشات، لاہور (۱۹۸۹ء) ص ۱۲۹

[۲] علامہ اقبال کہتے ہیں: ''بہر حال جہاں تک تحریک وہابیت کا تعلق ہے ہمیں اس سے بحث نہیں کہ محمد علی پاشا (والی مصر) کے عساکر نے کب اور کس طرح اس کا خاتمہ کیا۔ یہاں بحث آزادی اجتہاد کی اس روح سے ہے جو اس تحریک میں کام کر رہی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ داخلی طور پر اس کا مزاج بھی سرتاسر قدامت پسند تھا۔ اس نے مذاہب اربعہ کی قطعیت سے انکار کیا اور اس لیے آزادی اجتہاد کے حق پر بھی بڑے شدومد سے زور دیا، لیکن ماضی کے بارے میں چونکہ اس کا نقطہ نظر سرتاسر غیر تنقیدی رہا، لہٰذا امور قانون میں اس نے اپنا دارومدار صرف احادیث پر رکھا۔'' (تشکیل جدید الٰہیات، خطبہ الاجتہاد فی الاسلام، ترجمہ نذیر نیازی)

انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ بعض دانشوروں کی رائے میں وہ فلسفی نہیں بلکہ متکلم ہیں۔ البتہ راقم کی رائے میں کلام جدید میں کارفرما فلسفی بنیادوں کو پیش نظر رکھیں تو پھر کسی فلسفی کا عصر حاضر میں متکلم ہونا عیب نہیں بلکہ ہنر بن جاتا ہے۔ کلام جدید کے بعض اہم دانشور بنیادی طور پر فلسفی ہی ہیں۔ مولانا قمر الزمان سبزواری کی ایک مختصر کتاب ''راز قدرت'' میری نظروں سے گزری تھی جس نے مجھے حیران کر دیا تھا، افکار سے زیادہ باعث حیرت اُن کی گم ہو جانے والی شخصیت پر ہے۔ اہل علم میں ان کے افکار کی بازگشت مجھے کہیں سنائی نہیں دی۔ شاید اُن کے نواسے ڈاکٹر ناصر رضا زیدی[۱] اس کی طرف متوجہ ہوں۔ شیعوں میں ابن حسن جارچوی بھی کچھ مختلف آدمی تھے۔ اُن کے خطبات کی کتاب ''فلسفہ آل محمدؐ''[۲] اس پر شاہد ہے۔ یہ فلسفے کی کتاب نہیں بلکہ جارچوی صاحب کے مذہبی افکار کی توجیہ نو ہے۔ اسے اُن کے مذہب کی عصری تاویل بھی کہا جا سکتا ہے۔ اہل حدیث خاندانوں کے بعض علماء نے بھی کلام جدید کی وادی میں قدم رکھا اور خوب دادِ سخن دی ہے۔ ان میں سے مولانا جعفر شاہ پھلواروی (۱۹۸۲ـ۱۹۰۲) شاید پہلے نمبر پر ہیں۔ مولانا محمد حنیف ندوی (۱۹۸۷ـ۱۹۰۸) کا نام بھی اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ کلامِ جدید کے شہسواروں کے ناقدین کی بھی کمی نہیں۔ سب سے زیادہ گالیاں سرسید کے حصے میں آئی ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔[۳]

۱ـ۸ـ۵ـ دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی ضرورت

افکار کے ردّ و قبول کے بارے میں ہمارے رویے افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ جو شخص دلیل کے ساتھ اپنی بات پیش کرتا ہے وہ حق رکھتا ہے کہ اس کی بات کو قبول کر لیا جائے یا دلیل کے ساتھ

۱) ڈاکٹر ناصر زیدی نے فقہ و اصول فقہ میں دورہ اجتہاد کی تکمیل کے بعد تہران یونیورسٹی سے فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ہے۔ کچھ عرصہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے شعبہ تحقیق کے سربراہ رہے۔

۲) آخری مرتبہ یہ کتاب رحمت اللہ بک ایجنسی کراچی نے ۱۹۹۹ء میں شائع کی ہے۔

۳) سرسید احمد خان کے خلاف ''محرف قرآن'' کے نام سے مولانا عبدالقیوم حقانی کی ایک کتاب منظر عام پر آ چکی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب سرسید کو ''محرف قرآن'' ثابت کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کے ٹائٹل پر لکھا ہے ''سرسید احمد خان، اپنی تحریرات فاسدہ اور عقائد کاسدہ کے آئینہ میں'' کتاب ادارۃ العلم والتحقیق، نوشہرہ نے شائع کی ہے۔

رڈ کر دیا جائے۔ نظریے کا کلی ردو قبول ہو یا جزئی، یہی راستہ درست معلوم ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو الزامات عائد کرنے لگتے ہیں اور کردار کشی پر اُتر آتے ہیں، وہ غلط راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اسے پست حرکت کہے بغیر چارہ نہیں۔

جولوگ کردار کشی پر اتر آتے ہیں وہ افراد اور معاشرے کے مابین بدگمانی اور نفرت کی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل معاشرے کے فکری ارتقا میں حائل ہوجاتے ہیں اور جمود ورکود کا باعث بنتے ہیں۔ افراد سے گزر کر یہ رویے قوموں کی ذہنیت میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ وہ قومیں جونئی بات سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہ ہوں فکری جمود کا شکار رہتی ہیں اور فکری جمود ہی علمی جمود کا ذریعہ بنتا ہے۔ علامہ اقبال قوموں کے فکری جمود ہی کا گلہ یوں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں[1]

ا۔۸۔۶۔ منفی ردعمل اور مردانِ کار

یہاں معاملہ کسی فکر کے درست و نادرست یا صالح وغیر صالح کا نہیں فقط کسی فکر کے بارے میں ردعمل کے طریقے کا ہے۔ رائے سرسید کی ہو یا علامہ اقبال کی، امام خمینی کی ہو یا استاد مصطفیٰ ملکیان[2] کی اسے سوچنے والے ایک انسان کی رائے کے طور پر سامنے آنا چاہیے۔ اسے قبول یا رد کرنے کے لیے دلیل واستدلال کے مرحلے سے گزرنا چاہیے۔ کسی کو سامراج کا ایجنٹ کہنا، کسی کو منحرف کہنا، کسی کی تکفیر کرنا اور کسی کو محرف قرآن قرار دینا، یہ رویہ درست نہیں۔ اگر یہ رویہ نہ ہو تو ہم اپنے مفکرین سے اس سے کہیں زیادہ مستفید ہوسکتے ہیں جتنا استفادہ بالعموم اُن کی زندگی میں یا بعد میں ہو پاتا ہے۔ اگر منفی ردعمل کا اور کردار کشی کا اندیشہ نہ ہوتو اہل فکر زیادہ وضاحت سے اور کھل کر اپنی بات کر سکتے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ سرسید نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو انھوں نے سوچا لیکن علامہ

---

[1] بانگ درا، نظم: بزم انجم

[2] استاد مصطفیٰ ملکیان عصر حاضر کے علم کلام جدید کے نامور دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں وہ تہران یونیورسٹی کے شعبہ الٰہیات سے وابستہ رہے ہیں۔

اقبال نہیں کہہ پائے۔ اگر چہ ''بڑے دماغ'' علامت واستعارہ اور ابہام کا سہارا لے کر بہت کچھ کہہ دیتے ہیں، تاہم ''متشابہات'' کے پیچھے پڑے رہنے والوں کے لیے اس میں سرمایۂ عمل موجود ہوتا ہے۔ امام خمینی کو بھی موقع مل گیا اور انھوں نے بہت کچھ بیان کردیا لیکن سب کو ایسے مواقع میسر نہیں آتے۔ خود امام خمینی نے ایک مقام پر بیان کیا ہے کہ جب اُن کے بڑے صاحبزادے مرحوم مصطفیٰ خمینی (م ۱۹۷۸) ابھی چھوٹے تھے تو انھوں نے کسی مدرسے کے گلاس میں پانی پیا، مولوی صاحبان نے اس گلاس کو ''شرعی طریقے'' سے پاک کیا اور پھر استعمال کیا کیونکہ اُن کے خیال میں امام خمینی فلسفے کا درس دینے کی وجہ سے کافر تھے اور کافر کا بیٹا ''کافر کے حکم میں'' ہوتا ہے۔ اس لیے جب اُن کے خیال میں ''کافر'' نے کسی گلاس میں پانی پیا تو وہ نجس ہوگیا۔ یہ واقعہ امام خمینی نے اپنے معروف مکتوب ''منشورِ روحانیت'' میں بیان کیا ہے۔ اس میں جامد فکر علماء کے ایک طبقے کی طرف سے امام خمینی کو جتنا ستایا گیا اور جتنی اذیتیں دی گئیں اس کا بیان بڑے پرسوز انداز سے کیا گیا ہے۔

استاد مرتضیٰ مطہری جن پر آج حوزہ ہائے علمیہ بڑا ناز کرتے ہیں کہ وہ ان میں سے ہیں، کبھی حوزہ علمیہ کی تنگ فضا میں مجبور ہوگئے تھے کہ شرح منظومہ[1] کا عمومی درس بند کردیں۔ یہ درس پھر انھوں نے ایک بند حجرے میں کہنا شروع کیا جس میں اُن کے چار منتخب شاگرد شریک ہوتے تھے۔ اب اُن کی یہی شرح حوزہ ہائے علمیہ کے مفاخر کا حصہ بن گئی ہے۔

نجف اشرف میں امام باقر الصدر شہید (م ۱۹۸۰)، جو آج اس سرزمین کا سب سے زیادہ قابل افتخار نام ہیں، کی اس قدر کردار کشی کی گئی اور اتنے طعنے دیے گئے کہ انھیں اپنے اس وظیفے کا سلسلہ بند کرنا پڑا جو وہ نجف اشرف کے دینی طلبہ کو ''مرجع'' کی حیثیت سے دیتے تھے۔[2] اُن کا ایک قصور یہ بھی تھا کہ ''کم عمری'' میں مقامِ مرجعیت تک جا پہنچے تھے۔ آج اُن کی کتب حوزہ ہائے علمیہ کے نصاب میں شامل ہیں۔ یہاں یہ بات کہہ دوں کہ مسئلہ فقط ہم عصری کا نہیں کہ جو کسی عظیم انسان کے لیے ایک حجاب بن جاتی ہے بلکہ حسد جیسی رذیل بیماریاں بھی سدِّ راہ ہوجاتی ہیں۔

---

۱) شرح منظومہ عظیم فیلسوف ملاہادی سبزواری کی کتاب ہے۔

۲) مرجع اس فقیہ کو کہتے ہیں جس کی طرف عامۃ الناس مسائل شرعی میں تقلید کے لیے رجوع کرنے لگیں۔

آیۃ اللہ سید محمد رضا گلپا یگانی (م ۱۹۹۳) کے مدارس میں فلسفے کا درس کہنے پر پابندی تھی۔ کسی کو اجازت نہ تھی کہ وہاں فلسفے کا درس کہے۔ یہ سلسلہ اُن کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔ آیت اللہ اسد اللہ بیات جو ایران کی مجلس شوریٰ اسلامی کے ڈپٹی سپیکر رہے تھے، جب سیاست سے کنارہ کش ہوئے تو حوزہ علمیہ قم میں پھر سے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے آیت اللہ گلپا یگائی مرحوم کے دارالقرآن میں فلسفے کی کتاب ''نہایہ'' کا درس کہنا شروع کیا تو اُن پر پابندی عائد کر دی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آیت اللہ گلپا یگانی نے امام خمینی کی نماز جنازہ پڑھائی۔

پاکستان میں ڈاکٹر فضل الرحمن مرحوم (۱۹۸۸۔۱۹۱۹) کی شدید مخالفت ہوئی۔ مولوی صاحبان نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا کیونکہ وہ کچھ تازہ افکار کا اظہار کرتے تھے۔ فضا ان کے لیے ایسی تیرہ و تار ہوئی کہ وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

مولانا مودودی (۱۹۷۹۔ ۱۹۰۳) کو جدید و قدیم کے درمیان کی شخصیت کہا جا سکتا ہے۔ تاہم عقائد، فہم تاریخ اور احکام کے حوالے سے انھوں نے بعض باتیں رائج اور روایتی فکر سے ہٹ کر کی ہیں۔ اس پر ان کی ذات پر شدید حملے ہوئے۔ بعض نے تو ابھی تک انھیں معاف نہیں کیا۔ ان کی کچھ جماعتی اور سیاسی مشکلات بھی تھیں جن کی وجہ سے وہ بہت کچھ کھل کر نہ کہہ سکے۔ وہ بہت سے مقامات پر ضرورت سے زیادہ محتاط دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی اس کیفیت کا ذکر ایک مقام پر اُن کے صاحبزادے حیدر فاروق مودودی نے بھی کیا ہے۔[۱]

۱۔۸۔۷۔ جدید فکر بھی قدیم ہو جاتی ہے

جدید فکر کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ معاشرے میں قبول ہو جائے تو انسانی فکر ایک مرحلہ تو آگے بڑھتی ہے لیکن وہی ''جدید فکر'' پھر سے ''قدیم'' ہو جاتی ہے کیونکہ وہ معاشرے کے جامد فکر لوگوں کے ہاتھ آ جاتی ہے۔ جامد فکر لوگ اُس کے وارث بن جاتے ہیں اور صاحب فکر کے مجاور بن جاتے ہیں۔ اس طرح وہ جدید فکر کو آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ یہ ایسے فن کار ہوتے ہیں کہ علامہ اقبال ہی کا نام اُن کے خلاف استعمال کر لیتے ہیں، امام خمینی ہی کا نام اُن کے خلاف استعمال

۱) اسے راقم نے اپنی کتاب 'جماعت اسلامی پاکستان، ایک حاصل مطالعہ' میں نقل کیا ہے۔ (ص۔ ۴۰)

کر لیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر فکر جو ایک دور میں جدید ہو اپنے بعد والے دور میں بھی جدید قرار پائے۔ ضروری نہیں کہ امام شاطبی [۱] نے مقاصد شریعت کے جو عناصر بیان کیے ہیں انھیں حتمی قرار دے کر اُن کے گرد حصار قائم کر دیا جائے۔ جو لوگ اپنے دور میں بت شکن بن کر اٹھتے ہیں انھیں کو بعد میں بُت بنا لیا جاتا ہے۔ نبیوں، اماموں، فلسفیوں، مفکروں، مصلحوں، سیاستدانوں، شاعروں اور ادیبوں سب کے ساتھ یہی ہاتھ ہوا ہے۔ جو بھی عظیم ثابت ہو گیا وہی بت بن گیا۔ اُن کی فکر، ان کی اصطلاحیں، اُن کا طرز استدلال بلکہ اُن کا لباس، اُن کا عمامہ اور اس سے بڑھ کر اُن کے لباس کے رنگ ہر چیز بت پرستی کے عناصر میں شامل ہو گئی۔

ایک مرتبہ حضرت علیؑ سے کسی نے کہا کہ داڑھی کو خضاب کرنا سنتِ رسولؐ ہے۔ آپ نے فرمایا یہ خضاب جنگ بدر میں اس لیے کیا گیا تھا کہ اسلامی فوج میں شامل بہت سے سفید ریش سپاہی تھے۔ نبی کریمؐ نے چاہا کے دشمن یہ نہ سمجھے کہ بوڑھے بوڑھے افراد مسلمانوں کی فوج میں شامل ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت علیؑ جمود ہی کو روکنا چاہتے تھے لیکن کیا کیجئے کہ جب علیؑ ہی کی پرستش ہونے لگے۔

۱۔۸۔۸۔ افکار نو کے خلاف مقدسات کا استعمال

افکار نو کی شاید سب سے بڑی مشکل مذہب و مقدسات کا اُن کے خلاف استعمال ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکنے کے لیے بتوں ہی کے تقدس کو بروئے کار لایا گیا۔ اس کے لیے عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا گیا۔ پوری انسانی سوسائٹی کو حرکت میں لایا گیا۔ لوگ جوش و خروش سے حضرت ابراہیمؑ کو جلانے کے لیے ایندھن اکٹھا کرنے لگے۔ سقراط کو زہر پلانے کے لیے بھی پراپیگنڈا کا بازار اس کے خلاف گرم کیا گیا۔ پیغمبر اسلامؐ کے خلاف تین سال سے زیادہ سماجی واقتصادی بائیکاٹ رہا۔ شعب ابی طالب میں بنی ہاشم کے بھوکے پیاسے بچوں کے بلکنے کی آواز بھی قریش کی انسانی فطرت کو مہمیز نہ کر سکی تو اس کے پیچھے بتوں کے تقدس کا عقیدہ ہی کارفرما تھا۔ مخالفین کہتے تھے کہ محمدؐ ان کے آباؤ اجداد کے عقاید کی توہین کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کو پھانسی دینے کے لیے

۱) ابراہیم شاطبی، آٹھویں صدی ہجری کے معروف اور جرات مند مالکی فقیہ

یہودی ملاؤں نے مذہب ہی کا ہتھیار استعمال کیا۔ ازمنہ وسطیٰ میں خود کلیسا نے بھی وہی رویہ اختیار کیا اور مخالف عقائد و افکار رکھنے والوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ بالکل یہی رویہ اب مغربی تہذیب کے علم برداروں کا ہے۔ جو کوئی بھی مغربی فہم کے کسی عنصر یا مغربی تہذیب کے کسی مظہر کا انکار کرتا ہے، اُسے انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کے طعنوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بعض ملکوں اور معاشروں میں مسلمان عورتوں کے حجاب کے خلاف کیے جانے والے ''شدت پسندانہ'' اقدامات اس کی مثال ہیں۔ سیکولرزم کا مطلب اگر یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے پر اپنا نظریہ، عقیدہ یا کلچر مسلط نہ کرے تو یہ حق سیکولرزم کے پرچم برداروں کو دوسروں کو بھی دینا چاہیے۔ اگر حجاب کو پسند کرنے والی عورت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنا حجاب دوسروں پر مسلط کرے تو حجاب کو پسند نہ کرنے والوں کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ زبردستی کسی کو بے حجاب کریں۔

جدید عقلیت پسندی کی مغربی روش ہو یا مشرقی، ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کو سوچنے اور اپنی رائے بیان کرنے کی آزادی ہو۔ فکر کے درست یا نادرست ہونے سے قطع نظر سوچنے والوں کے افکار سامنے آنا چاہئیں۔ ہمیں دلیل مانگنے کا حق ہے۔ ردّ و قبول کا بھی حق ہے۔ البتہ وہ بھی دلیل کی بنیاد پر لیکن اگر تازہ سوچ کی اجازت نہ ملے تو پس ماندہ معاشرے پس ماندگی کی دلدلوں سے نہیں نکل پاتے اور ترقی یافتہ معاشرے تنزل کا سفر اختیار کر لیتے ہیں جو شروع شروع میں اگرچہ غیر محسوس ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ دنیا بدل جاتی ہے۔

جب دل کی بات سننے والا کوئی نہ ہو تو علیؑ جیسوں کو کنویں میں منہ ڈال کر باتیں کرنا پڑتی ہیں اور جب گوش شنوا موجود ہوں تو ''منشور روحانیت'' میں اپنے دل کا درد بیان کرنے میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔

۱۔۸۔۹۔ بات کہنے کے لیے ہنر چاہیے

تاہم اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اُسے دانائی یا حکمت میں سے کچھ حصہ ملا ہے، جو سمجھتا ہے کہ اُس نے فکر انسانی کی کچھ گرہوں کو کھول لیا ہے اور کسی کی رائے ہے کہ اُس کے پاس انسان کو دینے کے لیے کوئی تازہ خیال موجود ہے تو اُسے کہنے کا راستہ تلاش کرنا چاہیے۔

بقول اقبال:

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے، پا بہ گِل بھی ہے
انھی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کرلے [۱]

سقراط کو موت نہیں مار سکتی۔ دنیا نے خون کو تلوار پر غالب آتے بھی دیکھا ہے۔ جسے اپنی سچائی پر بھروسہ ہے اُسے سچ کہنے کا ہنر بھی آنا چاہیے۔

میں نہیں سمجھتا کہ دنیا اس لحاظ سے بدل گئی ہے کہ اب انسان آزادی سے، بغیر کسی رکاوٹ کے، اپنی فکر کا اظہار کرسکتا ہے۔ انسان کی فطرت میں کوئی جوہری تبدیلی واقع ہوئی ہے اور نہ ہونے والی ہے۔ افکار تازہ کا استقبال اسی طرح ہوتا رہے گا۔ کبھی جمود کی دیوار سے سر ٹکرانا ہوگا اور کبھی جہالت وغفلت کی آندھیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امیر المومنین علیؑ یاد آتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا تھا:

الناس اعداء ما جھلوا [۲]

انسان جس چیز سے جاہل ہوتے ہیں اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔

یہ ان کا تجربہ بھی تھا اور انسان کی شناخت بھی۔ انسان کو پہلے مرحلے میں ہر چیز کی کھال ہی دکھائی دیتی ہے۔ کھال کے اندر کیا ہے اور کیسا ہے، یہ جاننے کی نوبت بعد میں آتی ہے۔ حاضر و موجود اور ظاہر و باہر پر نگاہوں کے ٹک جانے اور ٹھہر جانے کی شکایت تو رہے گی لیکن یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے۔ اکثر یہ عمل سست رفتار ہوتا ہے۔ کبھی برعکس سفر بھی شروع ہو جاتا ہے لیکن پھر کوئی جنبش واقع ہوتی ہے، اچانک ایک ابھار آتا ہے تو تنزل کی تلافی کر کے انسانی فکر کو کچھ آگے لے جاتا ہے۔ طاقتور دماغ کے ساتھ جب طاقتور روح ظہور کرتی ہے تو انسانی معاشرہ اور انسانی فکر ضرور ایک مرحلۂ بالا تک پرواز کرتی ہے۔ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ صدیوں بعد کسی انسان کی فکر کا پودا پھوٹ پڑتا ہے۔ بیج ضرور ڈالنا چاہیے۔ اپنے حصے کا چراغ ضرور جلانا چاہیے۔ نتیجہ کیا نکلتا ہے، یہ ہمارے ذمے نہیں۔

---

۱) بانگِ درا، نظم: پھول

۲) نہج البلاغہ، حصہ سوم، کلمہ: ۱۷۲

باب دوم

٭٭٭٭٭٭٭

مذہب شناسی کی مشکلات

۲۔۱۔دینی تعلیم کی کلیات اوراس کی ترجمانی

۲۔۱۔۱۔اخلاق اور مادی کائنات

دوصدیوں سے زیادہ عرصہ انسان کوصرف عنصر مادی اور جہان کوصرف عالم مادی قرار دے کر مغرب کے اہل فلسفہ اوراہل سیاست نے انسانی معاشرے کو چلانے کی کوشش کی۔اس حوالے سے سوویت یونین کے اہل حل وعقد تو بہت ہی آگے نکل گئے لیکن قدم قدم پر مشکل اور ناکامی نے انھیں مجبور کردیا کہ وہ تسلیم کریں کہ انفرادی اور معاشرتی سطح پر کچھ''اخلاقی اصول''ناگزیر ہیں۔ یہاں تک کہ ماحولیات کے ماہرین بھی اب فساد عالم کے آخری مرحلے کو روکنے کے لیے ''Ethics'' کی دہائی دے رہے ہیں۔تاہم''اخلاقیات'' کے ناگزیر لیکن بے جان اصول بھی کچھ نہیں کر پارہے ہیں اور''ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ''[۱] کی سچائی کے آثار اس زمین کے افق پر دکھائی دے رہے ہیں۔اس کے لیے''اخلاقیات''ضروری ہیں لیکن کیا''مادی انسان''اور''مادی کائنات'' کے لیے؟۔

۲۔۱۔۲۔مادی انسان کے لیے روحانی نسخہ

مسئلہ دراصل انسان کا اور کائنات کی حقیقی شناخت کا ہے۔اگر انسان صرف مادی ہے تو اس کے لئے اخلاقیات کے نام پر''روحانی علاج'' چہ معنی دارد؟ سب سے پہلے یہ تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ انسان کو محض مادی سمجھ کر غلطی کی گئی ہے۔ یہ انسان بقول اقبال اس دنیا میں روح کے مادی ظہور سے عبارت ہے۔اسی طرح کائنات کی مادی تعبیر ترک کر کے ایک روحانی تعبیر کی ضرورت درپیش ہے۔مکتب انبیاء درحقیقت انسان اور کائنات کی روحانی تعبیر کا پرچم بردار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکتب انبیاء کا سکھایا ہوا اخلاق تیز رفتار اور ہمہ گیر تبدیلیاں پیدا کردیتا ہے مثلاً شراب

۱) روم۔۴۱

کی ممانعت کا قانون مشرق و مغرب میں ہر جگہ حکومتوں اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کا منہ چڑا رہا ہے۔ جبکہ پیغمبر اسلامؐ نے شراب کی حرمت کا اعلان کیا تو شہر مدینہ کی گلیوں میں شراب انڈیل دی گئی۔ لہٰذا ہمارا دعویٰ ہے اور یہ دعویٰ انسان کی جامع شناخت اور تاریخ عالم کی شہادتوں کی بنیاد پر ہے کہ مکتب انبیاء کی پیروی ہی میں نوع انساں کی نجات ہے۔ مکتب انبیاء اس لحاظ سے انتہائی جامع ہے کہ یہ تصور کائنات سے شروع ہو کر انسان کی انفرادی زندگی تک کے لیے اصولی رہنمائی مہیا کرتا ہے۔

۲۔۱۔۳۔ اسلام کے اخلاقی اصولوں کی بنیاد

ایسی رہنمائی جو عقل وفطرت کی تائید کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور انسان اور انسانی معاشرے کو کمال کے راستے پر گامزن کر دیتی ہے۔ دین کے عقائد اس کے تصور کائنات ہی سے پھوٹتے ہیں۔ اس کائنات کا ایک خالق و مالک ہے جس نے اپنے علم وقدرت، ارادے اور شعور سے اسے پیدا کیا ہے۔ وہ اس ہستی کو وجود میں لانے اور اس کا نظام چلانے میں کسی کا محتاج نہیں۔ انسان کو اس نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ لہٰذا انسان کو اپنے سے پست تر کے لیے اپنے آپ کو قربان نہیں کرنا چاہیے، جبکہ یہ فاعل مختار بھی ہے۔ اسی اصول سے اسلام کے اخلاقی اصول جنم لیتے ہیں۔ انسان چونکہ حامل روح ہے اور روح موت سے ہمکنار نہیں ہو سکتی کیونکہ ''نَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ''[۱] کے مصداق خالق نے اپنی روح اس میں پھونکی ہے لہٰذا جسم کی موت خاتمہء حیات نہیں۔ یہیں سے قیامت اور جنت وجہنم کا عقیدہ ناگزیر قرار پاتا ہے۔

گویا دین عقائد واحکام کا ایک ہمہ گیر مجموعہ ہے۔ احکام جن میں احکام اخلاق بھی شامل ہیں اور سموئے ہوئے بھی، ان میں انسان کے انسان سے روابط کے لیے بھی اصول وضع کر دیے گئے ہیں۔ پھر یہ سب احکام عدل وانصاف اور اعتدال وتوازن برپا کرنے میں مددگار ہیں۔ یہاں یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ دین کی ترجمانی کرنے والے بہت سے ''مخلصین'' نے دین ہی کو مخمصہ بنا کر رکھ دیا ہے اور مذہب کے انتہائی محدود تصور نے اسے سلجھاؤ کے بجائے الجھاؤ کا نمونہ بنا دیا

۱) الحجر ۲۹، ص۔ ۷۲

ہے۔ بعض نے عبارات کی مشکل آفرینی اور عصری زبان سے نا آشنائی کے سبب سے اسے پر پیچ بنا کر رکھ کر دیا ہے جبکہ اسے مشکل کشا اور گرہ کشا ہونا چاہیے تھا۔ ایسے میں جو افراد مذکورہ بالا عالمی صورتحال، نوع انسانی کی حقیقت وضروریات اور زبان وبیان کے عصری تقاضوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے پیامبری کا کام انجام دے رہے ہیں، وہ لائق صد تحسین وتقلید ہیں۔

۲۔۲۔مذہب ایک مشکل ہے یا مشکل کا حل

۲۔۲۔۱۔یہ سوال نیا نہیں

یہ سوال اب کوئی نیا نہیں رہا کہ مذہب ایک مشکل ہے یا مشکل کا حل۔اشتراکی فکر کا آغاز اسی نظریے سے ہوا کہ مذہب انسانی ترقی میں حائل ہے۔مذہب ایک افیون ہے، مذہب کو ترک کیے بغیر تنزل یافتہ معاشرہ ارتقا پذیر نہیں ہوسکتا۔اشتراکیت نے مذہب کے خلاف بڑی جنگ لڑی، یہاں تک کہ آدھی دنیا کو فکری طور پر ہی نہیں عملی طور پر بھی تسخیر کرلیا۔

دوسری طرف اشتراکیت کی جنگ سرمایہ داری نظام کے خلاف تھی جسے وہ مظلوموں اور مزدوروں کا خون چوسنے والا نظام قرار دیتی تھی یا دیتی ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ سرمایہ داری نظام کی بنیاد مغرب میں صنعتی انقلاب پر پڑی جب کہ صنعتی انقلاب کلیسا کے خلاف اہل مغرب کی بغاوت کا نتیجہ تھا۔گویا سرمایہ داری نظام کی بنیاد بھی مذہب سے بغاوت پر استوار ہوئی تھی۔یہ وہی بغاوت تھی جس نے مغربی تہذیب کی بنیاد رکھی۔اس تہذیب کی کائنات اور انسان کے بارے میں شناخت کے پیچھے کلیسا سے بغاوت کی روح ہی کارفرما تھی۔اس تفکر کو سیکولرزم کا نام دیا گیا۔کلیسا سے بغاوت کی وجوہ میں پھر استبداد اور جمود ہی کارفرما تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ داری نظام ہو جو مغربی تہذیب کے مظہر کے طور پر سامنے آیا یا اشتراکی نظریہ اقتصاد و حیات، دونوں نے مذہب کو جمود کا سبب قرار دے کر ہی اسے ٹھکرا دیا تھا۔البتہ مغربی سیاسی فکر نے مذہب کے خلاف جنگ کو جاری رکھنے کے بجائے اسے ایک راستہ دے دیا اور کہا کہ مذہب ایک پرائیویٹ معاملے کی حیثیت سے رہ سکتا ہے، ہماری اس سے کوئی جنگ نہیں، وہ ہم سے سروکار نہ رکھے، ہم اس سے سروکار نہیں رکھتے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر سرمایہ داروں اور سرمایہ داری نظام نے مذہب کی سرپرستی اور کفالت شروع کردی۔اس طرح انھیں اپنے

دور کے بلعم باعور بھی مل گئے۔انھوں نے عالمی اور مقامی سیاست میں مذہب کو حسب ضرورت اور حسب ذائقہ استعمال کرنا شروع کردیا، جب کہ اشتراکیت نے اس سے بلاواسطہ جنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ داری نظام نے عالمی سطح پر مذہب کو اشتراکیت کے خلاف منظم کرنا شروع کیا اور آخر کار اسے اشتراکیت کے سامنے لاکر کھڑا کردیا۔

۲۔۲۔۲۔اشتراکیت کی خواہ مخواہ کی جنگ

اشتراکیت کی اصل جنگ تو سرمایہ داری نظام کے خلاف تھی، وہ مذہب کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کر کے کوئی گریز کا ایسا راستہ اختیار کرسکتی تھی جس سے اس کا ڈائریکٹ معرکہ مذہب سے نہ ہوتا بلکہ ایک اس سے بھی بہتر راستہ ہوسکتا تھا۔بعض مذہبی راہنماؤں نے اس کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن مذہب سے آویزش کے لیے اشتراکیت نے وہی طریقہ اختیار کیا جو خودشدت پسند مذہبیوں کا رہا ہے۔پھر اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا سو نکلا۔دوسری طرف سرمایہ داری نظام اپنی حکمت عملی یا منافقت کی وجہ سے بظاہر بازی لے گیا اور اس نے ایک مرحلے پر اشتراکیت کو چاروں شانے چت کردیا لیکن سرمایہ داری نظام کو اپنے مفادات کے فروغ کے لیے جنگ ابھی جاری رکھنا تھی۔ ویسے بھی سرمایہ داری نظام کا دعوی یہ تھا کہ ان کی معیشت کے اندر مقابلے (Competition) کی روح کارفرما ہے جب کہ اشتراکیت کا کہنا تھا کہ اس کے نظام اقتصاد میں تعاون (Cooperation) کو ڈویلپمنٹ کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ہوا یہ کہ وہی مذہب جس کی طاقت سے سرمایہ داری نے اشتراکیت کو شکست فاش دی تھی اب اس نے اسی مذہب کے خلاف ایک نئے معرکے کا منصوبہ بنایا۔آج کی دنیا اسی معرکے سے گزر رہی ہے۔

۲۔۲۔۳۔سرمایہ داری نظام اور مذہب کا استعمال

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اشتراکیت کے خلاف فرسٹ لائن پر ''اسلام'' یا ''مسلمان مجاہد قوتیں'' رہیں۔مسیحیت ان کی سپورٹ میں تھی۔مسیحیت پیچھے سے تائید وحمایت کررہی تھی۔اسے یہودیت کی بھی تائید حاصل تھی لیکن میدان کارزار میں ''مسلم مجاہدین'' تھے۔ ویسے بھی مسیحیت نے سرمایہ داری نظام کی سرپرستی میں رہنے کا شعوری فیصلہ کرلیا تھا۔ممکن ہے کہا

جائے کہ اُس نے سرمایہ داری نظام کے ساتھ مل جل کر رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا بہر حال جو کچھ بھی تھا اسلام نے ایسا کوئی فیصلہ نہ کیا تھا اور مسلمان جن حالات میں بھی رہے ان کے سامنے ان کا ماضی سنہری دور کے طور پر باقی رہا جب دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔

سرمایہ داری نظام کو ممکن ہے اقتصادی نظام یا نظریہ اقتصاد کے طور پر پیش کیا جائے یا سمجھا جائے لیکن سرمایہ دار کا ایک ہی نظریہ ہوتا ہے اور وہ ہے سرمایہ سمیٹنا اور سرمائے کی طاقت اکٹھی کرنا۔ آج دنیا کی بیشتر دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے۔ یہ سرمایہ داری نظام کا ہی کیا دھرا ہے۔ یہ سرمایہ دار اب دولت کا ایک بڑا حصہ مذہب کو مذہب سے لڑا کر سمیٹ رہے ہیں۔ اس کے دو فائدے فوری اور بڑے ہیں، ایک تو دولت جمع ہو رہی ہے اور دوسرا مذہب بیزاری کی تحریک پروان چڑھ رہی ہے۔ مذہب کو مذہب کی تلوار سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ جسے مغربی تہذیبی لبرزم کہتی ہے اسے تقویت مل رہی ہے۔ الحاد کو مضبوط شواہد اپنی تائید میں میسر آ رہے ہیں۔ اب زیادہ آسان ہو گیا ہے کہ کہا جائے کہ مذہب انسان کے لیے مشکل آفرین ہے مشکل کشا نہیں۔

۲۔۲۔۴۔ مذہب پھر میدان میں

ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ اشتراکیت کے خلاف صف اوّل کے مجاہدین کے دماغ میں جو زعم سما گیا تھا، اس کا کچھ علاج بھی ہو رہا ہے، اسے استعمال بھی کیا جا رہا ہے۔

علاوہ ازیں بعض خطوں اور ممالک میں اشتراکیت اور سرمایہ داری نظام، دونوں کے عین عروج کے زمانے میں مذہب نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ ایک ملک میں تو **لا شرقیہ ولا غربیہ** کے نعروں کی گونج میں نئی مذہبی حکومت بھی تشکیل پا گئی تھی جو بہت سے امتحانوں سے گزر کر اب بھی قائم ہے اگرچہ ابھی اس کی آزمائشیں ختم نہیں ہوئیں۔ اس ملک کے اندر بھی ایک طبقہ ایسا ضرور موجود ہے جو "مذہبی حکومت" کو اپنے لیے مشکلات کا باعث سمجھتا ہے تاہم زیادہ تر لوگ ابھی اس حکومت کے ساتھ ہیں جس کی وجہ سے اس پس منظر میں بھی یہ سوال ابھی باقی ہے کہ مستقبل میں انسانی معاشروں کے لیے مذہب کا کیا کردار رہے گا اور وہ کس سمت میں کتنا موثر ہوگا۔

ہماری رائے میں اشتراکیت کے خلاف اگر سرمایہ داری نظام کی سپورٹ سے مذہبی قوتیں

حرکت نہ کرتیں تو نتیجہ یقیناً کچھ اور ہوتا، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مادی تصور کائنات کا سب سے بڑا مظہر اور سب سے بڑی طاقت یعنی سرمایہ داری نظام کو مذہب سے ہمدردی پیدا ہو جائے۔ اس کے مقاصد استعماری ہی تھے اور استعماری ہی رہیں گے۔ بے رحم سرمایہ داروں کی رقم اور اسلحہ سے ہونے والا جہاد مذہب کے فائدے میں تمام نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ بات تو دو جمع دو چار کی طرح واضح تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذہب کے نام پر یا دھوکا کھایا گیا ہے یا دھوکا دیا گیا ہے۔ کسی اور مقصد کو مذہب کا عنوان دے کر اپنے مفادات حاصل کیے گئے ہیں۔ اگر ہماری یہ بات درست ہے کہ بعض لوگوں نے دھوکا کھایا ہے تو ان کی مذہب شناسی اور زمانہ شناسی دونوں معرض سوال میں آتے ہیں۔ ان کی مذہب شناسی بھی ناقص ہے اور حالات حاضرہ کا فہم بھی ناقص ہے۔ وہ سرمایہ داری نظام اور اس کی حقیقتوں کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ غلطیوں اور ناسمجھیوں کے نتائج تو آخر بھگتنا پڑتے ہیں جواب تک بھگتے جا رہے ہیں۔

۲۔۲۔۵۔ مذہب کا استعمال مذہب کے خلاف

اس ساری جدوجہد اور تگ و پو میں استعماری قوتیں زیادہ واضح طور پر سمجھ گئیں کہ مسلمانوں کے ایک جنگ آزما گروہ کا تصور مذہب نہایت شدت پسندانہ ہے۔ ان کا یہی تجربہ جو پہلے القاعدہ کے عنوان سے بروئے کار آیا نئے معرکوں کے لیے داعش اور دیگر ناموں سے ظہور میں آیا۔ اب نئے شدت پسندانہ مذہبی مظاہر کو خود مسلمانوں ہی سے جنگ لڑنا تھی، البتہ اس کے لیے ضروری تھا کہ انھیں کافر، مشرک، گمراہ، منحرف وغیرہ کا عنوان دیا جائے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت یہ تمام گروہ مسلمانوں ہی سے نبرد آزما ہیں اکا دکا واقعات دیگر ملکوں میں ہوئے ہیں جو اس ہنگامۂ ہا وٗہو میں اور شدت پسندانہ رویوں کے اظہار میں ہونا ہی تھے لیکن ان گروہوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے کئی ملک بری طرح تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ اس صورت حال نے بہت سے لوگوں کو اس بات کا قائل کر لیا ہے کہ مذہب خود ایک مشکل ہے نہ کہ کسی مشکل کا حل۔

۲۔۲۔۶۔ مذہب کی حقیقت کیا ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ مسئلہ یوں نہیں اور یہ نہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے۔ اس

مقام پر بعض دانشور اصطلاحوں کے فرق کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ دین اور مذہب میں فرق ہے۔ مذہب محدود مذہبی رسوم کا نام ہے اور دین کا تصور وسیع تر ہے۔ ہماری رائے میں بات یہاں سے بھی شروع نہیں ہوتی بلکہ اس کا پہلا سرا یہ سوال ہے کہ کیا کائنات صرف مادی ہے، یہ خود بخود معرض وجود میں آگئی ہے یا اس کے پیچھے ایک زبردست ارادہ، علم، قدرت اور حکمت کارفرما ہے۔ اس سوال کا جواب اگر یہ ہے کہ خود بخود، اتفاق سے، اچانک معرض وجود میں آگئی ہے تو مذہب یا دین کی گنجائش ہی ختم ہو جاتی ہے اور اگر جواب دوسرا ہے اور وہ یہ کہ اسے کسی بڑی قدرت نے اپنے وسیع علم اور حکیمانہ ارادے سے وجود بخشا ہے تو پھر مذہب یا دین کی بنیاد میں ایک حقیقت ضرور موجود ہے۔ بات آگے بڑھتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ کائنات کے مادی پہلو کی اوٹ میں اس کا ایک روحانی پہلو بھی ہے، اس کا غیب بھی ہے اور اس کا باطن بھی ہے۔ اسی طرح ہر چیز کا ایک باطن ہے۔ انسان کا ایک مادی وجود ہے تو ایک روحانی وجود بھی ہے۔

اس کے بعد حیات بعد از موت اور معاد و قیامت کا مسئلہ شروع ہوتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو مذہب یا دین سے چھٹکارا پانے کی کوششیں بذات خود معرض سوال میں آجاتی ہیں۔ کیا یہ تمام کوششیں ایک اٹل حقیقت سے جنگ آزما ہیں یا ایک خیالی بستی کو مسمار کرنے کے درپے ہیں۔ اگر کائنات کے اس روحانی تصور کو مان لیا جائے تو پھر مذہب کے مشکل آفرین یا مشکل کشا ہونے کی بحث کا رخ ہی کسی اور طرف ہو جاتا ہے۔ جب تک دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو کائنات کے باطن وغیب اور اس کے روحانی پہلو کو ایک حقیقت کے طور پر مانتے ہیں اور اس پر ایسا یقین رکھتے ہیں جس کے لیے ''ایمان'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اور جسے جنگ کے ذریعے ختم نہیں کیا جاسکتا تو دیکھنا پڑے گا کہ مذہب یا دین کے خلاف جاری جنگ اصل میں کس سے ہے۔

خارج میں دیکھا جائے تو مذہب یا دین کو ماننے والے تمام لوگ ایک جیسے نہیں ہیں۔ انسانی معاشرے پر ان کی تاثیر بھی ایک جیسی نہیں۔ اگر مذہب کا ایک تصور قتل و غارت، مار دھاڑ، تکفیر و تفسیق سے عبارت ہے تو دوسرا تصور انسان دوستی، خیر و صلاح، رحمدلی اور اعلیٰ انسانی اوصاف و اخلاق سے عبارت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذہب کا ایک تصور مشکلات ایجاد کرتا ہے تو دوسرا

مشکلات کو حل کرنے میں مددگار ہے۔

بات کچھ تفصیلی ہے جس کی اس مضمون میں گنجائش نہیں، اختصار سے ہم یہ کہتے ہیں کہ **حقیقت دین کائنات اور انسان کی جامع شناخت سے عبارت ہے**۔ یہ شناخت دین کو آفاقی اقدار کا حامل بنا دیتی ہے اور تمام بندوں کو عیال اللہ قرار دیتی ہے۔ اللہ کو رحمن و رحیم مانتے ہوئے انسانیت کے لیے بھی پیام رحمت کی حامل ہے۔ افسوس زیادہ تر مذہبی پیشوا معرفت کے اس درجے سے محروم ہیں، ان کی اپنی شناخت، عزت اور وسائل کا انحصار مذہب کے محدود تصور سے وابستہ ہے، اس لیے وہ ایک کمزور ارادے اور روح کے حامل ہیں اور دین کو اس کی وسعت و آفاقیت کے ساتھ دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے وقتی مفادات کے لیے کسی بھی بڑی طاقت کا آلہ کار بن جاتے ہیں یا پھر اپنے اقتدار یا مادی مفادات کے حصول کے لیے مذہب کے محدود تصور ہی پر انحصار کرتے ہیں جو ان کی نظر میں عوام پسند ہوتا ہے نہ کہ خدا پسند۔ یہی مذہب انسانی معاشرے کے لیے مشکلات کا باعث بنتا ہے جب کہ کائنات کی حقیقت کا سراغ دینے والا دین انسان کو حرص و آز سے آزاد کر کے، فتنہ و فساد سے بھی آزاد کر دیتا ہے اور بندوں کو آپس میں جوڑ دیتا ہے۔ دین کا یہی تصور انسان کے لیے مشکل کشا ہے۔ وہ بے رحم سرمایہ داروں سے بھی انسانیت کو آزادی کا پیغام دیتا ہے اور فتنہ پرور و خود غرض مذہبی پیشوائیت سے بھی۔

۲۔۳۔ ہر مسئلے پر قدیم مذہبی سند کی ضرورت کیوں ہے؟

۲۔۳۔۱۔ سماجی مسائل میں رسول اللہؐ کی سیرت

ہمارے ہاں یہ رویہ بن گیا ہے کہ ہر مسئلے پر قدیم مذہبی سند دریافت کی جاتی ہے۔ کیا واقعی ہر مسئلے پر ایسی سند کی ضرورت ہوتی ہے اور کیا واقعی انسانی معاشرے کی متنوع پیش رفت کے باوجود دور ماضی سے ایسی قابل اعتماد اسناد مل بھی سکتی ہیں؟ اگر ہم خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں دیکھیں تو کیا آپؐ نے ہر مسئلے پر مذہبی روایت اور سند کی بنیاد پر ہر کام کیا ہے یا نہیں۔

یہ سوال ہمیں اس امر کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ سماجی مسائل کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ کی سنت اور سیرت کیا ہے۔ کیا آپ نے ہر قدیم روایت کو دھتکار دیا اور ہر معاملے میں نئی روایت کی بنیاد رکھی؟ اگر آپ نے کسی قدیم روایت کو باقی رکھا تو کیا اس کے لیے آپ کے سامنے آسمانی سند تھی یا عقل وفطرت کو ہی کافی سمجھا اور دین کے آفاقی افکار ونظریات کی روشنی میں معاملات کو دیکھا اور اپنے دور کے حالات اور تقاضوں کے مطابق سماجی مسائل کے بارے میں ایک طرز عمل اختیار کیا یا آپ نے صحابہ کرامؓ کی تربیت اس نہج پر کی تھی کہ وہ کوئی کام کسی مذہبی سند کے بغیر انجام نہ دیں؟ سیرت درحقیقت روش عمل کو کہتے ہیں۔ روش عمل کی تلاش ہمیں آخر کار کسی اصول تک پہنچاتی ہے۔ واقعات کے بارے میں کسی کا طرز عمل اس کے کلی نظریے اور فکر کی بنیاد پر جنم لیتا ہے۔ اسی میں سے ہم نے سنت کو تلاش کرنا ہے۔ ایسی تلاش پھر ہمیں اصولوں تک پہنچائے گی اور زندگی کے تمام امور پھر ہم اصولوں ہی کی بنیاد پر طے کریں گے۔ ہمارا مطالعہ ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے معاشرے میں جاری امور میں سے صرف ایسے امور کی نفی کی یا ان کی جزوی اصلاح کی جو آپ کی تعلیمات کے منافی تھے باقی امور کو ان کے حال پر رہنے دیا۔

۲۔ ۳۔ ۲۔ کیا سالگرہ پر کیک کاٹنا سنت ہے؟

ہمارے ایک دوست نے سالگرہ کی کسی تقریب میں اپنی شرکت کی مناسبت سے تصاویر کو سوشل میڈیا کے حوالے کردیا، اس میں کیک بھی موجود تھا۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ کیا سالگرہ کے موقع پر کیک کاٹنا سنت ہے یا بدعت؟

یہ سوال دراصل اسی رویے کا مظہر ہے جس کے مطابق ہمارے ہاں کا ایک بڑا طبقہ ہر معاملے میں قدیم مذہبی سند کو تلاش کرتا ہے یا دریافت کرتا ہے، یا مولوی صاحبان کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان سے سند طلب کرتا ہے۔

سالگرہ منانا، اس موقع پر چراغاں کرنا، غبارے ٹانکنا اور کیک کاٹنا ان سب چیزوں کو ہم کیونکر ماضی میں تلاش کر سکتے ہیں۔ ہم ماضی سے جس روز کمپیوٹر، کار، ہوائی جہاز، موبائل فون اور خلائی راکٹ ڈھونڈ لائیں گے، اس روز کیک بھی ہمیں مل جائے گا۔ ورنہ کیک سمیت سائنسی ترقی کے تمام مظاہر بدعت قرار پا جائیں گے۔

۲۔ ۳۔ ۳۔ یہ تلاش تو خود بدعت ہے

حقیقت یہ ہے کہ ایسے امور کے لیے مذہبی سند کو تلاش کرنا پہلی بدعت ہے۔ کیوں کہ جن امور پر دین نے کوئی قدغن نہیں لگائی ان کے لیے دینی سند تلاش کرکے ان کو دینی اور مذہبی لباس پہنانا بذات خود بدعت ہے۔ شاید یہ بدعت کسی بھی اور بدعت سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ بدعتی طرز عمل پر مشتمل طریق کار انسان کو سنت تک نہیں پہنچا سکتا۔

اگر لباس وہی رکھنا ہے جو پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں تھا اور کھانے کا طریقہ بھی وہی رکھنا ہے جو پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کا تھا، تو پھر سواری بھی وہی رکھیں جو پیغمبر اکرم کے زمانے کی تھی، گھر بھی ویسا ہی رکھیں، زبان بھی وہی بولیں جو پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کی تھی۔ راستے بھی ویسے ہی رہنے دیں جیسے پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے تھے، اسلحہ بھی ویسا ہی تیار کریں جیسا پیغمبر اکرمؐ استعمال کرتے تھے۔ ہر چیز بدل گئی ان میں سے کسی چیز کو اب بدعت نہیں سمجھا جاتا تو پھر تمام امور کے لیے آپ کو ایک جیسے اصول کی بنیاد پر فیصلہ کرنا پڑے گا۔

۲۔۳۔۴۔کیا بدلتا ہے کیا نہیں؟

تہذیبیں اور ان کے مظاہر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ہمیں دیکھنا ہے کہ کون سی چیز وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے اور کون سی نہیں بدلتی۔کس چیز کو بدلنا چاہیے اور کس چیز کو نہیں بدلنا چاہیے۔

ہمارے ہاں علماء یہ کہتے رہے ہیں کہ تمام انبیاء کا دین ایک تھا۔انبیاء کے بدلنے سے دین نہیں بدلا البتہ شریعتیں تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ہمیں اس مسئلے کو سمجھنا ہے کہ کون سی چیزیں نہیں بدلتی رہیں اور کون سی چیزیں بدل گئی ہیں اور کس چیز کے بدلنے سے دین نہیں بدلتا۔

کائنات کی معرفت کے بنیادی اصول، ایمان بالغیب، توحید، انسان کی کرامت نفس، انسان کا فاعل مختار ہونا، معاد اور پھر عقل وخرد اور آزادی کے پیمانے پر انسان کی مسئولیت یہ وہ باتیں ہیں جو نہیں بدل سکتیں۔انھیں آپ انبیاء کے پیش کردہ عقائد کی بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔اسی طرح سے اخلاقیات، اس کے بنیادی مظاہر اور انسانوں کے باہمی حقوق کا احترام، یہ وہ تعلیمات ہیں جو انبیاء کی مشترکہ میراث ہیں۔

قرآن حکیم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک عمومی اصطلاح استعمال کی ہے۔خیر و شر کا تصور انسان کی فطرت سے پھوٹتا ہے اور انسانی سوسائٹی کی حفاظت اسی تصور کی قانونی اور عملی شکل میں پنہاں ہے لیکن قانون کی روح یہ ہے کہ وہ سب کے لیے مساوی ہو اور سب پر مساوی حیثیت سے نافذ بھی ہو۔قانون میں البتہ حسب ضرورت تبدیلی کی گنجائش موجود رہتی ہے۔

''معروف'' انہی معتقدات اور سماجی اصولوں کو قرار دیا جا سکتا ہے۔عرف جسے خیر کہے اس کی حفاظت کی جانا چاہیے۔اسی طرح سے جو چیز انسانی سوسائٹی کے لیے ناگوار اور ضرر رساں ہو وہی منکر ہے، اس کی عملی شکل پر بحث موجود ہے اور اہل حل وعقد ہر دور میں اور ہر مقام پر اس کے لیے غور وفکر کر سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے اصولیین نے عرف اور مصلحت کو سماجی مسائل کے حل کے لیے اصول کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔

۲۔۳۔۵۔ہر مسئلے پر سند تلاش کرنے کا نتیجہ

اصولوں سے تجاوز کر کے ہر مسئلے کے لیے ماضی کی مقدس سند کو تلاش کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ

معاشرے سے آہستہ آہستہ مذہب پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ شدت پسندی مذہب کی پہچان بنتی چلی گئی۔ معاشرے کے اجتماعی ردعمل نے اسے محدود سے محدود تر کرنے کا کردار جاری رکھا۔ مغرب میں مسیحی قیادت کا تنزل اس کے لیے ایک چشم کشا نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔

مختلف انداز سے یہ آویزش اب بھی جاری ہے حالانکہ دین کی آفاقی تعلیمات انسان کی روح سے پھوٹتی ہیں، انسان کے اجتماعی اور انفرادی تقاضوں کی تکمیل کرتی ہیں، انسانی خرد کے سوالوں کا جواب دیتی ہیں اور فکر ونظر کو جامعیت کے ساتھ ارتقاء کی طرف لے جاتی ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو پھر شدت پسندی دونوں طرف سے ختم ہو جائے۔ آج مذہب کی طرف سے بھی شدت پسندی ہے اور اس کی مخالفت میں بھی شدت پسندی ہے۔

سائنس کا مادی قانون انسان کے فکری رویوں سے بھی مطابقت رکھتا ہے، کہ عمل اور ردعمل برابر اور مخالف سمت میں ہوتے ہیں۔ آج دونوں طرف ردعمل ہی ردعمل دکھائی دیتا ہے لہٰذا شدت ہی شدت کا دور دورہ ہے۔ جو لوگ کائنات کی مادی تعبیر پر اصرار کرتے ہیں ان سے پہلے ان لوگوں کو اپنے طرز عمل اور فکری رویوں کا جائزہ لینا ہے جو کائنات کی روحانی تعبیر پر یقین رکھتے ہیں۔

۲۔۳۔۶۔فطرت کا اصول

ہمیں مان لینا چاہیے کہ ہر بات کے لیے ماضی سے سند نہیں لائی جا سکتی کیونکہ ہر بات کسی پرانی اور کہنہ بات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔ انسان نو آوری اور تجدد کے سہارے سے آگے بڑھتا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ ہر بات کے لیے ماضی سے کوئی مثال مل سکے۔ ماضی سے اصول مل سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ مثال بھی مل سکے۔ اصول اس لیے مل سکتا ہے کہ انسان کی فطرت پہلے دن سے ایک ہی ہے، وہی فطرت جو اللہ کی فطرت ہے اور تبدیل ہونے والی نہیں۔ فطرت کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے اس پر ایک الگ بحث کی ضرورت ہے جب کہ ہم یہاں پر فطرت کے اس مفہوم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس کا قرآن حکیم میں ذکر ہے اور جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی فطرت وہ ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے اور یہ وہ خلقت ہے جو تبدیل نہیں ہوتی کیونکہ یہ

اللہ کی خلقت ہے، یہی مضبوط اور پائیدار دین ہے جو فطرت کے اصولوں پر استوار ہے لیکن انسانوں کی اکثریت جانتی نہیں جیسا کہ قرآن کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ O

یہ وہ بات ہے جو انسانوں کی اکثریت آج بھی نہیں جانتی اور ان انسانوں میں بہت سے مذہبی انسان بھی ہیں جو دین کے فطری تصور سے ناآشنا ہیں۔ ماضی میں جب پیغمبر اکرمؐ سے سند نہیں ملتی تو سند کو ماضی سے ہی تلاش کرنے والا حقائق یا سانحات کی روشنی میں مقدس قرار پا جانے والے افراد کی باتوں کا سہارا لیتا ہے۔ لہٰذا فلاں بزرگ نے فرمایا، فلاں عالم نے فرمایا اور ہمارے اکابر کا یہ نظریہ ہے اور ہمارے بزرگوں نے یہ کہا ہے، کی بنیاد پر سندیں بناتا اور گھڑتا چلا جاتا ہے اور انسان کی فکری کاوشوں کو وہی درجہ دے دیتا ہے جو اللہ کے اس پیغمبر کو حاصل ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی O اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی O

۲۔۳۔۷۔ اکابر کی کہی باتیں

کیا پیغمبر اکرمؐ کے علاوہ بھی کسی کے لیے یہ آیت اتری ہے؟ اگر نہیں اتری تو ''ہمارے اکابر یا اسلاف'' کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں، ان کی کہی ہوئی بات ان کا فہم ہے جس میں کمی بیشی کی گنجائش موجود ہے۔ جب کوئی سند ماضی سے نہیں ملتی تو ہر نئی بات کو بدعت کہنے والا مذہبی ذہن ہر نئی بات کو حرام کہنے لگتا ہے اور نوجوان نسل کو ہر نئی چیز سے منع کرتا ہے اور روکتا ہے۔

استاد مطہری نے ایک مقام پر کہا ہے کہ کسی مولوی کو جب نوجوان دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ مسٹر بریک (Mr. Break) ہے۔ یعنی ہر بات سے روکتا ہے اور ہر کام پر بریک لگانے کا حکم دیتا ہے۔ آج کا نوجوان پھر ایسے لوگوں کی تلاش کرتا ہے جو یہ کہتے ہوں:

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

۲۔۳۔۸۔پھر عقل کس لیے ہے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہر بات کو ماضی سے جوڑنا ہے تو پھر عقل کس چیز کے لیے ہے۔ اگر زندگی کے تمام امور نوجوان نسل نے مسٹر بریک کے حوالے کرنا ہیں تو ہر شخص اپنی عقل کو کسی ڈبے میں بند کر کے غیروں کو دے دے۔

پہلے ہی ہمارے حکمرانوں اور جن کے ہاتھ میں ہمارے معاشروں کی باگ ڈور ہے انھوں نے کچھ ایسا ہی کر رکھا ہے۔ وہ اپنی قسمت کے فیصلے خود کرنے کے بجائے اغیار کی طرف دیکھتے ہیں اور ان کی چشم و ابرو کے اشارے پر سارے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ سوچنے سمجھنے کا کام ہم نے دوسروں کے سپرد کر رکھا ہے۔ اسی لیے ایک طبقے کے لیے ایک لطیفہ بنا ہے جو ہمارے ایسے تمام طبقوں پر فٹ آتا ہے کہ کسی نمائش میں مختلف طرح کے دماغ رکھے گئے تھے، بعض دماغ ساٹھ فیصد استعمال ہوئے تھے، بعض پچاس فیصد اور بعض بالکل استعمال نہیں ہوئے تھے، وہ دماغ سب سے مہنگے بک گئے جو بالکل استعمال نہیں ہوئے تھے کیونکہ ان کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ان ٹچ (Untouch) ہیں۔

۲۔۳۔۹۔کافروں سے مشابہت

اس بحث میں ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض چیزوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تشبہ بالکفار یعنی کافروں کے طرزِ عمل سے مشابہ ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر کام کافرانہ ہے تو پھر نہیں کرنا چاہیے لیکن اگر کام کافرانہ نہیں ہے تو پھر اس میں کوئی قباحت نہیں۔ آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ایک کافر کا کام بحیثیت کافر ہے یا بحیثیت انسان۔ بحیثیت کافر ہے تو کافرانہ ہے، اگر بحیثیت انسان ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے عقل وفطرت کسی ایک طبقے کے لیے نہیں رکھی، یہ خزانے اس کے پاس فراواں ہیں اور انھیں بانٹنے کے لیے اس نے کسی تنگ دل اور کم ظرف سے کوئی مشورہ نہیں کیا۔

کافر جو چیزیں استعمال کرتے ہیں اور جو بناتے ہیں ان میں سے بہت ساری ہم سارا دن استعمال کر رہے ہوتے ہیں، ان کی بنائی ہوئی چیزیں ہم کھا رہے ہوتے ہیں، پہن رہے ہوتے ہیں اور چلا رہے ہوتے ہیں۔ غیر مسلموں کی ایجادات ہم استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ موبائل فون

کافروں نے بنایا ہے، ہوائی جہاز انہی نے بنایا ہے، ریڈیو، ٹی وی اور کمپیوٹر انہی کی ایجاد ہے، لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان سب کا استعمال تشبہ بالکفار کی زد میں آتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں تو بہت سے مولوی صاحبان نے لاؤڈ سپیکر کی ایجاد پر اسے کافروں کی ایجاد قرار دیا اور اس کے استعمال کو حرام جانا۔ خاص طور پر اذان، نماز اور جمعہ کے خطبے کے لیے اسے حرام قرار دیا۔ آج اس کے بے ہنگم استعمال نے خلق خدا کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی چیز اسلام کے خلاف ہے، اسلامی اقدار کے خلاف ہے اور انسانیت کے لیے نقصان دہ ہے تو پھر اسے استعمال نہ کریں لیکن اگر ایک ایسی انسانی ایجاد ہے اور بشری دریافت ہے یا تخلیق ہے جو انسان کے مفاد میں ہے تو پھر اسے استعمال کرنے میں کیا قباحت ہے۔

ہمیں اصولوں تک پہنچنا ہے اور اصولوں کو پھر اپنی مرضی کے امور پر لاگو نہیں کرنا بلکہ تمام امور پر لاگو کرنا ہے۔ انسانی علوم، فزیکل سائنسز اور نیچرل سائنسز میں مغرب نے بے پناہ ترقی کی ہے اور ہم سب ان کی ایجادات سے استفادہ کر رہے ہیں۔ کیا ان کے استعمال کے لیے ماضی سے کوئی مقدس سند مل سکتی ہے؟ اس مسئلے کو اب ہمیں ہمیشہ کے لیے حل کرنا چاہیے تا کہ ہمارا معاشرہ آگے بڑھ سکے، ہماری سوسائٹی زوال سے نکل سکے۔

۲۔۳۔۱۰۔ جمود کا نقصان خود ہمیں ہوا ہے

ہماری بڑی مشکل یہ ہے کہ ایسے رویے سے نقصان خود مسلمان معاشروں کو ہوا ہے اور خود ہمارے علماء کو ہوا ہے یعنی وہ علماء جو ان چیزوں کی ممانعت کرتے ہیں اور اس کے لیے کوئی انسانی قانع کنندہ دلیل پیش نہیں کرتے تو جوان نسل ان سے دور ہوتی چلی جاتی ہے، ان کا کردار معاشرے میں کم سے کم ہوتا چلا جا رہا ہے، ان کی توقیر اور احترام گھٹتا چلا جا رہا ہے۔ اگر اس طرز عمل کو معاشرہ قبول کر لے تو پھر یہ معاشرہ بھی مزید پیچھے کی طرف چلا جائے گا۔ ہمیں تو اپنی نوجوان نسل کو یہ جذبہ دینا چاہیے کہ ایک چیز مغرب نے بنائی ہے تو ایک چیز ہم بھی بنا کر اسے دکھائیں۔

اگر آپ اس طرح کی فکر اور جذبہ قوم کے اندر پھونک دیں تو پھر دیکھیں کہ وہ کیا معجزات کر کے دکھاتی ہے۔ اسی طرح ہم دیگر اقوام کی غلامی سے بھی آزاد ہو سکتے ہیں۔

۲۔۴۔کیا کھجور کھانا سنت ہے؟

۲۔۴۔۱۔ثواب کی نیت سے کتنی کھجوریں کھائیں؟

ہمارے ہاں مشہور ہے کہ کھجور کھانا سنت ہے۔اس بات کو ایک مسلّمہ کی حیثیت حاصل ہے۔ کھجوریں بیچنے والے ریڑھی بانوں نے بھی اپنی ریڑھیوں پر لکھ کر لگایا ہوتا ہے کہ کھجور کھانا سنت ہے۔ہم نے جب سے ہوش سنبھالا یہی سنا ہے۔لہٰذا ہم ثواب کی نیت سے خدا جانے کتنی کھجوریں کھا چکے ہیں۔ایک بہت بڑے اور نامور بزرگ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ لکھتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ بے دھیانی میں کھجوریں کھاتے جاتے تھے، یہاں تک کہ ان کا پیٹ خراب ہو گیا اور آخر اس بیماریٔ شکم نے ان کا کام تمام کیا اور ہمیں ان کے مزید علمی جواہر پاروں سے محروم کر دیا۔

ہمیں کچھ ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ بعض کھجوروں کو بعض کھجوروں پر فضیلت حاصل ہے۔ پھر ہم زیادہ فضیلت والی کھجوروں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔بعد میں یہ راز بھی کھلا کہ کھجوروں میں تو بہت سی بیماریوں کا علاج بھی ہے کیونکہ حکیموں اور طبیبوں نے ان سے طرح طرح کی دوائیاں بنانا شروع کر دیں۔بعض نے فضیلت والی کھجوروں کی گٹھلیوں سے بھی کام لینا شروع کر دیا۔

اس سلسلے میں ایک نیا محاورہ بنایا جا سکتا ہے کہ ’’کھجور تو کھجور، گٹھلیوں میں بھی نور‘‘ یہ محاورہ ہم نے ’’آم کے آم، گٹھلیوں کے دام‘‘ کے مقابلے میں حصولِ ثواب کی غرض سے بنایا ہے۔

ان دنوں ایک پیسٹ کے اشتہار چل رہے ہیں جس کی فضیلتیں بیان کرنے کے لیے حکیم، طبیب، علماء اور مبلغین سب شریک ہیں۔ ویسے تو کھجور اور اس کی گٹھلیوں سے تیار کردہ یہ پیسٹ بہت سی بیماریوں کے علاج کے لیے مفید بتایا جاتا ہے البتہ ہوش ربا موٹاپے کو ختم کرنے کے لیے اس کی تاثیر حیران کن محسوس ہوتی ہے۔ ’’طب نبوی‘‘ کے نام پر ہزاروں روپے کا یہ پیسٹ کہا جاتا ہے کہ کسی دوکان پر نہیں بلکہ خود حکیم صاحب کے مکان پر دستیاب ہے۔

۲۔۴۔۲۔موٹی خاتون کہنے لگی۔۔۔

اس سے ہمیں یاد آیا کہ ہمارے ایک دوست جو ڈاکٹر تھے، کہنے لگے، کہ ایک روز ایک بہت موٹی خاتون ہمارے کلینک میں تشریف لائیں، انھوں نے مشکل سے اپنی مشکل بیان کرتے ہوئے کہا: ڈاکٹر صاحب! میں کیا کھاؤں کہ پتلی ہو جاؤں؟

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میں نے محترمہ سے کہا: بی بی! آپ پہلے ہی کھا کھا کر موٹی ہو گئی ہیں اور اب پوچھ رہی ہیں کہ کیا کھاؤں کہ پتلی ہو جاؤں؟

البتہ ہم امید کرتے ہیں کہ کھجوروں سے تیار کی گئی تمام ادویات موٹاپے سمیت ہر بیماری کے لیے تیر بہ ہدف ثابت ہوں گی۔

۲۔۴۔۳۔ذخیرہ اندوزوں کی کھجوریں

روزوں کی بہار میں روزے کھولنے اور کھلوانے کے لیے کھجور کے سنت ہونے پر روزے داروں کے علاوہ روزہ خوروں کا بھی اتفاق ہے۔جن ذخیرہ اندوزوں نے روزوں سے پہلے رنگا رنگ کھجوروں کے ڈھیر لگا رکھے تھے، ان سے زیادہ، ان کے فضائل سے کون آگاہ ہو سکتا ہے کیونکہ ان کی کھجوریں اس مبارک مہینے میں کم سے کم پانچ گنا قیمت پر بک رہی ہوتی ہیں۔کھجور کی فضیلت اتنی زیادہ ہے کہ پھلوں کے بائیکاٹ کی تین روزہ مہم کے دوران میں اسے استثناء حاصل رہا۔ بائیکاٹ مہم کے بعض دھواں دھار سپاہیوں نے بھی یہ اعلان کیا کہ کھجوروں کو ان تین دنوں میں پھلوں میں شمار نہ کیا جائے کیونکہ سنت کی برکت سے اسے خصوصی استثناء حاصل ہے۔

آپ بھی سوچتے تو ہوں گے کہ ایک مسلّمہ مسئلے پر ہم کیا طبع آزمائی کرنے لگے ہیں۔بعض لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ تو ایک سنجیدہ آدمی تھے، کھجور جیسی شیریں نعمت کے بارے میں یہ تلخ نوائی آپ کے لیے مناسب نہ تھی لیکن عزیزانِ من! تلخ نوائی سنت اور کھجور کے خلاف نہیں، ان تصورات کے بارے میں ہے جو ہمارے ہاں سنت کے نام پر رائج ہو گئے ہیں۔

۲۔۴۔۴۔ہر پھل اور سبزی کی اپنی خصوصیات ہیں

کھجور اللہ کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔اس کی خوبیوں اور کمالات سے کیسے انکار کیا جا سکتا

ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ہر پھل، سبزی اور اناج میں خاص کمالات اور خصوصیات رکھی ہیں، اسی طرح مختلف علاقوں میں مختلف موسموں اور ضرورتوں کے اعتبار سے چیزیں پیدا ہوتی ہیں لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا سنت کے نام پر لوگوں کا استیصال روا ہے؟ کیا ذخیرہ اندوزی سنت کے نام پر نعوذ باللہ جائز ہو جاتی ہے؟ کیا مذہب کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنانا بھی جائز ہے؟ اسی طرح یہ بھی سوال بڑا اہم ہے کہ کیا سنت کا وہ تصور جو کھجور کھانے کے نام سے رائج ہے، وہ درست ہے؟

ویسے تو ہماری عادت ہے کہ ہم مزاح بھی غیر سنجیدہ نہیں کرتے لیکن بات سنجیدگی کی چلی ہے تو آیئے کچھ گفتگو سنجیدگی سے بھی کیے لیتے ہیں۔ کھجوروں کے بارے میں چند صحیح روایات آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر کرتے ہیں:

۲۔۴۔۵۔روایات کا پس منظر

امام بخاری اپنی صحیح کی کتاب الزکاۃ میں ایک باب قائم کرتے ہیں کہ جہنم کی آگ سے بچو، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے یا کسی معمولی سے صدقے کے ذریعے ہو۔ چنانچہ حضرت عدیؓ بن ثابت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

اتقوا النار ولو بشق تمرۃ[۱]

جہنم کی آگ سے بچو خواہ کھجور کا ایک ٹکڑا دے کر ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ نبی کریم نماز (مغرب) سے پہلے چند تر کھجوروں سے افطار کرتے تھے اور اگر تر کھجوریں نہ ملتیں تو چند خشک کھجوروں سے اور اگر خشک کھجوریں بھی میسر نہ ہوتیں تو پانی کے چند گھونٹ پی لیتے۔ امام ترمذی نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپؐ سردیوں میں چند کھجوروں سے افطار کرتے جب کہ گرمیوں میں پانی سے[۲]، یہی حدیث دیگر کتابوں میں بھی آئی ہے۔

اسی طرح روزہ کھلوانے کے ضمن میں منقول ہے کہ جب آپؐ نے روزہ کھلوانے کی فضیلت

---

۱) صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب ۱۰، حدیث ۱۴۱۷

۲) سنن ترمذی، کتاب الصیام، باب ۱۰، حدیث ۶۹۶

بیان کی تو جو صحابہ کرامؓ مالی لحاظ سے کمزور تھے انھیں بھی اس فضیلت کے حصول کے لیے مطمئن کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ روزہ کھلوائیں چاہے ایک کھجور سے ہی کیوں نہ ہو۔

ایسی تمام روایات سے جو امور واضح ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ بعض مقامات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقے کی اہمیت کو بیان کیا اور تمام لوگوں کو اشتیاق دلانے کے لیے کھجور کو بطور مثال ذکر کیا تاکہ غریب لوگ بھی صدقے کے عمل میں شریک ہوسکیں اور غریب پروری کا شوق ہمہ گیر ہو جائے۔ یعنی ان روایات میں اصل موضوع صدقہ ہے کھجور نہیں۔

۲۔ بعض روایات میں افطار کروانے کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ یہ روایات بھی مندرجہ بالا روایات سے ہم آہنگ ہیں۔ یہاں بھی سب لوگوں کو اس کارِ خیر میں شریک کرنے کی رغبت دلانے کے لیے کھجور کو مثال کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

۳۔ ایک روایت جو سطور بالا میں ذکر کی گئی ہے کے مطابق آپ سردیوں میں چند کھجوروں سے افطار کرتے تھے جب کہ گرمیوں میں پانی سے۔ ظاہر ہے کہ کھجوروں کی تاثیر گرم ہوتی ہے آپ گرمیوں کے روزوں کی افطاری کے لیے ان سے استفادہ نہیں کرتے تھے۔ گویا کھجوروں سے افطاری بھی موضوعیت نہیں رکھتی۔ روزے کو کسی بھی مناسب غذا سے افطار کیا جاسکتا ہے اور آپؐ ایسا ہی کرتے تھے۔

> کھجور گرم علاقوں کی پیداوار ہے۔ دنیا کے بہت سے سرد ممالک میں یہ پھل پیدا نہیں ہوتا۔ سرد علاقوں کے اپنے پھل اور سبزیاں ہوتی ہیں۔ ساری انسانیت کے لیے مبعوث ہونے والا پیشوا ایسی چیزوں کو مذہبی تقاضا قرار دینے کے لیے نہیں آیا کہ جسے ہمہ گیریت حاصل نہ ہوسکتی ہو۔

۲۔۴۔۶۔ سنت کا حقیقی تصور

آپؐ کی سنت دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور روشِ حیات میں مضمر ہے۔ ہمیں آپؐ کی زندگی سے اصولِ حیات تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں رائج تصورِ سنت پر ایک مرتبہ پھر

غور وفکر کرنا چاہیے۔ انبیاء انسانوں کو خدا سے ملانے اور ان کے باہمی روابط کو عدل وانصاف کے تصور پر استوار کرنے کے لیے آتے ہیں۔ ان کا کام ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا اور انسانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے مہر ومحبت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ نبی مستضعف اور محروم انسانوں کو ظلم اور استیصال سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ انبیاء اعلیٰ اخلاقی روایات کا نمونہ ہوتے ہیں۔ وہ سچائی اور پرہیزگاری کے نقیب بن کر آتے ہیں۔ افسوس بعثت انبیاء کے اصل مقاصد سے صرف نظر کرنے سے وہی ہوا جس کی طرف علامہ اقبال نے اپنے اس معروف شعر میں اشارہ کیا ہے:

یہ اُمت روایات میں کھو گئی
حقیقت خرافات میں کھو گئی

۲۔۵۔دین فہمی جودہریت سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے

۲۔۵۔ا۔علم الکلام: ایک نقطہ نظر

کلام جدید کے حوالے سے ایک علمی نشست (جو اٹھارہ جولائی 2019 کو اسلام آباد میں منعقد ہوئی) میں ہمارے ایک دانشور دوست نے یہ نظریہ پیش کیا کہ علم کلام کی ضرورت دین کی داخلی ضرورت نہیں بلکہ یہ علم خارج سے آنے والے سوالات کے جواب کے تقاضے کے طور پر معرض وجود میں آیا۔ ان کی یہ رائے دین کے بارے میں ان کے اس فہم پر استوار تھی کہ دین تو غیب پر ایمان کا تقاضا کرتا ہے لہٰذا دین پر ایمان لانا اور اس کے احکام پر عمل کرنا ہی ایک مومن اور متقی کی ذمہ داری ہے اور حقیقی مومن دینی امور کے بارے میں سوال نہیں کرتا۔ ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ کیجیے جنھیں ہم قدرے اختصار سے پیش کررہے ہیں:

> مذہبی نظام فکر کا داخلی مسئلہ ایمان بالغیب ہے، یہ کسی علم کلام پر نہیں کھڑا۔ مذہبی نظام فکر میں جو مطلوب انسان ہے، اُسے متقی کہا جاتا ہے اور متقی ایمان بالغیب والے ہیں۔ مذہب کا داخلی نظام فکر اصلاً کسی عقلی دلیل پر نہیں کھڑا، وہ ایمان بالغیب پر کھڑا ہے اور ایمان بالغیب کے اپنے مصادر ہیں، اپنے ماخذات ہیں، اپنا اس کا انداز ہے جس کے ذریعے وہ پیدا ہوتا ہے اور انسان کی شخصیت میں ظہور کرتا اور اس کے خدوخال پر، اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مثلاً وہ اسے کہتا ہے کہ تم دنیا میں آئے ہو تو ایک عہد کے پابند ہو، تم اپنے پروردگار کے ساتھ ایک عہد کرکے آئے ہو ۔۔۔ الست بربکم؟ اور اس کو بتاتا ہے کہ تم جتنا انکار کرتے رہو، قالوا بلیٰ تم کہہ کے آئے ہو کہ ہاں۔

اب میری عقل اس کی تصدیق کرتی ہے یا نہیں، میرے تجربات اور حواس کی گرفت میں یہ تصور آتا ہے یا نہیں، یہ میرے مذہبی ہونے کا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ مجھے غیب پر ایمان لانا ہے لہٰذا جس پر میں ایمان لایا، اس نے کہہ دیا کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا تو اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں اس کی پابندی کروں، اپنے آپ کو اس کے تحت زندگی گزارنے پر مجبور پاؤں۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ کہیں عقل کے گھوڑے دوڑانے کی کوشش کروں گا تو میرا خیال ہے سوائے تشکیک اور الجھنے کے میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں بچے گا۔

۲۔۵۔۲۔غیب شہود کے مقابلے میں ہے

غیب اور دین کا یہ تصور ہماری رائے میں نتیجے کے اعتبار سے بہت خطرناک ہے۔ چنانچہ اسی محفل میں سوال کیا گیا کہ قرآن تو خود غور و فکر کی دعوت دیتا ہے لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ ایک مومن سوال نہ کرے اور جسے دین کہا گیا ہے اس پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آئے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن حکیم نے جسے غیب پر ایمان کہا ہے وہ شہود کے مقابلے میں ہے۔ مادی وجود، مادی وسائل اور مادی کائنات سے ماورا ایک عالم غیب اور ایک عالم باطن ہے جس پر ایمان لانا دین کا بنیادی تقاضا ہے بلکہ دین کا آغاز اسی عقیدے سے ہوتا ہے کہ کائنات اور کائنات کی ہر چیز باطن رکھتی ہے اور یہ باطن حواس خمسہ سے غائب ہے اور مادی حواس کی دسترس میں نہیں ہے۔ اس کائنات کا مالک و خالق عالم، قدیر اور مرید ہے۔ یہ ساری کائنات اس کے علم و قدرت اور ارادے سے وجود و ظہور میں آئی ہے۔ اس کا ارادہ اگر کسی چیز سے منقطع ہو جائے تو وہ نسیاً منسیاً ہو جائے۔ غیب کی اس حقیقت پر ایمان دین کا آغاز بھی ہے اور ایمان کی بنیاد بھی۔ کائنات کے اسی مالک کی معرفت دین کا تقاضا ہے۔

۲۔۵۔۳۔قرآنِ حکیم میں خدا کا تصور

قرآن حکیم میں جس خدا کا تصور پیش کیا گیا ہے وہ ہر انسان کی رگ جاں سے زیادہ قریب ہے۔

وَنَحنُ اَقرَبُ اِلَیہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد[1]

ہم انسان کی رگ جاں کی نسبت اس سے زیادہ قریب ہیں۔

اسی خدا کے بارے میں ہے:

فَاَینَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجہُ اللہِ[2]

پس تم جدھر بھی رُخ کرو اُدھر ہی اللہ کا چہرہ ہے۔

اسی خالق و مالک کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ[3]

اور جب تجھ سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو میں یقیناً قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کا جواب دیتا ہوں، تو انھیں چاہیے کہ وہ میری بھی بات قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کہ وہ اچھا راستہ پائیں۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود بندے پر محیط ہے، وہ اس کی ذات میں سمایا ہوا ہے اور وہ بندے کے دل کی آرزوؤں کو جانتا ہے، وہ اس کی پکار پر جواب دیتا ہے۔ اب اس بندے کو بھی چاہیے کہ وہ اس کا حکم بجالائے، اس کی بات کی طرف توجہ دے، اس کی طرف لو لگائے اور اس کے راستے پر چلے۔

یہ تعلق اُس تعلق سے مختلف ہے کہ جو بغیر سوچے سمجھے دین کی ہر بات کو غیب کہہ کر ایمان لانے سے عبارت ہے۔ اللہ کا یہ تصور جو قرآن حکیم نے پیش کیا ہے وہ بندے کو خدا سے جوڑے رکھتا ہے۔ وہ بندے کے لیے خدا کی محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ بندے کو خود خدا کی محبت کا اسیر کر دیتا

---

[1] ق:۱۶

[2] بقرہ:۱۱۵

[3] بقرہ:۱۸۶

ہے۔عرفا واولیاء نے عشق الٰہی کا پیغام جہاں اپنی فطرت سے لیا ہے وہاں ایسی آیات سے بھی اخذ کیا ہے۔خدا انسان کے وجود میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور پوری کائنات میں بھی زندہ و پائندہ ،حی و قیوم، سمیع و علیم، ہمہ وقت ہر چیز سے وابستہ ہے۔وہی ہے جو اپنے راستے کے راہیوں کو جب وہ ایک کامیاب زندگی گزار کر اس کے حضور اپنی جان پیش کرتے ہیں تو کہتا ہے:

یَاۤ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ O ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً O

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ O وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ O[1]

اے نفس مطمئنہ !لوٹ آ اپنے پروردگار کی طرف تُو اُس سے راضی وہ تجھ سے

راضی پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

یہ وہ خدا ہے جو حواس مادی سے غائب ہو کر بھی غائب نہیں ہے۔روح انسانی کی طرح جو غائب ہو کر بھی غائب نہیں۔کائنات کی عظیم روح سے اپنے تعلق کو اپنے وجودِ باطن کے ذریعے سے محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔یہ جیتا جاگتا اور دائمی تعلق ہے بندے کا اپنے خالق و مالک اور خدا سے۔

۲۔۵۔۴۔مخلوقاتِ عالم کا قرآنی تصور

یہ تو خدا کا تصور ہے جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔اس کی مخلوقات جو ہمیں حواس خمسہ کے ذریعے سے معلوم ہیں اس سے کہیں زیادہ دارائے حیات ہیں جو ہم محسوس کرتے ہیں۔یہ قرآن ہی ہے جو کہتا ہے:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهِنَّ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا

یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ[2]

سات آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں

اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم

---

۱) فجر:۲۷تا۳۰

۲) اسرائیل:۴۴

ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ پاتے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تسبیح بے ارادہ ہے، کیا یہ تسبیح فقط ہر چیز کے وجود کی دلالت ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ کون سی چیز ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہ عالم غیب ہی ہے جو ہمارے مادی حواس کی دسترس سے ماورا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پرندے اور پہاڑوں کی تسبیح کا ذکر بھی قرآن کریم میں موجود ہے۔

وَ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَ الطَّیْرَ وَ كُنَّا فٰعِلِیْنَ[1]

اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا جو تسبیح کرتے تھے اور پرندے بھی اور ہم ایسا ہی کرنے والے ہیں۔

روز محشر انسان کے مختلف اعضاء کے کلام کرنے کا ذکر بھی قرآن حکیم میں موجود ہے۔ لہٰذا وہ اعضاء جن کو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ کلام نہیں کر سکتے وہ بھی سخن سرا ہوں گے۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ[2]

آج کے دن ہم مونہوں پر مہر لگا دیں گے، ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

روز محشر تو پھر روز ظہور بواطن کائنات بھی ہوگا۔ یہ حقائق اس وقت سب پر آشکار ہو جائیں گے۔ انبیاء تو آئے ہیں تاکہ اسی زندگی میں ان حقائق کی طرف انسان کو متوجہ کریں جو مادی پردے کی وجہ سے انسان سے اوجھل ہیں۔ روح انسان کی تقویت و تربیت کے ذریعے سے اسی دنیا میں بہت سے انسان ان حقائق تک درجہ بدرجہ پہنچ جاتے ہیں۔ اگر حقیقت مادی دنیا سے ماورا نہ ہوتی تو نبی کریمؐ یہ تمنا کیوں کرتے:

اللّٰھم ارنی الاشیا کماھی

---

[1] الانبیاء:۷۹

[2] یٰسٓ:۶۵

کہ اے اللہ اشیا جیسی ہیں مجھے ویسی دکھا۔

نبی پاکؐ پر درود بھیجنے والی آیت بھی انہی حقائق کے ضمن میں مطالعے اور غور وفکر کا حق رکھتی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا[1]

یقیناً اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی ان پر درود بھیجو اور ان کے حضور سر تسلیم خم کرو جیسے تسلیم کا حق ہے۔

۲۔۵۔۵۔سوال ہی سر رشتۂ حقیقت ہے

راقم کا کہنا ہے کہ یہ سوال ہی ہے جس نے توحید کے ان معارف تک ہماری رسائی کو ممکن بنایا ہے اگر چہ راستہ ابھی بہت باقی ہے لیکن سر رشتۂ حقیقت یہی ہے۔ یہ غور وفکر ہی ہے جس نے تشکیک کی وادی سے ہمیں نکالا ہے لیکن اس کے لیے پروردگار کے حضور اپنے وجود سے طلب کا اظہار ضروری ہے اور پھر عطا اس کی طرف سے ہے۔ عقل وفطرت کے سوتے جب پھوٹنے لگتے ہیں تو حقائق فوارے کی طرح سے انسانی وجود سے باہر نکلتے ہیں اور آسمان سے رحمت الٰہی کی پھوہار الگ انسانی وجود کو نہال کر دیتی ہے اور وجود انسانی کی ہریالی نئی کونپلوں کے نکلنے اور کلیوں کے چٹکنے کا باعث بنتی ہے۔

۲۔۵۔۶۔معرفت الٰہی کے قرآنی دلائل

اس بحث کا ایک پہلو یہ ہے کہ کیا خود پروردگار نے قرآن کریم میں اپنی معرفت کے لیے انسان کے سامنے عقلی دلائل رکھے ہیں یا نہیں؟ یہاں ہماری گفتگو اس علم کلام کے بارے میں نہیں ہے جو جدلیات پر مبنی ہے بلکہ ان ایمانیات سے متعلق ہے جن کی بنیادیں عقلی اور فطری ہیں۔قرآن کریم نے خود معرفت پروردگار کے لیے یہی راستہ اختیار کیا ہے۔آیئے چند آیات کریمہ کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

توحید الٰہی پر ایک زوردار دلیل پیش کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے کہ اگر اس کائنات میں ایک

---

[1] احزاب:۵۶

سے زیادہ معبود ہوتے تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔

لَوْ کَانَ فِیْہِمَآ اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا [1]

اگر آسمانوں اور زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے۔

اسی طرح سے مظاہر کائنات کی طرف بھی قرآن مجید نے متوجہ کیا ہے اور انھیں آیات الٰہی قرار دیا ہے تا کہ عجائب خلقت کی طرف توجہ کرتے ہوئے انسان، ان کے خالق تک پہنچ سکے۔ یہ آیات ملاحظہ کیجیے:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ O وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ O وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ O وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ O [2]

کیا وہ دیکھتے نہیں کہ اونٹ کو کیسا خلق کیا گیا ہے اور آسمان کو کیسے بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو کیسے گاڑا گیا ہے اور زمین کو کیسے پھیلایا گیا ہے۔

ان میں سے بعض آیات ملحدوں کے لیے ہیں تو بعض مشرکوں کے لیے، دونوں گروہوں کے لیے قرآن بات کرتا ہے۔

وجود خدا کی معرفت کے لیے ایک اور حیرت خیز اور جاذب ایمان آیت دیکھیے:

سَنُرِیْہِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِہِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ [3]

ہم جلد ہی انھیں آفاق اور ان کے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر آشکار ہو جائے گا کہ یقیناً وہ (پروردگار) حق ہے کیا تیرے رب کے لیے یہ امر کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

---

[1] انبیاء:۲۲

[2] غاشیہ:۱۷تا۲۰

[3] فصلت:۵۳

قرآن حکیم تو ایسی آیات سے مملو ہے، لہٰذا یہ سمجھنا کہ معرفت خدا کے لیے عقل کے استعمال سے انسان تشکیک میں الجھ جائے گا، درست نہیں۔ دراصل کمزور دلیل انسان کو تشکیک میں مبتلا کرتی ہے۔ اگر ایمان صرف تقلیدی ہوتا تو پھر معرفتِ خدا کے لیے قرآن ایسے دلائل کیوں پیش کرتا۔

۲۔۵۔۷۔ روز الست کا قصہ

محترم دانشور نے اپنی گفتگو میں قرآن کے تصورِ روز الست پر بھی گفتگو کی ہے، وہ کہتے ہیں:

> جس پر میں ایمان لایا، اس نے کہہ دیا کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا تو اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں اس کی پابندی کروں، اپنے آپ کو اس کے تحت زندگی گزارنے پر مجبور پاؤں۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ جسے ایمان بالغیب کہتے ہیں اسے قبول کرنے پر مجبور محض ہیں اور ان کے پاس اس کے حوالے سے کوئی دلیل نہیں ہے۔ نیز یہ کہ قرآن زبردستی میرا ایک ایسا عہد مجھ سے منوانا چاہتا ہے جو مجھے یاد نہیں، نہ میرے تجربے میں آیا ہے۔ اسے المیہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سے کہیں آسان ہے کہ انسان کہہ دے کہ یہ آیت مجھے سمجھ نہیں آئی، میں اس کا مفہوم نہیں سمجھ سکا، کیونکہ دوسری طرف ایسے دلائل کا انبار موجود ہے جو اس جبری ایمان سے نجات دلا سکتا ہے۔ یہ قرآن ہی ہے جو کہتا ہے:

> لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔۔۔[1]
>
> دین میں اکراہ واجبار نہیں۔

اپنے مطلب کے گھوڑے دوڑانے سے بہتر ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ یہ بات مجھے سمجھ نہیں آئی۔

تاہم ہمیں اس آیت کی سمجھ آتی ہے اور یہ انسان کے وجود کے اندر گندھے ہوئے پیمان فطرت کی حکایت کرتی ہے۔ اسی ایمان کی کلی کھلتی ہے تو روح انسان کو خوشبودار کر دیتی ہے۔ عالم ذر

---

[1] بقرہ:۲۵۶

کے بارے میں اس آیت مجیدہ سے متعلق اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اہل نظر نے فکر و نظر کی بستیاں آباد کر رکھی ہیں، ان کی طرف بھی رجوع کرنے اور ان کے حضور زانوے تلمذ تہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی فکری الجھنیں اور مشکلات اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب انسان اپنے کسی ایک شیخ کو استاذ الکل فی الکل سمجھنے لگے، حالانکہ علوم کی وسعت، تنوع اور گہرائی نے ثابت کر دیا ہے کہ کم از کم اس دور میں ایسا استاد بالکل نہیں ہوتا۔

۲۔۵۔۸۔معرفت الٰہی اور عشق الٰہی

یہ معرفت الٰہی کا فیضان ہے کہ انسان حق تعالیٰ سے یوں جڑ جاتا ہے کہ اٹھتے بیٹھتے، دائیں، بائیں کروٹیں بدلتے اللہ کو یاد کرتا رہتا ہے اور قرآن مجید کی آیات سنتا ہے تو ان کی پرسوز تاثیر سے اس کی آنکھیں برسنے لگتی ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ [۱]

وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے اور پہلو بدلتے اللہ کو یاد کرتے ہیں نیز آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب باطل پیدا نہیں کیا، تو (اس سے) پاک ہے (کہ کچھ باطل پیدا کرے) پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ [۲]

مومن تو بس وہ ہیں کہ جن کے سامنے جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل (خشیت الٰہی) سے کانپنے لگتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی

---

۱) آل عمران:۱۹۱

۲) انفال:۲

آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرنے والے ہیں۔

ایمان کی یہ کیفیات ریاضیاتی اور اجباری ایمان سے پیدا نہیں ہوسکتیں۔ یہ المیہ ہے کہ ماضی میں بھی بعض متکلمین اور محدثین نے قضا و قدر اور اللہ تعالیٰ سے متعلق بحث و مباحثہ سے منع کیا اور قرآنی دعوت فکر اور اسلوب بیان کے برعکس اسے زندیقوں کی روش قرار دیا۔ مذکورہ محفل ہی میں ایک بڑی علمی شخصیت نے یہ کہتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ ہماری بعض فقہی کتابوں میں درج ہے کہ متکلمین کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اس کی وجہ تلاش کرتے ہوئے ہمیں یہ تاویل کرنا ہوگی کہ یہ اُن کے وجدان کی مخلصانہ آواز تھی کہ اگر ہم عقل کے گھوڑے دوڑانے کی کوشش کریں گے تو سوائے تشکیک اور الجھنے کے ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں بچے گا۔

قرآن حکیم کی مذکورہ بالا آیات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ سورہ بقرہ کے آغاز میں ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' کہہ کر متقین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان کی تفسیر و تفہیم کے لیے ہمیں پورے قرآن حکیم کو سامنے رکھنا پڑے گا۔

۲۔۵۔۹۔قرآن دلیل طلب بھی کرتا ہے

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن حکیم جہاں دلیل پیش کرتا ہے اور دلیل کے ذریعے سے دلوں کو مطمئن کرتا ہے، وہاں دوسروں سے بھی دلیل طلب کرتا ہے۔ مخالفین سے بھی کہتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ مثلاً

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ [۱]

کون ہے کہ جس نے تخلیق کی ابتدا کی ہے پھر وہ اسے پلٹائے گا اور کون ہے کہ جو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی الہ ہے ان سے کہیے کہ اگر تم سچے ہو تو پھر اپنی دلیل پیش کرو۔

---

۱) نمل: ۶۴

اتنا ہی نہیں کہ قرآن اندھا دھند اللہ پر ایمان کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ قرآن حکیم کو بھی آنکھیں بند کر کے مان لینے کا نہیں کہتا، مقابلے پر آنے والوں سے کہتا ہے:

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ [1]

اور اگر تم اس کے بارے میں کسی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو پھر اس جیسی کوئی سورۃ بنا لاؤ اور اس کے لیے اللہ کے سوا اپنے گواہوں کی مدد بھی طلب کر لو اگر تم سچے ہو۔

۲۔۵۔۱۰۔دعوت تفکر و تدبر

آیئے اب ذرا قرآن کریم کی دعوت تفکر و تدبر کی طرف بھی کچھ اشارے کیے دیتے ہیں۔

خود قرآن حکیم میں تدبر کے حوالے سے یہ آیت مجیدہ ہماری راہنمائی کرتی ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا [2]

کیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے، کیا ان کے دلوں پر ان کے قفل پڑے ہیں۔

قرآن حکیم جہاں متقین کی صفات بیان کرتا ہے وہاں عباد الرحمن کی ایک یہ صفت بھی بیان کرتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا [3]

اور جب انھیں پروردگار کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔

قرآن خلق پر بھی تدبر کی دعوت دیتا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ

---

[1] بقرہ: ۲۳

[2] محمد: ۲۴

[3] فرقان: ۷۳

لِّأُولِی الْأَلْبَابِ[1]

یقیناً آسمانوں اور زمین کی خلقت نیز لیل و نہار کے آگے پیچھے آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

۲۔۵۔۱۱۔اجباری ایمان کا نتیجہ اور دعوت بازنگری

ہم سمجھتے ہیں کہ اجباری اور بے دلیل ایمان اور اس کے ساتھ جڑی ہوئی چند عبادی رسوم اختیار کرنے والے شخص میں اور اپنے معاشرے سے متاثر ہو کر چند نظریات اور رسوم اختیار کرنے والے دہریے میں عملاً کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس لیے جس کے دل میں ایمان باللہ کے لیے کوئی طلب موجود ہے، اسے اپنے طرز فکر میں بنیادی تبدیلی لانا ہوگی۔ اجباری ایمان اللہ سے محبت پیدا نہیں کرتا، جب کہ قرآن مجید کا ہم سے تقاضا ہے کہ ہم اللہ سے، اس کے رسول سے اور اولیاء خدا سے محبت کریں۔ سچے انسانوں سے محبت اور بروں سے نفرت کریں۔ آپس میں رحم دل اور کافروں پر شدید ہوں۔ قرآن معاشرے کو مستضعفین اور مستکبرین میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ مومن کو جدوجہد پر ابھارتا اور اس راستے میں جان دینے والوں کو زندہ قرار دیتا ہے۔ ایمان دلوں کو بے قرار رکھتا ہے اور یہ بے قراری اجباری ایمان سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہماری بڑی محبت سے درخواست ہے کہ ایمان باللہ کے تقاضوں پر بازنگری کیجیے اور قرآن حکیم کی طرف ایک مرتبہ پھر رجوع کیجیے۔

---

[1] آل عمران: ۱۹۰

۲۔٦۔کیا مسجد ریاست کے اندر ایک ریاست کا نام ہے؟

۲۔٦۔۱۔مستشرقین کی ایک قسم

مستشرقین کی ایک قسم ان افراد پر مشتمل ہے جو مشرق سے مغرب کی طرف گئے ہیں اور وہیں پر آباد ہو گئے ہیں۔ پھر وہاں پر رہ کر وہ سرزمین مشرق سے متعلق امور و نظریات اور خاص طور پر اسلام پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو مشرق سے ہی اسلام کے بارے میں اپنی دوستی یا دشمنی لے کر مغرب میں پہنچے اور اسی دوستی یا دشمنی کے ساتھ وہ وہاں پر آباد ہو گئے۔ مستشرقین میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو واقعاً حقیقت کی جستجو میں ہوتے ہیں اگر چہ ایسے بھی بہت ہیں جو منفی جذبات و مقاصد کے ساتھ کام کا آغاز کرتے ہیں یا وہ کسی کی طرف سے ایسے کام پر مامور ہوتے ہیں۔

۲۔٦۔۲۔مسٹر وجے کمار کی ہفوات

مسٹر وجے کمار[۱] بھی ان شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے عالم مشرق سے سرزمین مغرب کی

---

۱) وجے کمار 1954 میں حیدرآباد کے ایک متوسط طبقہ کے قدامت پسند گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے قدیم یونانی کتب، سیاسیات اور فلسفے کی تعلیم بھارت سے حاصل کی۔ 1979 میں انھوں نے امریکی شہریت اختیار کر لی۔ 1983 میں وجے نے ایک امریکی خاتون سے شادی کر لی۔ اس سے قبل 1977 سے 1979 تک وجے نے ایک یورپی کمپنی کی طرف سے ایران میں رہائش اختیار کی، ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد وہ وہاں سے چلے آئے۔ ان کے نزدیک شاہ کے دور کا ایران جدید ایران تھا۔ بیس سال تک وہ انشورنس ایجنٹ رہے۔ تین سال تک انشورنس کا اپنا کاروبار کیا اور 2005ء سے مواصلاتی کمپنیوں کے ساتھ منسلک ہیں۔ کاروبار کے ساتھ وجے کمار امریکی سیاست میں بھی بہت سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ وہ اپنی مادر وطن بھارت کے لیے بھی فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ 2010 میں ہونے والے امریکی صوبائی الیکشن میں حصہ لینے کے دوران میں انھوں نے اپنے آپ کو اسلامی شریعہ مخالف امیدوار کے طور پر پیش کیا اور اس حوالے سے کئی بیانات دیے۔ ان کے خیال میں اسلام کا "عالمگیر جہاد" کا نظریہ دنیا کے تمام مسائل کی جڑ ہے۔ وہ کہتے ہیں میرے خیال میں اسرائیل فلسطین تنازعہ، بھارت پاکستان کھینچا تانی یا سربیا اور بوسنیا کے مسئلے کی کوئی حیثیت نہیں۔
www.kumarforcongress.com/index.php?option=com_content&view=articles&id=96&itemid=71

طرف ہجرت کی۔ان کا اصل وطن بھارت ہے۔ وہ امریکہ میں جا بسے۔ وہاں انھوں نے کانگریس کی رکنیت کے لیے انتخاب بھی لڑا۔ امریکہ میں بڑی تعداد میں ہندو آباد ہیں۔ وجے کمار نے ہندوؤں کے ووٹ کے حصول کے لیے اور امریکی مسیحی ووٹرز کے جذبات اسلام کے خلاف ابھار کر ووٹ حاصل کرنے کے لیے اسلامی نظریات وعقائد کو ہدف تنقید بنایا۔ انھوں نے مسلمانوں اور خاص طور پر مساجد کے وجود کو امریکہ کے لیے خطرناک ثابت کرنے کے لیے ایک مضمون لکھا۔ اس کا عنوان ہے:

"The Muslim Mosque: A state whith in a state"

مسلم مسجد: ریاست کے اندر ایک ریاست

وجے کمار نے خانہ کعبہ، پیغمبر اسلامؐ اور قرآن حکیم کے خلاف کھل کر اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے اپنے موقف کی تائید کے لیے متعدد قرآنی آیات اور احادیث نبوی کا سہارا لیا ہے۔ انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لیے سید قطب اور مولانا مودودی جیسے بعض علماء کی آراء بھی نقل کی ہیں۔

وجے کمار نے اسلام کے نظریہ جہاد کو خوب ہدف بنایا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ ''ماڈریٹ مسلمان'' کا کوئی وجود نہیں۔ معتدل مسلمان کا نظریہ درست نہیں چونکہ ہر مسلمان مسجد کے امام کے حکمِ جہاد کا پابند ہوتا ہے اور ہر مسجد جہاد کا مرکز ہے۔ مسجد کا اپنا آئین و دستور ہے جس کا نام قرآن ہے جو مسلمانوں کو ساری انسانیت کے خلاف جہاد کی پرزور اور دائمی دعوت دیتا ہے لہٰذا مسلمان دنیا کے کسی بھی آئین کو نہیں مانتے۔ اسلام کا ہدف پوری دنیا کو فتح کرنا ہے۔ چودہ سو سال سے مسلمان اسی ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں۔

وجے کمار اپنے دلائل کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ امریکہ میں بسنے والے لوگ امریکی ریاست کے دشمن ہیں۔ ان کا وجود امریکی آئین، ریاست اور شہری زندگی کے لیے خطرناک ہے اور امریکی سرزمین پر موجود ہر مسجد امریکہ کے لیے خطرے کی علامت ہے جبکہ مسلمان نئی سے نئی مسجد بنانے کے درپے ہیں امریکہ کو ان مسلمانوں سے بچانے کی ضرورت

ہے۔ہم اس مقالے میں ان کے نظریات کا ناقدانہ جائزہ لیں گے۔

ابتدا میں ہم ان کے مقالے کی چند عبارتیں ملاحظہ کرتے ہیں:

THE KABAH IN MECCA WAS NOT BUILT AS AN ISLAMIC MOSQUE. It was an ancient temple that had been shared by polytheists, Christians, Jews, and Hindus, honoring 360 different deities. In 630 A.D. the Kabah was captured by Islam in its military invasion and conquest of Mecca.

مکہ میں کعبہ کی تعمیر اسلامی مسجد کے طور پر نہیں کی گئی تھی۔ یہ ایک قدیم مندر تھا جس میں 360 بت رکھے گئے تھے۔ اسے کئی خداؤں کو ماننے والے، عیسائی، یہودی اور ہندو مشترکہ طور پر استعمال کرتے تھے۔ 630ء میں فوجی جارحیت کے نتیجے میں اسلام نے مکہ کو فتح کیا تو کعبہ پر قبضہ کر لیا۔

Mohammed's address at the Kabah overthrew the Meccan government and declared all of Islam, anywhere in the world, to be a political and military state against all non-Muslims, regardless of the non-Muslims' political, geographical, or national origins.

"If anyone desires a religion other than Islam (submission to Allah), never will it be accepted of him." -Quran 3:85

کعبہ میں محمد (ص) کے خطاب نے مکہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ انھوں نے سیاسی، جغرافیائی اور قومی بنیادوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوری دنیا میں غیر مسلموں کے خلاف اسلام کی سیاسی اور فوجی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔

قرآن میں ہے: اگر کوئی شخص اسلام (اللہ کے حضور تسلیم ہونے) کے سوا کوئی مذہب چاہے گا تو اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ (قرآن3:85)

As a political document, the Koran asserts that everyone in the world is within its jurisdiction. So far, Islam has not been able to enforce that totalitarian claim on the entire world, but has managed to do so through threat, infiltration, violence, terrorism, and coercion on roughly 20% of the world. It is engaged in a 1400-year-long Universal Jihad to dominate the rest of the world. All mosques are its outpost headquarters.

ایک سیاسی دستاویز کے طور پر قرآن دنیا میں ہر کسی کو اپنے دائرہ اختیار میں سمجھتا ہے۔ ابھی تک اسلام پوری دنیا پر اپنے مکمل قبضے کے نظریے کو نافذ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا لیکن دھمکی، گھس بیٹھنے، تشدد، دہشت گردی اور جبر کے بل بوتے پر تقریباً 20 فیصد دنیا پر اپنا اقتدار قائم کر چکا ہے۔ باقی دنیا پر تسلط قائم کرنے کے لیے یہ چودہ سو سالہ عالمی جہاد جاری رکھے ہوئے ہے۔ تمام مساجد اس کے غیر ملکی ہیڈ کوارٹرز ہیں۔

Central to the Koran's political mandates is prohibition of religious freedom and religious tolerance, along with denouncements of religions such as Christianity and Judaism.

"O ye who believe! take not the Jews and the Christians for your friends and protectors: They are but friends and protectors to each other. And he amongst you that turns to them (for friendship) is

of them." -Quran 5:51

قرآن کے سیاسی نظریے کے مطابق مذہبی آزادی اور مذہبی رواداری ممنوع ہے۔ علاوہ ازیں وہ مسیحیت اور یہودیت کو باطل قرار دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست اور سرپرست نہ بناؤ۔ وہ ایک دوسرے کے دوست اور مدافع ہیں اور تم میں سے جو کوئی بھی اُن سے (دوستی کے لیے) میلان رکھے گا وہ انہی میں سے ہے۔ (قرآن 51:5)

The Koran as a political document also forbids separation of church and state. That is why every Islamic nation, where Islamic leaders have managed to gain power, is a theocracy, ruled by the Quran and Islamic Sharia law.

ایک سیاسی دستاویز کی حیثیت سے قرآن کلیسا اور ریاست کی جدائی کو بھی منع کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان قوم میں جہاں مسلمان رہنما قوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں وہ ایک تھیوکریسی (ملائیت) ہے اور وہاں پر قرآن اور اسلامی شرعی قانون نافذ ہے۔

Sharia law also mandates discrimination toward women, and forbids any criticism of Islam or its founder, stifling freedom of speech.

شرعی قانون عورت کے ساتھ بھی امتیاز روا رکھتا ہے نیز آزادی تقریر کے منافی اسلام اور اس کے بانی پر تنقید کی بھی ممانعت کرتا ہے۔

Sharia law also mandates that all men are slaves with no right to freedom of religion:

"Allah's right on His slaves is that they should worship Him (Alone) and should not worship any

besides Him." -Muhammad Sahih Bukhari 4:52:108, Narrated Mu'adh

شرعی قانون کا یہ بھی تقاضا ہے کہ تمام لوگ غلام (بندے) ہیں اور انھیں مذہب کی کوئی آزادی حاصل نہیں۔ جیسا کہ [حدیث] میں ہے: "اللہ کا اپنے غلاموں (بندوں) پر حق ہے کہ وہ اس (اکیلے) کی عبادت کریں اور اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں" صحیح بخاری 4:52:108، بروایت معاذ

In short, Sharia law stands in direct opposition to the American Constitution and Bill of Rights. The implementation of Sharia law demands the overthrow of the American Constitution and our form of government and system of laws. Mosque leaders, in every nation in the world, are loyal to the Quran, the Hadith, the Sira, and consider them divine law, and therefore supreme over all manmade laws.

مختصر یہ کہ شرعی قانون امریکی آئین اور ضابطۂ حقوق کے سیدھا مخالف ہے۔ شرعی قانون کے نفاذ کا تقاضا ہے کہ امریکی آئین، ہمارے طرز حکومت اور نظام قانون کو اٹھا پھینکا جائے۔ دنیا کی ہر قوم میں موجود مساجد کے رہنما قرآن، حدیث اور سیرہ کے وفادار ہیں۔ وہ انھیں مقدس قانون جانتے ہیں اور اسی بنا پر انھیں انسانوں کے بنائے ہوئے قانون سے سپریم سمجھتے ہیں۔

In every instance where Islam has conquered and "destroyed utterly" a nation or civilization, the key to the conquest was the establishment of mosques,

which are political and military command and control centers for Islam, and which all point toward the seat of Islamic power: the Kaaba.

جب بھی کسی موقع پر اسلام نے کسی قوم یا تہذیب پر فتح حاصل کی اسے مکمل تباہ کر دیا۔ اس فتح کا بنیادی ہدف مساجد کا قیام تھا جو اسلام کے کمانڈ اینڈ کنٹرول سنٹر ہیں نیز یہ تمام مساجد اسلام کی طاقت کے مرکز یعنی کعبہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

Throughout history, since 610 A.D., the leaders of Islam have been waging Universal Jihad around the world for the purpose of Islamic totalitarian domination of the world. It has never mattered what percentage of the Muslim population was "peaceful" or "moderate." Peace and moderation are not relevant to the totalitarian mandates of Islam's political documents, and Islam's leaders always follow the totalitarian mandates of Universal Jihad contained in them.

610ء سے لے کر پورے تاریخی دور میں مسلمان راہنما اسلام کی مکمل حاکمیت کے لیے دنیا بھر سے عالمگیر جہاد میں مصروف رہے ہیں۔ اس سے کبھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مسلمان آبادی میں سے کتنے فیصد ''پرامن'' یا ''اعتدال پسند'' ہیں۔ امن اور اعتدال پسندی اسلام کے مکمل غلبے کے نظریے سے ہم آہنگ نہیں ہے اور اسلامی رہنما مکمل غلبے کے نظریے کے مطابق عالمگیر جہاد کے راستے پر گامزن رہے ہیں۔

"When you are called (by the Muslim ruler) for fighting, go forth immediately." -Hadith Sahih

Bukhari 4:52:79:Narrated Ibn 'Abbas.

All Islamic mosques have Islamic leaders (rulers) who can call Muslims for fighting, and as such are satellite headquarters for spreading Literal Islam's political doctrine of world domination and totalitarianism-no matter how many "moderate Muslims" they serve.

حدیث میں ہے کہ ”جب تمھیں مسلمان حاکم جہاد کے لیے پکاریں تو فوراً اٹھ کھڑے ہو۔“ صحیح بخاری 4:52:79، راوی ابن عباس

تمام اسلامی مساجد میں اسلامی رہنما (حاکم) ہوتے ہیں جو مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دے سکتے ہیں۔ یہ مساجد مسلمانوں کے مواصلاتی ہیڈ کوارٹرز ہیں جن کا مقصد عالمی تسلط اور مطلق العنانیت پر مبنی حرفیت پر مشتمل اسلام کے سیاسی نظریے کو پھیلانا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ کتنے اعتدال پسند مسلمانوں کے کام آتی ہیں۔

Just as our Constitution of the United States binds and identifies us as a single political and legal union of non-contiguous states, territories, political groups, and people, so the Quran binds and identifies all Islamic nations and all Muslims as a single political and legal union of non-contiguous nations, territories, political groups and people, regardless of geographic boundaries, whose seat of power is the occupied Kaaba. All Islamic Imams, in every mosque everywhere in the world, are

bound to the Quran as supreme law.

بالکل اسی طرح جیسے ریاستہائے متحدہ کا ہمارا آئین ہمیں جوڑتا ہے اور غیر ملحق سرحدوں کی ریاستوں، علاقوں، سیاسی گروہوں سے تعلق ہونے کے باوجود ہمیں ایک سیاسی اور قانونی یونین کے طور پر مشخص کرتا ہے، اسی طرح قرآن تمام اسلامی قوموں اور سارے مسلمانوں کو غیر ملحق سرحدیں رکھنے والی قوموں، خطوں، سیاسی گروپوں اور لوگوں کو ایک سیاسی وحدت اور قانونی یونین کے طور پر جوڑتا اور مشخص کرتا ہے اور ایسا جغرافیائی سرحدوں سے بالاتر ہوکر کرتا ہے۔ اس یونین کی طاقت کا مرکز مقبوضہ کعبہ ہے۔ دنیا میں ہر کہیں پر مسجد میں موجود تمام اسلامی ائمہ قرآن کے ساتھ اُس کے سپریم قانون ہونے کی بنیاد پر بندھے ہوئے ہیں۔

Islam declares that the Quran and Sharia law are divine, and, as such, are the only "legitimate" law in the world. In that way, Islam "self-legitimizes" its right to use physical force anywhere in the world, and the right of every Imam in every mosque in the world to call for physical force and violence at any time. This makes every Imam in every mosque a military leader.

اسلام اعلان کرتا ہے کہ قرآن اور قانون شریعت مقدس ہیں اور یہی دنیا کے لیے جائز قانون ہیں لہذا اسلام دنیا میں کہیں بھی جسمانی طاقت کے استعمال کو اپنے لیے جائز سمجھتا ہے اور وہ اپنا یہ حق سمجھا ہے کہ دنیا کی کسی بھی مسجد میں موجود امام کسی بھی وقت جسمانی طاقت کے استعمال اور تشدد کی دعوت دے سکتا ہے۔

Islam is a state by every definition and theory, and

is a state hostile to and at war with the United States of America and its Constitution.

اسلام ہر تعریف اور نظریے کی رو سے ایک ریاست ہے۔ یہ ایک ریاست ہے جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور اس کے آئین کی دشمن ہے اور اس کے خلاف حالتِ جنگ میں ہے۔

Islam's political documents and law call for the overthrow of our Constitution and our man-made laws, and therefore for the overthrow of our government, which by definition constitutes sedition and treason. The Islamic documents call for the overthrow of our government a protector of religious freedom and human rights through violence:

اسلام کی سیاسی دستاویزات اور قانون ہمارے آئین اور انسان ساختہ قوانین کو اٹھا پھینکنے کا تقاضا کرتے ہیں گویا ہماری ایسی حکومت کے تشدد کے ذریعے خاتمے کا تقاضا کرتے ہیں، جو مذہبی آزادی اور انسانی حقوق کی محافظ ہے۔

The Quran, as the constitution of Islam and Muslims, is diametrically opposite to the United States Constitution and Bill of Rights. According to Islam and Muslims, the Quran is divine law, uncorrupted and incorruptible, whereas the United States Constitution is man-made and is not infallible, and therefore is corrupt. The U.S. Constitution is the antithesis of the Quran; therefore Muslims have no obligation to obey it.

اسلام اور مسلمانوں کے قانون کی حیثیت سے قرآن ریاستہائے متحدہ کے آئین اور ضابطۂ حقوق کے یکسر مخالف ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے نظریے کے مطابق قرآن ایک مقدس قانون ہے جس میں کوئی تحریف واقع نہیں ہوئی اور نہ اس میں کوئی تحریف واقع ہوسکتی ہے جبکہ ریاستہائے متحدہ کا آئین انسان ساختہ ہے اور یہ غلطیوں سے مبرا نہیں ہے لہٰذا ناقص ہے امریکہ کا آئین قرآن سے متصادم ہے لہٰذا مسلمانوں پر اس کی اطاعت کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

A mosque in the United States is a command and control center of a foreign political and military state that seeks the overthrow of our government, and an Imam in a mosque is a political and military representative of a foreign state that calls for the overthrow of the United States.

ریاستہائے متحدہ میں ایک مسجد ایک ایسی غیر ملکی سیاسی اور فوجی ریاست کا کمانڈ اینڈ کنٹرول سنٹر ہے جو ہماری حکومت کو ختم کر دینا چاہتی ہے اور کسی مسجد میں موجود ایک امام اس بیرونی ریاست کا سیاسی اور فوجی نمائندہ ہے جو ریاستہائے متحدہ کو ختم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔[1]

۲۔۶۔۳۔کیا خانہ کعبہ ایک مندر تھا!

مسٹر وجے کمار نے اپنا مضمون اس دعوے سے شروع کیا ہے کہ اسلام نے ایک مندر کو زبردستی مسجد میں تبدیل کر دیا اور اس میں موجود بتوں کا خاتمہ کر دیا اور اسے قبلہ قرار دے کر اسلام کی سیاسی و فوجی قوت کا مرکز بنا دیا۔ ان کے اس بیان کے بارے میں مندرجہ ذیل امور قابل توجہ ہیں:

[1]) http://atlasshrugs2000.typepad.com/atlas_shrugs/2010/07/atlas-exclusive-congressional-candidate-vijay-kumar-the-muslim-mosque-a-state-within-a-state-.html

(۱) ہندو ایک خاص تاریخی پس منظر رکھتے ہیں۔ ان کے بعض مذہبی پیشوا اور بانیان مذہب ہیں اور اُن کی بعض مقدس کتابیں ہیں۔ تمام اہل علم اس حقیقت سے آشنا ہیں۔ اس پس منظر کے حامل ہندو فقط ہندوستان میں بستے ہیں اور دنیا میں آج جہاں کہیں بھی ہندو ہیں وہ ہندوستان ہی سے ہجرت کر کے وہاں پہنچے ہیں۔ مکہ میں ظہور اسلام سے قبل جو مشرکین یا بت پرست رہتے تھے ان کا اس ہندو مذہب سے کوئی تعلق نہیں جس کا مرکز ہندوستان یا برصغیر ہے جس میں آج کئی ممالک شامل ہیں۔

(۲) یہودی اور عیسائی دونوں خانہ کعبہ کے تقدس کے قائل نہیں۔ قرآن حکیم میں متعدد ایسی آیات ہیں جن میں اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم جزیرۃ العرب کے اہل کتاب پر گراں گزرا۔ اس سلسلے میں سورہ بقر کی آیات ۱۴۲ تا ۱۴۵ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

(۳) وجے کمار نے ''خانہ کعبہ'' کو ''ٹمپل'' قرار دیا ہے چونکہ ظہور اسلام کے موقع پر اس میں مورخین کے نزدیک 360 بت نصب تھے۔ ہم اس سلسلے میں یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ خانہ کعبہ کو شروع سے ہی ایک مندر یا بت پرستی کے مرکز کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا یا اسے توحید پرستی کے مرکز کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا اور بعد میں لوگوں نے اس میں بت نصب کر دیے؟ تاریخ کا ادنیٰ سا طالب علم یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ خانہ کعبہ بت پرستی کے مرکز کے طور پر قائم ہوا۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے بارے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیمؑ اس کے بانی ہیں اور دوسرا یہ کہ حضرت آدمؑ اس کے بانی ہیں اور حضرت ابراہیمؑ اس کی از سرِ نو تعمیر کرنے والے یا تجدید تعمیر کرنے والے ہیں۔[۱] ان میں سے کوئی بھی قول درست ہو یہ امر واضح ہے کہ یہ انبیائے الٰہی توحید پرست تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کی تاریخ اتنی واضح ہے کہ ان کی توحید پرستی پر تو کوئی انگشت نمائی نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ متعدد مورخین نے لکھا کہ ظہور اسلام کے زمانے میں مکہ میں ایک گروہ کو حنفاء کہا جاتا تھا کیونکہ وہ حضرت ابراہیم کے توحید پرستی پر مبنی دین حنیف کے پیروکار تھے اور بت پرستی نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ تاریخِ یعقوبی میں ہے:

دیگر مختلف اقوام کی ہمسائیگی، مختلف ممالک میں رفت و آمد اور چراگاہوں کی تلاش میں ادھر

---

۱) رازی، ابوالفتوح، تفسیر، حواشی: مہدی الٰہی قمشہ ای (انتشارات علمی، تہران، ۱۳۲۵) ج ۱، ص ۳۱۱

اُدھر جانے کی وجہ سے عرب مختلف دین رکھتے تھے۔قریش اور معد بن عدنان کی باقی اولاد کے ہاں دین ابراہیمی کے کچھ احکام باقی تھے۔ وہ بیت اللہ کی زیارت کرتے تھے، مناسک حج بجالاتے تھے، مہمان نواز تھے، حرام مہینوں کی تعظیم کرتے تھے، فحش کاموں، قطع رحمی اور ظلم وستم کو ناروا جانتے تھے، جرائم پر سزا دیتے تھے اور جب تک تولیتِ کعبہ ان کے ہاتھ میں رہی وہ ایسے ہی رہے۔۔۔

عمرو بن لحی جس کا نام ربیعہ بن حارثہ بن عمرو بن عامر ہے، شام گیا، وہاں عمالقہ کے کچھ لوگ تھے جو بتوں کی پوجا کررہے تھے۔اس نے ان سے کہا: یہ جن بتوں کی تم پوجا پاٹ کررہے ہو یہ کیا ہیں؟ وہ کہنے لگے: یہ وہ بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں، ان سے مدد کا تقاضا کرتے ہیں تو یہ ہماری مدد کرتے ہیں، ان کے وسیلے سے بارش طلب کرتے ہیں تو سیراب ہوجاتے ہیں۔ اس نے کہا: کیا ان میں سے ایک بت تم مجھے نہیں عطا کردیتے تاکہ میں اسے سرزمین عرب میں لے جاؤں، اس جگہ پر کہ جہاں عرب بیت اللہ کی زیارت کے لئے آتے ہیں؟ اس پر انھوں نے اسے ایک بت دے دیا جس کا نام ہبل تھا۔ وہ اسے مکہ لے آیا اور اسے کعبہ کے پاس رکھ دیا۔ یہ مکہ میں رکھا جانے والا پہلا بت تھا۔ اس کے بعد اساف اور نائلہ کو لایا گیا اور ہر کسی کو ارکان کعبہ میں سے ایک پر رکھ دیا گیا۔ طواف کرنے والا اپنا طواف اساف سے شروع کرتا تھا، اس کا بوسہ لیتا تھا اور اسی پر ختم کرتا تھا۔

انھوں نے کوہ صفا پر ایک بت نصب کیا جس کا نام مجاور الریح تھا اور کوہ مروہ پر ایک بت نصب کیا جس کا نام مطعم الطیر تھا۔عرب جب بیت اللہ کی زیارت کے لئے آتے تھے اور ان بتوں کو دیکھتے تھے تو قریش اور خزاعہ سے دریافت کرتے تھے تو وہ جواب میں کہتے تھے: ہم ان کی پرستش کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ کے نزدیک کردیں۔ جب عربوں نے انھیں ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو بتوں کی پوجا شروع کردی۔ ہر قبیلے نے اپنا ایک بت بنالیا۔ وہ ان بتوں کی عبادت کرتے تھے تاکہ وہ بزعم خویش اللہ کی قربت اختیار کرسکیں۔

جرش میں قبیلہ کلب بن وبرہ اور قضاعہ کی چند شاخوں کا بت ود تھا جسے انھوں نے دومۃ الجندل میں نصب کررکھا تھا۔[۱]

۱) یعقوبی، احمد بن ابی یعقوب: تاریخ الیعقوبی (منشورات الشریف الرضی قم، ایران، ۱۴۱۴ھ) ج ۱، ص: ۲۵۴ و ۲۵۵

۲۔۶۔۴۔کعبۃ اللہ مرکز امن

کعبۃ اللہ کو فوجی و عسکری تسلط کی علامت کے طور پر ذکر کرنا اگر نیت کی کجی کا مظہر نہ ہو تو کم از کم کوتاہ نظری ضرور ہے۔ مسلمان اسے ''حرمِ امن الٰہی'' قرار دیتے ہیں۔ تمام مسلمان فقہا اس پر متفق ہیں کہ سرزمین حرم پر قتال حرام ہے۔ یہاں انسانوں کو مارنا ہی نہیں بلکہ جانور کو مارنا بھی ناجائز ہے۔ بعض جانور وہ کے ذبح کرنے یا مارنے کے لیے سزا تک مقرر ہے جسے فقہ کی زبان میں ''کفارہ'' کہتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر اس زمین پر درخت کاٹنا اور پودوں کو توڑنا بھی جائز نہیں۔ ہم اس سلسلے میں قرآن حکیم کی چند آیات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں:

> وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ○ وَ اقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَ اَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ وَ الْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْکُمْ فِیْہِ فَاِنْ قٰتَلُوْکُمْ فَاقْتُلُوْھُمْ کَذٰلِکَ جَزَآءُ الْکٰفِرِیْنَ[1]
>
> اور اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں لیکن حد سے نہ بڑھ جانا بے شک اللہ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور (جو تمھارے خلاف جنگ کریں) انھیں جہاں بھی پاؤ اُن سے جنگ کرو اور ان کو وہاں سے نکال دو جنھوں نے تمھیں نکالا ہے اور فتنہ انگیزی قتل سے بھی شدید تر ہے البتہ اُن سے مسجد حرام کے پاس اُس وقت تک جنگ نہ کرنا جب تک وہ تم سے جنگ نہ کریں پس اگر وہ جنگ کریں تو تم بھی جنگ کرو کیونکہ نہ ماننے والوں کا یہی بدلہ ہے۔

یاد رہے کہ یہ آیات جنگی قوانین بیان کرنے کے لیے ہیں۔ ان میں جنگ چھیڑنے والوں، جارحیت کا ارتکاب کرنے والوں، بے گھر کرنے والوں اور فتنہ برپا کرنے والوں سے مقابلہ مثل کا

[1] بقرہ۔ ۱۹۰ و ۱۹۱

حکم دیا جا رہا ہے لیکن اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ان کے ظلم و ستم اور جارحیت کا جواب دیتے ہوئے حد سے تجاوز نہ کرنا۔ علاوہ ازیں خانہ کعبہ کے نزدیک ہرگز جنگ نہ کرنا سوائے اس کے کہ غنیم وہاں بھی تم پر حملہ آور ہو جائے اور اللہ کے گھر کا امن برباد کرنے پر تل جائے اور وہاں انسانی خون بہانے سے دریغ نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ آخری صورت ہے اور ایسی صورت ہے کہ دنیا میں کسی ملک و قوم کا قانون اس کی اصابت اور درستی سے انکار نہیں کرسکتا۔

قرآن حکیم نے واضح طور پر کعبہ کو پوری انسانیت کا مرکز اور جائے امن قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا[1]

اور (یاد کرو) جب ہم نے اس گھر (خانہ کعبہ) کو انسانوں کے رجوع کرنے اور امن کا مقام قرار دیا۔

اس ضمن میں سورہ مائدہ کی یہ آیت بھی اسلام کا موقف پیش کرتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ وَ لَآ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ[2]

اے ایمان والو! اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو اور نہ حرمت والے مہینوں کی اور نہ (کعبہ کی طرف لائے گئے) قربانی کے جانوروں کی، نہ ان جانوروں کی جن کے گلے میں علامتی پٹے ہوں اور نہ بیت الحرام کا قصد کرکے آنے والوں کی جو اپنے رب کے فضل اور اس کی رضا کے طالب

[1] بقرہ۔ ۱۲۵

[2] مائدہ۔ ۲

ہیں اور جب تم حالتِ احرام سے باہر نکل آؤ تو شکار کر سکتے ہو اور کسی قوم کی اس بنا پر دشمنی کہ اس نے تمھیں مسجد حرام میں آنے سے روکا تھا اس بات پر نہ ابھارے کہ تم حد سے گزر جاؤ اور نیکی و تقویٰ میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ و سرکشی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

مذکورہ بالا آیات کے سرسری مطالعے سے بھی یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ خانۂ کعبہ کے بارے میں اسلام کا وہ نقطۂ نظر ہرگز نہیں جو وجے کمار نے پیش کیا ہے۔ خانہ کعبہ یا مسجد حرام کے بارے میں قرآن حکیم کی تمام آیات کو سامنے رکھ کر حقیقی صورت حال واضح ہو سکتی ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں بیان کیے گئے ان نکات پر غور و فکر کی ضرورت ہے:

(۱) خانہ کعبہ ساری خدا پرست انسانیت کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) خانہ کعبہ فوجی طاقت کی بنیاد پر عالمی تسلط کی علامت نہیں بلکہ امن و سلامتی کا مرکز ہے۔

(۳) خانہ کعبہ میں جنگ و قتال کی اجازت نہیں ہاں البتہ حدود حرم میں اگر کوئی جنگ چھیڑ دے اور حملہ آور ہو جائے تو دفاع ضروری ہے۔

(۴) جن لوگوں نے مسلمانوں کو مسجد حرام میں آنے سے روکا تھا اُن کے خلاف بھی تجاوز جائز نہیں۔

(۵) حالت احرام میں جانور کے شکار کی بھی اجازت نہیں چہ جائیکہ کسی انسان کے خلاف کوئی اقدام۔

۲۔۶۔۵۔ کعبہ کو نہیں خدا کو سجدہ

کعبہ کو قبلہ قرار دینے کے مقاصد پر قرآن و حدیث میں بہت کچھ بیان کیا جا چکا ہے۔ حکمائے اسلام نے بھی اس کے بارے میں عمدہ باتیں کی ہیں۔ اس مقالے کی مناسبت سے ہم یہاں پر قرآن حکیم کی یہ آیت غور و فکر کے لیے پیش کرتے ہیں:

وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ[1]

مشرق و مغرب اللہ ہی کے ہیں پس جدھر بھی تم منہ کرو اُدھر ہی اللہ کا رخ ہے۔ یقیناً اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کعبۃ اللہ کے بارے میں اسلام اور قرآن کا نقطۂ نظر بہت گہرا ہے اور وجے کمار جیسے سطح بیں افراد کی نظر اس تک نہیں جا سکتی۔ مرزا غالب نے اس حوالے سے ایک عمدہ شعر کہا ہے:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں[2]

۲۔۶۔۶۔ تمام عبادت گاہوں کا احترام

حالتِ جنگ میں مسلمانوں کو ہمیشہ حکم دیا جاتا رہا ہے کہ غیر مسلموں کے عبادت خانوں کا احترام کیا جائے بلکہ برسرِ پیکار قوم کے مذہبی رہنماؤں کے خلاف بھی کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ قرآن کی نظر میں تمام عبادت گاہیں محترم ہیں چونکہ ان میں کثرت سے اللہ کو یاد کیا جاتا ہے۔ سورہ حج میں ہے:

وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا[3]

اور اگر اللہ بعض (جنگ آزما) لوگوں کو بعض کے ذریعے سے نہ ہٹاتا تو وہ خانقاہیں، گرجے، کلیسے اور مسجدیں مسمار اور منہدم کر دی جاتیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں صرف مسجدیں محترم نہیں بلکہ تمام عبادت گاہیں جن

---

۱) بقرہ۔۱۱۵

۲) غالب، اسد اللہ خان، مرزا: دیوان غالب، تصحیح: حامد علی خان (الفیصل ناشران و تاجران کتب، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۷ء) ص ۸۱

۳) حج۔۴۰

میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، محترم ہیں۔

۲۔۶۔۷۔کیا اسلام زبردستی غلبہ قائم کرنا چاہتا ہے

وجے کمار کا کہنا ہے کہ اسلام اپنا اقتدار زبردستی پوری دنیا پر قائم کرنا چاہتا ہے اس سلسلے میں انھوں نے قرآن حکیم کی اس آیت کا حوالہ دیا ہے:

وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ[1]

اس کا مطلب انھوں نے یہ لیا ہے کہ ''پیغمبر اسلامؐ نے پوری دنیا میں غیر مسلموں کے خلاف اسلام کی سیاسی اور فوجی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔''

وجے کی اس عبارت اور دیگر عبارات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک اسلام زبردستی تمام دنیا کو مسلمان بنانے کے درپے ہے اور وہ سیاسی و فوجی قوت کے بل بوتے پر پوری دنیا میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا ہے۔ہم اُن کی خدمت میں چند نکات غور و فکر کے لیے پیش کرتے ہیں:

غیر مسلموں کے بارے میں قرآن حکیم کے نقطہ نظر کو جاننے کے لیے متعلقہ موضوع پر دیگر آیات کو بھی سامنے رکھنے ہوگا تا کہ ہر آیت کا صحیح مفہوم معلوم ہو سکے۔قرآن حکیم کی تفسیر کے اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔بظاہر یہ اصول قرآن فہمی کے لیے ہی درست نہیں دیگر کتب اور شخصیات کے افکار کو جانچنے اور جاننے کے لیے بھی درست بلکہ ضروری ہے۔

یہاں چند آیات کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے:

(i) لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ[2]

دین کے اختیار کرنے میں کوئی زبردستی نہیں

(ii) لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ[3]

---

[1] آل عمران۔۸۵

[2] البقرہ۔۲۵۶

[3] الکافرون۔۶

تم اپنے دین پر رہو اور ہم اپنے دین پر

(iii) قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔[1]

کہیے: اے اہل کتاب! آؤ اس ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی اختیار نہ کریں اور نہ کسی چیز کو اُس کا شریک قرار دیں اور نہ ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب قرار دے۔ پھر اگر وہ روگردانی کریں تو تم کہہ دو کہ ہم تو (اس نظریے کو) تسلیم کرنے والے ہیں۔

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نہ فقط یہ کہ دوسروں کو حق دیتا ہے کہ وہ آزاد ہیں جو دین دھرم اختیار کرنا چاہیں بلکہ دیگر اہل کتاب سے کہتا ہے کہ آؤ مشترکات کی بنیاد پر مل جل کر زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں رسول اکرمؐ جن پر یہ قرآن نازل ہوا اُن سے بڑھ کر اس کے مدعا یا مقصد کو کون جان سکتا ہے۔ وہی ہیں جنھوں نے مدینہ میں پہنچنے کے بعد وہاں کے یہودیوں کے ساتھ پرامن بقائے باہم کا معاہدہ کیا جسے میثاقِ مدینہ کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ کے بعد بھی غیر مسلم مسلمان حکومتوں میں رہے ہیں اور انھیں پوری مذہبی آزادی حاصل رہی ہے۔ اس کے لیے خاص طور پر صدر اسلام سے بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

۲۔۶۔۸۔ مسجد نبوی میں مسیحی وفد

مسجد الحرام کے بعد مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ مقدس مسجد نبوی ہے۔ مسجد نبوی میں رسول اسلام کے زمانے میں بیرون شہر سے آنے والے وفود کو ٹھہرایا جاتا تھا جن میں غیر مسلم اہل کتاب بھی ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعے کا ذکر ابن کثیر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

---

[1] آل عمران۔ ۶۴

غیر مسلموں کے جو بیرونی وفود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے ان کی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود میزبانی فرماتے چنانچہ جب مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حبشہ کے عیسائیوں کا ایک وفد آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور ان کی مہمان نوازی خود اپنے ذمہ لی اور فرمایا: یہ لوگ ہمارے ساتھیوں کے لیے ممتاز و منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے میں نے پسند کیا کہ میں بذات خود ان کی تعظیم و تکریم اور مہمان نوازی کروں۔[1]

اس سلسلے میں طبقات ابن سعد کی عبارت بھی قابل استفادہ ہے:

ایک دفعہ نجران کے عیسائیوں کا چودہ رکنی وفد مدینہ منورہ آیا۔ آپ نے اس وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور اس وفد میں شامل مسیحیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنی نماز اپنے طریقہ پر مسجد نبوی میں ادا کریں چنانچہ یہ مسیحی حضرات مسجد نبوی کی ایک جانب مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے۔[2]

۲۔۶۔۹۔ قوم اور مذہب کی سرحدیں

وجے کمار نے اپنے مقالے میں متعدد مرتبہ یہ تاثر قائم کیا ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں ایک عالمی ریاست کے شہری ہیں اور وہ قومی ریاستوں کی سرحدوں کا احترام نہیں کرتے۔ جیسے امریکہ کی مشخص سرحدیں ہیں، مسلمانوں کی ایسی سرحدیں نہیں ہیں۔ وہ امریکی آئین اور حکومت کو باطل سمجھتے ہیں اور قرآن کو اپنا غیر متبدل آئین قرار دیتے ہیں اور مسجد جہاں بھی ہو مسلمانوں کی عالمی حکومت کا سیاسی و عسکری مرکز ہے۔

حق و باطل کو خلط ملط کر دینے کی اس سے بہتر مثال شاید ہی مل سکے۔ دنیا میں کوئی شخص بھی یہ نہیں سمجھتا کہ مذاہب و ادیان قومی ریاستوں کی حدود میں پابند ہیں۔ دنیا میں موجود بڑے ادیان

---

۱) ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، ۲: ۳۱

۲) ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۱: ۳۵۷

تمام اسی طرح ہیں اوراُن کے ماننے والے مذہبی طور پر اپنے اپنے مراکز سے وابستہ ہوتے ہیں۔مثلاً دنیا بھر کے کیتھولک عیسائیوں کا مرکز ویٹی کن ہے۔سب کیتھولک عیسائی پاپائے روم کو اپنا پیشوا سمجھتے ہیں اور کوئی کیتھولک مسیحی جتنا جتنا مذہبی ہوتا ہے اتنا اتنا پوپ کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔اس کے باوجود وہ اپنی ریاست کا شہری بھی ہوتا ہے اوراس کے آئین وقانون کا پابند بھی۔ مذہبی مقامات کا احترام بھی سرحدوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔دنیا کے مختلف ممالک میں موجود سکھ ہرسال بلکہ سال کے مختلف مواقع پر پاکستان میں موجود اپنے مقدس مقامات کی زیارت کوآتے ہیں اور جونہیں آتے ان کے دل میں بھی ان مقامات کی تعظیم اور محبت ہوتی ہے۔یہی صورت حال مذہبی عبادت گاہوں کی ہے۔دنیا کے مختلف کلیساؤں سے وابستہ گرجا گھر پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کیاان گرجا گھروں کوکسی مرکزی کلیسا کے سیاسی وعسکری اقتدار کی علامت قرار دیا جاسکتا ہے؟کسی زمانے میں کلیسا کا سیاسی وعسکری کردار بہت زیادہ تھا۔کلیسا کی حکمرانی تھی لیکن آج صورت حال تبدیل ہوچکی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کعبۃ اللہ پوری دنیا میں مسلمانوں کا قبلہ ہے اور مسلمانوں کے دل میں اس کا بے پناہ احترام ہے اور ہرسال دنیا بھر سے مسلمان اس کی زیارت کے لیے وہاں پہنچتے ہیں اور بعض مخصوص مراسم کے ساتھ وہاں ایک عبادت بجالاتے ہیں جسے حج کہا جاتا ہے۔خانہ کعبہ میں آج کوئی ایسا عسکری وسیاسی اقتدار قائم نہیں کہ دنیا بھر کے مسلمان جس کی اطاعت کرتے ہوں۔دنیا میں موجود ہر مسجد کا رخ خانہ کعبہ ہوتا ہے چونکہ وہ مسلمانوں کے نزدیک قبلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔دنیا میں موجود یہودیوں کا بھی اپنا قبلہ ہے۔دیگر اقوام کا بھی قبلہ رہا ہے اس سے بالاتر کہ وہ کس علاقے میں بستے ہیں۔قبلہ کے تعین کا فلسفہ کیا ہے، یہ ایک الگ موضوع ہے مقالہ نگار کو چاہیے کہ اس سوال کا الگ سے جواب تلاش کرے اور اس ضمن میں علماء اور دانشوروں نے جو کتب لکھی ہیں یا علمی مقالے سپردقلم کیے ہیں ان کا مطالعہ کرے۔ڈاکٹر کے ایم جارج، (FR.DR.K.M.GEORGE) جو آرتھوڈوکس ،کوٹیام (Orthodox Theological Semianry Kottayam) کے پرنسپل ہیں، نے ایک مضمون عیسائیوں کے عبادت کے موقع پر

مشرق کی طرف رخ کرنے کے حوالے سے لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے ''Why turn to east for prayer?''۔ وہ اپنے مضمون کا آغاز یوں کرتے ہیں:

> یہودی یروشلم کے مقدس شہر سے باہر جہاں بھی رہتے ہوں روایتی طور پر عبادت کے لیے فلسطین (جدید اسرائیل) کے شہر یروشلم کی طرف رخ کر لیتے ہیں۔ مسلمان دنیا میں ہر کہیں نماز کے معین اوقات میں سعودی عرب کے شہر مکہ میں موجود کعبہ کی طرف رخ کر لیتے ہیں جو [جہاں] مقدس کالا پتھر (حجر اسود) ہے۔ مسیحی قدیم زمانے سے اجتماعی عبادت کے لیے سورج کے نکلنے کی سمت میں رخ کرتے رہے ہیں۔ مغربی دنیا کے مسیحیوں میں یہ روایت تقریباً کھوگئی ہے تاہم مشرقی (آرتھوڈکس) مسیحی کلیساؤں سے تعلق رکھنے والے عیسائیوں نے ابھی تک عبادت کے اجتماعی مواقع پر مشرق کی طرف رخ کرنے کی قابل احترام روایت کو باقی رکھا ہوا ہے۔[1]

مذہب اور قومی ریاست میں ہم آہنگی و ناہم آہنگی کا موضوع بہت اہم بھی ہے، تاریخی و سیاسی پس منظر بھی رکھتا ہے اور قابل غور بھی ہے۔ اس کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اس موضوع پر غیر جانبدارانہ مطالعے اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ مختلف مذاہب و ادیان سے تعلق رکھنے والے دانشوروں نے اس بارے میں متنوع نقطہ ہائے نظر ظاہر کیے ہیں۔ اس بحث میں فقط اہل مذاہب شریک نہیں بلکہ غیر مذہبی سیاسی، معاشی اور سماجی نظریات کے حامل دانش ور بھی شریک ہیں اور رہے ہیں۔ کمیونسٹ دانشوروں کی تحریروں کا اس حوالے سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ دانشورانہ اظہار خیال الگ بات ہے اور عملی زندگی الگ بات ہے۔ آج کی زمینی حقیقت یہی ہے کہ دنیا قومی ریاستوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر ریاست کا اپنا آئین اور قانون ہے، علاوہ ازیں ہر ریاست عالمی معاہدوں اور قوانین میں بھی جکڑی ہوئی ہے اور ہر ریاست کے شہری ان قوانین کے

---

1) http://malankaraorthodoxchurch.in/index.php?option=com content&task=view&id-407

مطابق زندگی گزار رہے ہیں یا گزارنے کے پابند ہیں۔ امریکہ میں مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والے رہتے ہیں۔ ان میں مسلمان بھی ہیں۔ وہاں کے مسلمان اپنی جمعیت اور وسائل کے اعتبار سے نہایت کمزور ہیں اور عملی طور پر اس سرزمین کے قانون پسند شہری ہیں۔ انھیں اس ریاست اور ریاست کے آئین کے لیے خطرہ ظاہر کرنا تعصب کے مرض کی نشاندہی کرتا ہے یا پھر سیاسی ضرورت کا مظہر ہے۔ جہاں تک کسی خلاف قانون حرکت کے ارتکاب کا مسئلہ ہے تو وہ کوئی بھی شہری کرسکتا ہے۔ کیا امریکہ کے اصلی اور قدیمی باشندے سارے کے سارے قانون پسند ہیں؟ اُن میں کوئی قاتل، دہشت گرد یا مجرم نہیں؟ کیا کسی ہندو نے بھارت کے باہر کسی ملک میں کبھی کوئی قانون شکنی نہیں کی؟ قانون پسندی اور قانون کا احترام ایک عمومی رویہ ہوتا ہے اور قانون شکنی ایک انفرادی اور استثنائی رویہ ہوتا ہے۔ استثنائی معاملے کو کلی شکل دینے کو کوئی صائب الرائے شخص درست قرار نہیں دے سکتا۔

۲۔۶۔۱۰۔ مساجد کا فلاحی کردار

مساجد جب سے قائم ہوئی ہیں ان کا معاشرے میں ایک بھرپور فلاحی کردار بھی ہے بلکہ جہاں پر یہ فلاحی کردار کمزور ہوتا ہے وہاں پر اہل علم و دانش مسجد کی انتظامیہ اور ذمہ داروں پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کردار عالم مشرق میں ہی نہیں بلکہ عالم مغرب میں بھی اسی طرح جاری و ساری ہے۔ ہالینڈ کے ایک صحافی مظفر سلطان لونگی الأ لوکۃ اپنی ایک رپورٹ میں ہالینڈ کی مساجد کے فلاحی کردار کو بیان کرتے ہیں۔ ان کی رپورٹ کا عنوان ہے ''اقتصادی بحران کے حل میں مساجد اہم کردار ادا کر رہی ہیں''۔ اس کے ذیل میں وہ لکھتے ہیں:

> ایک رپورٹ کے مطابق ہالینڈ میں مساجد کی طرف سے کیے جارہے رفاہی کاموں سے مقامی حکومت کو سالانہ 150 ملین یورو کا نفع پہنچ رہا ہے۔ رپورٹ میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ خدمت حکومت کے کسی تعاون کے بغیر ہی انجام دی جارہی ہے کیونکہ حکومت خود ہی اقتصادی بحران کا شکار ہے۔

رپورٹ میں مساجد کے کردار کو سراہتے ہوئے کہا گیا ہے کہ مسجدوں کی سرگرمیاں صرف ثقافتی پروگرام کے انعقاد تک محدود نہیں ہیں بلکہ مسجدیں رفاہی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ مسجدوں کی طرف سے سالانہ کم از کم 2600 وظیفے جاری کیے گئے ہیں جو حکومت کا بوجھ کم کرنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ ہالینڈ میں مساجد کی یہ کارکردگی اسلام کی اعلیٰ قدروں کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔

واضح رہے کہ ہالینڈ کی کل سولہ ملین آبادی میں مسلمان ایک ملین ہیں اور ملکی اقتصادیات میں فعال رول ادا کر رہے ہیں۔[1]

۲۔۶۔۱۱۔ تصویر کا دوسرا رخ

مسٹر وجے کمار نے سوئٹزرلینڈ میں مساجد کے میناروں پر پابندی کا ذکر اپنے نقطۂ نظر کی تائید کے طور پر کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سوئٹزرلینڈ میں جن گروہوں نے مذہبی جنونیت کو ابھار کر سادہ لوح عوام کو گمراہ کیا اور مساجد کے میناروں کی اس انداز کی تصویریں شائع کیں کہ میناروں کی جگہ میزائل بنا دیے۔ انھوں نے وجے کمار کی طرح سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ مسجدیں دہشت گردی کی علامت ہیں حالانکہ سوئٹزرلینڈ میں صرف دو مسجدیں ایسی تھیں جن کے مینار تھے۔ انھوں نے خود اپنے معاشرے کو انتہا پسندی کی طرف دھکیلا اور نفرتوں کو فروغ دیا۔ دنیا میں ایسے روشن فکر غیر مسلموں کی کمی نہیں جنھوں نے اس طرز عمل کی مذمت کی۔ ان میں یہودی اور عیسائی علماء اور دانشور بھی شامل ہیں۔ ایسے غیر مسلم بھی ہیں جو مساجد میں منعقد ہونے والی تقاریب میں شریک ہوتے ہیں۔ ان میں امریکہ میں موجود مساجد بھی شامل ہیں۔

دوسری طرف یہ امر بھی وجے کمار جیسے انتہا پسند اہل قلم کے لیے چشم کشا ہونا چاہیے کہ سوئٹزر لینڈ میں مساجد کے میناروں پر پابندی کی مہم کا آغاز کرنے والے سوئس پیپلز پارٹی کے سابق رہنما ڈینئل شریچ اسلام قبول کر کے مسلمان ہو گئے ہیں۔ شریچ نے اسلام قبول کرنے کے بعد سوئٹزرلینڈ میں ایک خوبصورت ترین مسجد تعمیر کرنے کا اعلان کیا ہے قبل ازیں انھوں نے مساجد کے ساتھ

---

[1]) http:www.akhbaroafkar.com/print.asp?lang=pr&aid=1779

میناروں کی تعمیر کیخلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی مہم چلائی۔ اس مہم کے نتیجے میں ان کو سوئس آرمی میں اعلیٰ عہدہ سے نوازا گیا۔ وہ کٹر عیسائی تھے۔ پابندی کے ساتھ چرچ جاتے بائبل کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے مسلمانوں کے خلاف جذبات ابھارنے میں بھی ان کا کردار بہت اہم رہا۔ انھوں نے مسلمانوں سے ان کے عقائد اور نظریات پر مناظرے بھی کیے۔ اس دوران میں اسلامی تعلیمات اور قرآن کریم کا تنقیدی مطالعہ شروع کیا تو وہ اسلام اور قرآن کی حقانیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ڈینل کا کہنا ہے کہ انھیں اسلام میں زندگی کے تمام اہم سوالات کے منطقی جوابات ملے ہیں جو انہیں عیسائیت میں نہیں مل سکے۔ اب وہ ایک باعمل مسلمان ہیں اور پانچ وقت نماز کی ادائیگی کے ساتھ باقاعدگی سے قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔ مساجد کے ساتھ میناروں کی تعمیر کے حوالے سے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اسلام کی عظمت میناروں اور گنبدوں کی مرہون منت نہیں۔ میناروں پر پابندی لگ سکتی ہے دلوں پر نہیں۔ انھوں نے اسلام اور مینار مخالف مہم کے جواب میں تحریک چلانے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔[۱]

۲۔۶۔۱۲۔ زیرو گراؤنڈ نیویارک میں مسجد کی تعمیر کے حق میں آواز

جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ مغرب میں وجے کمار سے مختلف نظریہ رکھنے والے افراد بھی موجود ہیں جو مسلمانوں کے لیے مسجد کی تعمیر کے حق کی حمایت کرتے ہیں اور مغربی معاشرے میں مسجد کے مثبت کردار کو سراہتے ہیں۔ اگست ۲۰۱۰ء میں نیویارک میں گراؤنڈ زیرو جہاں گیارہ ستمبر کا سانحہ پیش آیا، کے پاس مسلمانوں کے کمیونٹی سنٹر کی تعمیر کا معاملہ زیر بحث ہے۔ بہت سے مثبت فکر غیر مسلم امریکی مسلمانوں کی حمایت میں آواز اٹھا چکے ہیں۔ ان میں جولی کلاسن (Julie Clawson) بھی شامل ہیں۔

جولی کلاسن ایک امریکی عیسائی خاتون ہیں۔ وہ ''روزمرہ انصاف: ہمارے روزانہ انتخاب کا عالمی اثر'' کی مصنفہ ہیں۔ انھوں نے ''گراؤنڈ زیرو کے نزدیک مسلم کمیونٹی پر ایک عیسائی کا ردعمل''

---

[۱]) http://urdutahzeeb.net/current-affairs/news/ex-leader-of-swiss-people-party-denial-sharich-become-muslim

کے عنوان سے ایک بڑا پرتاثیر مضمون تحریر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے گراؤنڈ زیرو کے نزدیک مسلم کمیونٹی سنٹر جس میں مسجد بھی شامل ہے، کی تعمیر کی حمایت کی ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے نیو یارک سٹی کے میئر مائک بلوم برگ (Mike Bloomberg) کے نقطہ نظر کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے اس کمیونٹی سنٹر کی پرزور وکالت کی ہے۔ ہم ذیل میں جولی کلاسن کے مضمون کے چند اقتباسات پیش کر رہے ہیں:

> گذشتہ ہفتے نیو یارک سٹی کے میئر مائک بلوم برگ نے مقامی مذہبی گروہوں کے نمائندوں کے ساتھ کھڑے ہو کر یہ واضح کیا تھا کہ ''نیو یارک شہر میں کوئی محلہ ایسا نہیں ہے جہاں خدا کی محبت اور رحم کا داخلہ منع ہو۔'' گراؤنڈ زیرو کے نزدیک مسلم کمیونٹی پارک 51، جسے پہلے قرطبہ ہاؤس کا نام دیا گیا تھا، کی تعمیر کی حمایت کرنے والے عیسائی کی حیثیت سے مجھے بلوم برگ کے الفاظ میں خود اپنے گہرے دلی جذبات کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔۔۔
>
> بہت سے امریکی عیسائی ایسے ہیں جنھوں نے اس مرکز کے خلاف باتیں کی ہیں۔۔۔ اس مرکز کی حمایت میں بات کرنے پر بہت سے عیسائیوں نے مجھ پر شیطان کے کام کی حمایت کرنے کا الزام بھی لگایا۔۔۔ میں یہ تسلیم کرنے والا پہلا فرد ہوں گی کہ دیگر تمام مذاہب کے پیروکاروں کی طرح عیسائی بھی بعض اوقات پیار و محبت اور رحم دلی کے اُس راستے پر چلنے میں ناکام رہتے ہیں جو مسیح نے ہمیں دکھایا تھا۔۔۔ یہ یاد رکھنا بہت مشکل ہو سکتا ہے کہ ہم جس خدا کی عبادت کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ہم سے بہت بڑا ہے خدا کی محبت پر ہماری کوئی اجارہ داری نہیں ہے۔۔۔
>
> گیارہ ستمبر کے حملوں سے شروع ہو کر ابھی تک جاری سراسیمگی اور بدگمانی کی اس فضا میں میرا اکثر خوف اور انتقام کے رویوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

بدقسمتی سے بعض عیسائی یہ سمجھتے ہیں کہ دہشت گردوں کے افعال اسلام کے اصل مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔۔۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ جب عیسائی کہلانے والے لوگ کوئی بھیانک حرکت کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دلیل دینے والے بھی یہی لوگ ہوتے ہیں کہ اُن عیسائیوں کے افعال سارے عیسائیوں کی نمائندگی نہیں کرتے۔۔۔ لیکن یہ والی رعایت ہم اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کو نہیں دیتے۔۔۔

میں بھی بلوم برگ کی طرح یہ امید رکھ سکتی ہوں کہ کمیونٹی مرکز کی تعمیر سے اس کا مفاہمت کے لیے کام کرنے کا مقصد پورا ہوگا اور یہ اُس غلط اور گھناؤنے تصور کو دور کرنے میں مدد دے گا کہ گیارہ ستمبر کے حملوں کا کسی بھی طور اسلام کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔۔۔ میں اُن خاندانوں کی شکر گزار ہوں جو گیارہ ستمبر کو اپنے پیاروں سے محروم ہو گئے تھے اور انھوں نے مسلمانوں کی طرف سے اور پارک 51 کی حمایت میں آواز بلند کی ہے۔۔۔

میری دعا ہے کہ ہم بلوم برگ کے ان الفاظ پر دل سے عمل کریں: ''مسلمان بالکل اُسی طرح ہمارے شہر اور ہمارے ملک کا حصہ ہیں جس طرح کسی بھی دوسرے عقیدے کے لوگ ہیں اور کسی بھی دوسرے گروہ کی طرح مسلمان بھی لوئر مین ہیٹن میں کھل کر عبادت کر سکتے ہیں۔'' ہمیں اپنے اجتماعی ردعمل کو ایک ایسے رویے میں بدلنا چاہیے جو سب کے لیے مذہبی آزادی کی بنیادی اقدار کی عکاسی کرتا ہو۔[۱]

۱) www.commongroundnew.org

یہ مضمون مذکورہ بالا ویب سائٹ پر تیرہ اگست ۲۰۱۰ کو شائع کیا گیا۔

نوٹ: یہ مقالہ وجے کمار کی کتاب کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے 2010ء میں لکھا گیا۔

□

۲۔۷۔ مذہب اور عقل

۲۔۷۔۱۔ ''سنت'' ہے کہ دلہن پیدل چلے

ہمارے ایک عزیز کی شادی خانہ آبادی کی تقریب تھی۔ بارات جب دلہن لے کر واپس آ رہی تھی تو کچھ راستہ پیدل چلنا ضروری تھا چونکہ اس راستے پر کوئی گاڑی نہیں آ سکتی تھی۔ لہٰذا معمول کے مطابق دلہن کو لانے کے لیے ایک ڈولی (پالکی) کا انتظام کیا گیا تھا۔ بارات میں شریک کچھ افراد کا کہنا تھا کہ ''سنت'' کے مطابق دلہن کو پیدل چلایا جائے۔ ڈولی میں اسے لے کر جانا خلاف سنت اور بدعت ہے۔ دولہا اور دلہن کے گھر والے تو ڈولی پر راضی اور خوش تھے لیکن کچھ باراتیوں کا یہی موقف تھا، جو ہم نے ذکر کیا۔ یہ باراتی اپنی بات نہ مانے جانے پر شادی کی دیگر تقاریب میں شریک نہ ہوئے۔

۲۔۷۔۲۔ ''بدعت'' کی یہ تعریف ناقابل فہم ہے

ہمارے لیے یہ واقعہ بہت فکر انگیز تھا۔ ہم نے یہ سوچنا شروع کیا کہ کیا ہر وہ کام جو نبی پاکؐ کے زمانے میں نہیں ہوا یا جس انداز سے نہیں ہوا اسے اختیار کرنا بدعت قرار پائے گا؟ بدعت کی ایسی تعریف ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ ہم تو آج تک یہی سمجھتے تھے کہ مذہب کے نام پر کوئی ایسی چیز ایجاد کرنا جو مذہب کا حصہ نہیں ہے، بدعت ہے۔ اگر بدعت کا یہ مفہوم معاشرے میں رائج ہو جائے جس کا اظہار ڈولی کے مسئلے پر مذکورہ بالا گروہ نے کیا تو پھر پورا معاشرہ جامد ہو کر رہ جائے۔ پھر اس گروہ کو اپنے لباس پر بھی نظر ثانی کرنا چاہیے اور اپنی عصر حاضر کی سواریوں پر بھی۔ انھیں اپنی خوراک اور اس کے پکانے کے طریقے سے لے کر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے نتیجے میں وجود پانے والے سارے مظاہر پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہیے۔ ان کی تعریف کے مطابق تو پھر ان کی اپنی زندگی میں بدعتیں بہت زیادہ ہو جائیں گی اور سنتیں بہت کم رہ جائیں گی۔

۲۔۷۔۳۔عقل کی کیا حیثیت ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس فکری پس منظر میں یہ اہم سوال موجود ہے کہ دین ومذہب کے نزدیک عقل کی کیا حیثیت ہے۔مذہب شناسی اور معمولات زندگی میں عقل کا کردار کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے۔جب تک عقل انسانی کا درست کردار متعین نہیں ہوگا یہ اور ایسے مسائل جاری رہیں گے۔مذکورہ واقعے نے ایک ہی گاؤں کی آبادی کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ایک گروہ سنت کا طرف دار اور دوسرا بدعتی۔

ماضی میں ہمارے فقہا،شرعی حکم کی شناخت کے لیے جن منابع کو بروئے کار لاتے رہے یا جنھیں بروئے کار لانے کو درست سمجھتے رہے،ان میں قرآن وسنت کے بعد تمام تر یا بیشتر کی حیثیت عقلی منابع ہی کی ہے۔مثلاً اجماع، قیاس، استحسان،مصالح مرسلہ اور ایک گروہ کے نزدیک خود عقل بھی۔ان تمام مصادر یا منابع کی بنیاد عقل ہی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ایک گروہ نے ان میں سے کسی منبع کو قبول کیا اور کسی نے نہیں کیا لیکن کوئی ایسا گروہ نہیں جس نے بعض عقلی منابع کو حکم شریعت کو سمجھنے یا اخذ کرنے کے لیے قبول نہ کیا ہو۔

۲۔۷۔۴۔اندھی تقلید اور جمود

افسوس وقت کے ساتھ ساتھ جمود بڑھتا چلا گیا۔تقلید اور تقلید محض یا اندھی تقلید نے عقل کے سوتوں کو گویا خشک کردیا۔عقل کو بروئے کار لانے کی حدود فقط اپنے پسندیدہ اسلاف کے نقطہ نظر کو سمجھنے تک محدود ہوگئیں۔خود اسلاف نے تو عقلی منابع کو برتا لیکن پیروکاروں نے اس سلسلے میں اسلاف کی روش بھی ترک کردی۔

عقل کی حیثیت کا تعین دین کی بنیادی تعلیمات یا عقائد کو سمجھنے، انھیں قبول کرنے یا مسترد کرنے کے بارے میں بھی زیر بحث رہا اور احکام کی شناخت میں بھی۔یہ مسئلہ فقط مسلمانوں کو درپیش نہیں رہا بلکہ غیر مسلموں میں بھی ہمیشہ معرکۃ الآرا رہا ہے۔اگر یہ مسئلہ فقط ایک یا چند احکام سے متعلق ہوتا تو ہم اسے اپنی ترجیحات بحث میں شامل نہ کرتے۔ہمارے نزدیک عقل کا مسئلہ بہت اہم ہے اور ہمارے معاشرے میں عقل گریز رویے نے جو گل کھلائے ہیں وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اہل علم و دانش کو یہ دعوت دیں کہ وہ مل بیٹھ کر نئے سرے سے عقل اور مذہب کے تعلق پر غور وفکر کریں۔

۲۔۷۔۵۔ عقل اور معرفت انسان

یہ دعوت خود معرفت انسان سے بھی مربوط ہے اور ذرائع علم سے بھی اور وہاں سے چلتے چلتے احکام شناسی تک اس کی بازگشت جاتی ہے۔

۲۔۷۔۶۔ عقل اور مسیحی دانشور

غیر مسلموں کے ہاں بالخصوص مسیحی دنیا میں عقل اور مذہب کا تعلق بہت زیادہ زیر بحث رہا ہے۔ جب تثلیث اور اللہ کی جسمانیت کے بارے میں مسیحیت کو بنیادی سوالات کا سامنا کرنا پڑا تو بہت سے مسیحی دانشوروں نے کہا کہ انسانی عقل محدود ہے اور معرفت کے لیے اس کی قوتیں محدود ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی عقل محدود ہے لیکن یہ بات کہہ کر مسیحی دانشور اپنے عقائد کی بنیادوں پر اٹھنے والے سوالات کے سامنے ایک خوشنما پردہ حائل کرنا چاہتے ہیں۔

توماس آکیوناس کا کہنا ہے کہ تثلیث اور جسمانیت کے بارے میں وحی کی مدد کے بغیر عقل کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں۔ اس کے الفاظ میں:

> ''خدا، تثلیث یا خلقت کائنات کے حقائق کے کشف اور ان تک رسائی وحی کی مدد کے بغیر عقل کے لیے ممکن نہیں۔''
>
> سینٹ آگسٹن کہتا ہے: ''وجود خدا کے بارے میں علم فقط مسیح کے ذریعے ممکن ہے۔ ایسے موضوعات ہیں کہ جنھیں عقل کے ذریعے کشف کیا جا سکتا ہے (فلسفی مطالب) لیکن علم دین کے حصول کے لیے اسفار کتب مقدس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔''
>
> گلسن نے نقل کیا ہے: ''عقل ناگزیر طور پر محسوس کی طرف رخ کرتی ہے اور یہ امر اس دنیا میں اس کی موجودہ زندگی کا لازمہ ہے، اس لیے کہ پہلی معصیت نے طبع انسانی کو نقصان پہنچایا ہے لیکن اسے بکھیر نہیں دیا۔''

۲۔۷۔۷۔ عقل اور مسلمان دانشور

البتہ ایسے مسیحی دانشور بھی ہیں جو عقل اور وحی کے مابین ہم آہنگی کے قائل ہیں۔ یہی معاملہ

مسلمان دانشوروں میں بھی رہا ہے۔ چنانچہ قاضی ایجی کا معروف قول ہے:

''عقل حسن وقبح کا ادراک نہیں کرسکتی۔''

فخر رازی جو باقی تمام امور میں عموماً عقلی رویہ رکھتے ہیں رؤیت خدا کے بارے میں کہتے ہیں:

''ہم دلیل منقول کی بنیاد پر رؤیت خدا کو ممکن جانتے ہیں۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم دلیل منقول یعنی نص قرآنی کی بنیاد پر خدا کو دیکھ سکتے ہیں۔''

شہرستانی کہتے ہیں:

''اشاعرہ کی نظر میں واجبات سمعی ہیں۔ شکر منعم، اطاعت گزاروں کی جزاء گناہگاروں کی سزا شرع کی وجہ سے واجب ہے، عقل کی وجہ سے نہیں۔''

اس گروہ کے مقابل تاریخ میں ایک اور گروہ رہا ہے جسے معتزلہ کہتے ہیں۔ یہ عقل کی طرف میلان رکھنے والوں کا کلامی فرقہ ہے۔ عقائد میں تو یہ اہل سنت ہی کا ایک گروہ ہے، تاہم اہل حدیث اور اشعری نظریات رکھنے والوں سے اس کی فکر مختلف رہی ہے۔ یہ ایسے فکری گروہوں میں سے ہے جو عقل و وحی کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

ابو حامد غزالی نے تو فلاسفہ کے خلاف اپنی معروف کتاب تہافت الفلاسفہ لکھی ہے۔ انھوں نے ابن سینا جیسے بعض فلاسفہ جو حشر جسمانی کو عقلاً ممکن نہیں جانتے کے خلاف سخت نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ عقل اس سے کہیں عاجز تر ہے کہ وہ قوانین دین کی جزئیات کے مقابل ٹھہر سکے۔ دوسری طرف ابن رشد اور بوعلی سینا جیسے لوگ عقلی نقطۂ نظر سے عقائد و احکام پر غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ ابن رشد عقل و مذہب کے مابین توافق کی کیفیت پر اس طرح سے استدلال کرتے ہیں:

''وحی نے عقلی لحاظ سے غور و فکر کرنے کو نہ فقط حرام قرار نہیں دیا بلکہ ایسا کرنے کو کہا ہے، اس لیے کہ یہ شریعت کے تکلیفی احکام میں سے ہے کہ لوگ ماہیت موجودات کے بارے میں تحقیق کریں۔''

اس کے بعد وہ قرآن کی ان آیات کو پیش کرتے ہیں جو اسی مضمون پر دلالت کرتی ہیں۔ پھر

اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ اس لیے کہ ماہیت موجودات کے بارے میں تحقیق کرنے سے انسانوں کا ذہن صانع کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ فلسفے کا کام بھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس طرح واضح ہوگیا کہ فلسفہ شرعاً واجب ہے یا مستحب۔''

فارابی کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا فلسفی ہے جس نے اپنے فلسفی مباحث میں نبوت پر بات کی ہے۔

۲۔۷۔۸۔ اندھی تقلید اور عالم اسلام کی مشکلات

ہماری اس ساری گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عقل کے مذہب کے حوالے سے دائرہ کار پر بحث ادیان و مذاہب کا ایک موضوع رہی ہے۔ عصر حاضر میں اسلاف اور اکابر پرستی کی اندھی روش نے عالم اسلام کو بہت مشکلات سے دوچار کر رکھا ہے۔ حرفیت پسندی نے رفتہ رفتہ انتہا پسندی اور پھر آگے بڑھ کر دہشت گردی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اسلامی معاشرے اور اسلامی ممالک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ اس کی سیاسی وجوہات بھی ہیں، عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں بھی اس میں شریک قرار دی جاسکتی ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی ایک بھاری اکثریت کی سطح بینی نے دشمنوں کے لیے ہموار زمین کا کردار ادا کیا ہے۔

ہمارے بہت سے مذہبی دانشور جو کھل کر تو اس موضوع پر بات نہیں کرتے لیکن جب وہ احکام کا فلسفہ بیان کرنے پر آتے ہیں تو گویا احکام کے پیچھے عقلی دلائل ہی تلاش کر رہے ہوتے ہیں یا پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ آگے بڑھ کر عقل کے کردار کے تعین پر بات کرنے کے لیے کم ہی آمادہ ہوتے ہیں۔ شاید وہ جامد فکر لوگوں کے اثر و رسوخ سے خوفزدہ ہیں، یا ممکن ہے خود ان کی عقل آنسلم قدیس کی طرح بس یہ کہنے پر اکتفاء کرتی ہے:

''میں اس کے درپے نہیں کہ سمجھوں اور پھر ایمان لاؤں بلکہ میں ایمان لاتا ہوں تاکہ سمجھ سکوں۔''

□

۲۔۸۔مذہب اور شاعری

۲۔۸۔۱۔بھگوت گیتا سے چند کلمات

''میں جہالت کے گہرے اندھیرے میں پیدا ہوا اور میرے روحانی گرو
نے گیان کی روشنی سے میری آنکھیں کھولیں۔میں ان کو عقیدت و احترام
کے ساتھ نمسکار پیش کرتا ہوں۔''

''اے میرے پیارے کرشن، آپ بیکسوں کے دوست ہیں اور تخلیق کا
سرچشمہ ہیں۔آپ گوپیوں کے سوامی اور رادھارانی کے پیارے ہیں۔
میں آپ کو عقیدت و احترام کے ساتھ نمسکار پیش کرتا ہوں۔''

یہ بھگوت گیتا کے چند شعروں کا ترجمہ ہے جو دھنن جے داس نے کیا ہے۔اگر کوئی انھیں آج کی رسا اردو میں ترجمہ کرتا تو ہمارے اردو قارئین کے لیے ان کی روح تک پہنچنا آسان ہو جاتا۔ آئیے پہلے پیرے کو نئے سرے سے پڑھتے ہیں:

''میں جہالت کے گہرے اندھیرے میں پیدا ہوا اور میرے روحانی مرشد
نے معرفت کی روشنی سے میری آنکھیں کھولیں۔میں ان کو عقیدت و
احترام کے ساتھ سلام پیش کرتا ہوں۔''

ہمارے ہاں کی مذہبی زبان کے جاننے والے اب اس شعر کی روح کے یقینی طور پر قریب ہو گئے ہوں گے۔

۲۔۸۔۲۔مذہبی کتابیں اور شاعری

قدیم مذہبی کتابوں میں سے بعض سراسر عرفانی شاعری پر مشتمل ہیں۔ان میں حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور بھی شامل ہے۔بھگوت گیتا کب متشکل ہوئی اور اس کا تاریخی پس منظر کیا ہے، اس

سے قطع نظر جب اس کے متن اور مطالب پر راقم کی نگاہ پڑی تو اس نے اپنی طرف جذب کر لیا۔ یہ ایک عارف کے سینے سے پھوٹنے والے گیتوں پر مشتمل معلوم ہوتی ہے۔

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب اللہ کا ذکر کرتے تھے اور جب اسے پکارتے تھے تو پہاڑ اور پرندے بھی ان کے ہم نوا ہو جاتے تھے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ۝ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ [1]

ہم نے پہاڑوں کو ان کے لیے مسخر کر دیا تھا جو رات دن اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے، پرندے بھی سمٹ آتے تھے اور سب اس کی تسبیح کرتے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کو قرآن حکیم نے زبور کا نام دیا ہے، اسے مزامیر بھی کہتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے اور زبور عبرانی زبان میں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شاعری کی زبان میں تھی اور مناجات پر مشتمل تھی اور تورات کے بعد نازل ہوئی۔ اس میں موسیقی کے کئی قدیمی آلات کا بھی ذکر آیا ہے اور جیسے صوفیانہ اور عرفانی شاعری کی زبان میں ہوتا ہے، اس میں اللہ کی ستائش کے لیے موسیقی اور رقص کی اہمیت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

شیخ سعدی کہتے ہیں:

آتشی از سوز دل در دل دائود بود
تا به فلک می رسد بانگ مزامیر او

سوز دل کی آگ داؤد کے دل میں تھی۔ اسی لیے ان کے مزامیر کی آواز آسمان تک جا پہنچی۔

۲۔۸۔۳۔ اسلام اور شاعری

قرآن حکیم نے اگرچہ سورہ شعراء میں شاعروں کی خاص صفات بیان کرتے ہوئے ایسے شاعروں کی مذمت کی ہے جو ان صفات کے حامل ہیں لیکن اس کے بعد ایمان والوں کے لیے

---

[1] ص: ۱۸ و ۱۹

استثنا بھی موجود ہے۔ دوسری طرف نبی پاکؐ کے لیے فرمایا گیا ہے:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهٗ [۱]

اور ہم نے انھیں شعر نہیں سکھایا اور نہ ان کے لیے یہ مناسب ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ کی خدمت میں حضرت حسانؓ بن ثابت موجود رہتے تھے اور بوقت ضرورت آپؐ انھیں شعر کی زبان میں جواب دینے یا کسی امر پر اظہار کرنے کے لیے کہتے تھے۔ اسی طرح سے آپؐ کے چچا حضرت ابوطالبؑ سے منسوب ایک دیوان موجود ہے جس میں خود آنحضرتؐ کی مدحت میں اشعار موجود ہیں اور ان میں بعض اشعار کا آپؐ ذکر بھی کیا کرتے تھے۔ حضرت علیؑ سے منسوب بھی ایک دیوان موجود ہے۔ آپؐ کے صحابہ کرامؓ میں اور بھی بلند پایہ شعرا تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس شاعری کی قرآن حکیم میں مذمت کی گئی ہے وہ کچھ اور ہے، نہ یہ کہ کلام موزوں کی ممانعت کی گئی ہے۔ البتہ یہ موضوع پہلودار ہے اور وسعت رکھتا ہے اور یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

۲۔۸۔۴۔ عرفا اور شاعری

صدر اسلام کے بعد پھر اگلی صدیوں میں تو اعلیٰ مذہبی شاعری معرض وجود میں آئی ہے۔ مذہبی شاعری کے بھی بہت سے رخ ہیں لیکن ہم یہاں زیادہ تر مزامیر داؤد کے ہم افق شاعری کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ مولانا روم کی شاعری ایسی ہی شاعری کا ایک نادر اور اعلیٰ نمونہ ہے۔ شیخ بہائی نے جس کے بارے میں کہا ہے:

مثنوی مولوی معنوی
هست قرآن در زبان پهلوی
من نمی گویم که آن عالی جناب
هست پیغمبر ولی دارد کتاب
مثنوی او چو قرآن مدل
هادی بعضی و بعضی را مضل

---

۱) یٰسٓ: ۶۹

مولانا رومی کی مثنوی معنوی پہلوی زبان میں قرآن ہے۔
میں نہیں کہتا کہ وہ عالی جناب یعنی مولانا رومی پیغمبر ہیں لیکن وہ حامل کتاب ضرور ہیں۔
ان کی مثنوی قرآن کی طرح بادلیل ہے، بعض اس سے ہدایت پاتے ہیں اور بعض گمراہ ہوجاتے ہیں۔
شیخ بہائی کا آخری شعر قرآن حکیم کی اس آیت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ

بہت سے لوگ اس سے گمراہ ہوجاتے ہیں اور بہت سے ہدایت پاتے ہیں اور اس سے گمراہ ہونے والے فقط فاسق ہی ہیں۔[1]

علامہ اقبال نے بھی تھوڑے سے تصرف کے ساتھ شیخ بہائی ہی کا شعر ایک اور انداز سے کہا ہے:

شاعری کو همچو آن عالی جناب
نیست پیغمبر ولی دارد کتاب

برصغیر کے صوفی شعراء نے تو ایسے ایسے مضامین باندھے ہیں اور اس انداز سے عارفانہ مطالب بیان کیے ہیں کہ جن کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ چنانچہ حضرت سلطان باہو کہتے ہیں:

جے رب نہاتیاں دھوتیاں ملدا ملدا ڈڈواں مچھیاں ہو
جے رب ملدا مون منایاں ملدا بھیڈاں سسیاں ہو
جے رب جتیاں ستیاں ملدا ملدا ڈانڈاں خصیاں ہو
رب اوہناں نوں ملدا باہو نیتاں جنہاں اچھیاں ہو

تزکیہ نفس کے حوالے سے عرفاء کی یہ تعلیم نہایت گہرائی کی حامل ہے۔ اسی طرح عشق الٰہی میں استغراق کی حقیقت حضرت بابا بلھے شاہ کے اس کلام میں جھلکتی ہے:

[1]) بقرہ:۲۶

رانجھا رانجھا کردی ہن میں آپے رانجھا ہوئی
سدو مینوں ''دھیدو رانجھا'' ''ہیر'' نہ آکھو کوئی
رانجھا میں وچ، میں رانجھے وچ، ہور خیال نہ کوئی
میں نہیں اوہ آپ ہے، اپنی آپ کرے دلجوئی

ہوسکتا ہے بعض ماہرین اسے وحدت الوجود کے فلسفے کی طرف اشارہ سمجھیں بہرحال ہمارے نزدیک یہ استغراق کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت خواجہ غلام فرید توحید کی حقیقت اور کثرت میں توحید کے جلووں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ حضرت عشق مجازی
سب راز رموز دی بازی
سھو شاہد اصلی جانی
ہے واحد پرم کہانی
ہے وحدت سمجھ سنجانی
وچ پردے کثرت سازی

پروفیسر حمید اللہ ہاشمی نے ان ابیات کا اردو ترجمہ یوں کیا ہے:

سبحان اللہ یہ عشق مجازی بھی کیا عجیب چیز ہے جس میں تمام تر راز رموز کا کھیل ہے۔
سب کو محبوب سمجھنا اور اسے اس وحدہ لاشریک کی پریم کہانی تصور کرنا،
کثرت تو ایک پردہ ہے، اصل میں تو وحدت ہے جو ہر جگہ نور افشاں ہے۔[1]

عصر حاضر میں ایسی شاعری خال خال ہی دکھائی دیتی ہے۔ تاہم اردو زبان چونکہ عربی، فارسی، پنجابی اور سرائیکی جیسی قدیم زبانوں کی نسبت بہت نئی ہے اور اعلیٰ عارفانہ کلام اور روحانی

[1] دیوان خواجہ غلام فرید، پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج، آرٹ اینڈ کلچر، ص ۵۸۴و۵۸۵

عاشقانہ واردات کو بیان کرنے کے لیے زبانوں کو بہت طویل سفر طے کرنا پڑتا ہے، اس کے باوجود بعض جدید صوفیاء کے ہاں بھی ایسی شاعری کا سراغ مل جاتا ہے چنانچہ ذہین شاہ تاجی کی یہ معروف غزل جسے عابدہ پروین نے گایا ہے، اس کے ایک نمونے کے طور پر ذکر کر کے اس گفتگو کو ختم کیا جاتا ہے:

جی چاہے تو شیشہ بن جا، جی چاہے پیمانہ بن جا
شیشہ پیمانہ کیا بننا، مے بن جا، میخانہ بن جا
مے بن کر، میخانہ بن کر، مستی کا افسانہ بن جا
مستی کا افسانہ بن کر، ہستی سے بیگانہ بن جا
ہستی سے بیگانہ ہونا، مستی کا افسانہ بننا
اس ہونے سے، اس بننے سے، اچھا ہے دیوانہ بن جا
دیوانہ بن جانے سے بھی، دیوانہ ہونا اچھا ہے
دیوانہ ہونے سے اچھا، خاکِ درِ جاناناں بن جا
خاکِ درِ جاناناں کیا ہے، اہلِ دل کی آنکھ کا سرمہ
شمع کے دل کی ٹھنڈک بن جا، نورِ دلِ پروانہ بن جا
سیکھ ذہین کے دل سے جلنا، کاہے کو ہر شمع پہ جلنا
اپنی آگ میں خود جل جائے، تو ایسا پروانہ بن جا

۲۔۹۔علم اور اسلام

۲۔۹۔۱۔عصرِ اسلام......عصرِ علم

ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ رسول اسلامؐ کی بعثت سے ماقبل کے زمانے کو دورِ جاہلیت کہا جاتا ہے۔گویا اسلام کا دور،عقل وخرد اور علم وآگہی سے عبارت ہے۔قرآن حکیم نے بعثت پیغمبر کا مقصد بتاتے ہوئے ان دونوں پہلوؤں کو خوبصورتی سے ذکر کیا ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ[۱]

وہ اللہ وہی ہے جس نے امیوں میں انھیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیا۔(یہ پیغمبر) انہیں اللہ کی آیات سناتا ہے،انہیں پاکیزہ کرتا ہے نیز انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے جبکہ قبل ازیں یہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت میں دورِ جاہلیت کو ''کھلی گمراہی'' کے دور سے تعبیر کیا گیا ہے،جبکہ نبی پاکؐ کو اسی واضح گمراہی کا خاتمہ کرنے کے لیے جدوجہد کرنا تھی۔انہوں نے اللہ کی آیات اور کائنات میں پھیلی ہوئی اس کی علامتوں کی طرف انسانوں کو متوجہ کیا۔ان کے ظرف کو پاک کر کے انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی۔اگر ہم ان آیات کی طرف توجہ دیں جنھیں معروف طور پر پہلی نازل شدہ آیات کہا جاتا ہے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ عصرِ اسلام،عصرِ علم ہی سے عبارت ہے اور آغازِ دورِ بعثت،دراصل پڑھنے،پڑھانے،کتاب وقلم اور دانش وبینش کا آغاز ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ

۱) جمعہ۔۲

وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ O الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ O عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ O[۱]

اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھیے جس نے خلق کیا۔ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھیے کہ آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی اور انسان کو وہ تعلیم دی جسے وہ نہ جانتا تھا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ جس انقلاب کا علم لے کر اٹھے وہ تعلیم و تعلّم کا انقلاب تھا۔ وہ علم و دانائی کا انقلاب تھا۔ ضلالت و گمراہی کی جگہ ہدایت و فلاح اور جہالت و نادانی کے بجائے عقل و دانش کے دور کا آغاز، انقلاب اور حقیقی انقلاب نہیں تو اور کیا ہے!

۲۔۹۔۲۔ حضرت انسان کے حضور ملائک کا سجدہ

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حضرت انسان کے حضور سجدہ ریزہ ہونے کا حکم دیا۔ انسان کو فرشتوں کے سجدے کا اہل، علم ہی کی برتری کی بنیاد پر قرار دیا گیا۔ اس سلسلے میں قرآن کی یہ آیات گہرے غور و فکر کی متقاضی ہیں۔

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ O قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ O قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔۔۔[۲]

اور آدم کو سب ناموں کی تعلیم دی پھر انھیں ملائکہ کے سامنے پیش کر دیا۔ پھر (اللہ نے) فرشتوں سے کہا: اگر تم سچے ہو تو ان ناموں کی خبر دو۔ وہ کہنے لگے: تو پاک ہے جو کچھ تو نے ہمیں بتایا ہے اس کے علاوہ ہمارا علم کچھ نہیں۔ بے شک تو علیم و حکیم ہے (اب اللہ نے آدم سے) کہا: اے آدم! تم انھیں ان (چیزوں) کے ناموں کی خبر دو۔ پس جب اس نے انھیں ان کے

---

۱) علق۔۱۔۵

۲) بقرہ۔۳۱تا۳۳

ناموں کی خبر دے دی تو (اللہ نے) کہا: کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں ہی آسمانوں اور زمین کے چھپے رازوں کو جانتا ہوں۔

ان آیات سے نہ صرف آدم کی علمی برتری ظاہر ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ملائکہ کا علم جامد ہے اور آدم کا علم ارتقاء پذیر اور کمال آفریں۔ یہی وجہ ہے کہ ملائکہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو صرف وہی پتہ ہے جو کچھ تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ تورات میں آدم کے جنت سے نکلنے کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے نیک و بد کی معرفت کے درخت سے کچھ کھالیا تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس علم و معرفت کے درخت سے کچھ کھانے سے منع کیا تھا جبکہ قرآن حکیم نے اس نظریے کی درستی کی ہے اور انسانی فضلیت کی وجہ ہی علم و معرفت کو قرار دیا ہے بلکہ قرآن تو کہتا ہے کہ نیک و بد کی تمیز اللہ نے ہر انسان کے وجدان میں رکھ دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا [1]

پس انسانی نفس کو ہم نے اس کے لیے بدی اور نیکی قرار پانے والے امور کی راہنمائی کی۔

۲۔۹۔۳۔قرآن اور علم و علماء کی فضیلت

علم اور علماء کی فضیلت کو قرآن حکیم نے طرح طرح سے بیان کیا ہے اور حصول علم کے لیے تشویق و ترغیب کا انداز اختیار کیا ہے۔ انسانی وجدان کو جھنجوڑنے کے لیے فرمایا گیا ہے:

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَیَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ

کہیے: کیا علم والے اور بے علم آپس میں برابر ہیں؟ متوجہ تو عقلمند ہی ہوتے ہیں۔ [2]

---

۱) الشمس، ۸

۲) زمر ۹

ایک اور مقام پر تو یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے صرف علماء ہیں:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا [۱]

اللہ سے ڈرنے والے اس کے بندوں میں سے صرف علماء ہیں۔

اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کیونکہ اس کی کبریائی، اس کی عظمت اور اس کی قدرت کا احساس اہل علم کے ہی دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ جو لوگ ذرے ذرے میں غور کر کے اس کے قدرتوں کا پتہ لگاتے ہیں، جو پتے پتے کا مطالعہ کر کے اس کے جلال و جمال کے راز معلوم کرتے ہیں، جو لوگ کائنات کی پہنائیوں پر نظر ڈال کر اس کی عظمتوں کا اندازہ کرتے ہیں، جن بندوں کے سینوں سے دانش و ہوش کے سوتے پھوٹنے لگتے ہیں وہی اس کی کبریائی کے سامنے سرافگندہ ہو سکتے ہیں۔ وہی عبد و معبود کے رشتے کو پہچان سکتے ہیں وہی خشوع و خضوع کی لذت سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔

رسول کریمؐ نے بھی علم اور طلب علم کی فضیلت مختلف انداز سے بیان فرمائی ہے کہ اس طرح سے پڑھنے اور سننے والوں کے اندر حصول علم کے لیے ایک اشتیاق پیدا ہو جائے۔ آپ کا یہ فرمان تو ہر مسلمان کی زبان پر ہے:

طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة [۲]

علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

طالب علم کی عظمت اور امتیاز کو آپؐ نے ایک مقام پر یوں بیان فرمایا ہے:

طالب العلم بین الجهال کالحی بین الاموات [۳]

جاہلوں کے درمیان طالب علم کی مثال ایسی ہے جیسے مردوں کے درمیان زندہ۔

یہ بہت خوبصورت اور معنی خیز حدیث ہے۔ گویا رسول اسلامؐ کی نگاہ میں جہالت موت سے عبارت ہے اور طلب علم حیات کی علامت ہے۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں ہونا چاہیے چونکہ جب

۱) فاطر۔ ۲۸

۲) غوالی اللئالی ج۔ ۲ بحار الانوار، ج۔ ۱

۳) کنز العمال بحار الانوار، اج۔ ۱

انسان کو دیگر مخلوقات پر فضلیت ہی علم و خرد کی وجہ سے ہے تو پھر دانائی کی خواہش کا انسانی ضمیر سے خاتمہ انسان کے اندر سے فضلیت کی روح کا خاتمہ ہے۔ یہ انسان کی اپنی حیثیت کی موت ہے۔ علم کی آرزو سے خالی وجودِ انسانی وجود تو نہیں رہتا اگر چہ دیکھنے میں وہ ایک چلتا پھرتا انسان کیوں نہ ہو۔ اس کے اندر کا انسان تو گویا مر چکا ہے۔

۲۔۹۔۴۔ مشاہدہ و تجربہ کی حیثیت

یہاں ہمیں اس سوال کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ قرآن حکیم نے کس طرح کے علم کے حصول کی دعوت دی ہے اور اس کی نظر میں علم کے سرچشمے کون کون سے ہیں؟

اس کے لیے ہم قرآن حکیم میں دیکھتے ہیں تو سب سے زیادہ وہ آفاق و انفس کی آیات پر غور فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کبھی اختلافِ لیل و نہار کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کبھی چاند، ستاروں اور کہکشاؤں پر غور فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کبھی آسمانوں اور زمین کی خلقت کا ذکر کرتا ہے، کبھی پہاڑوں کی گرانی و ہیبت کی نشاندہی کرتا ہے، کبھی بحر و بر میں اپنی آیات کا تذکرہ کرتا ہے یہاں تک کہ اونٹ بلکہ مچھر تک کا ذکر بھی دعوت فکر کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ سب آفاق و انفس میں اللہ کی نشانیاں ہیں انھیں کے مطالعے اور ان پر غور فکر سے انسان حق کو پہچانتا ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ[1]

ہم جلد تمام آفاق میں اور خود ان کے نفسوں میں انہیں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تا کہ ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ وہ برحق ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشاہدہ اور تجربہ قرآن کی نظر میں حصول علم کا ایک قابلِ اعتماد ذریعہ ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن نے محسوسات کو حصول علم کی ایک بنیاد اور ذریعے کے طور پر نہ فقط تسلیم کیا ہے بلکہ ان سے کام لے کر حقائق عالم تک رسائی پر زور دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اسلامؐ نے جس نئی تہذیب کی بنیاد رکھی وہ ماقبل کی خستہ و شکستہ تہذیبوں پر جلد ہی غالب آ گئی۔ اس نئی تہذیب کے بطن سے نئے نئے علوم نے جنم لیا۔ علم و

۱) فصلت۔ ۵۳

دانش کے سوتے پھوٹے۔حکمت کا نور پھیلا۔پوری دنیا کو مختلف علوم سے اسی تہذیب کے فرزندوں نے روشناس کروایا۔جمود کو اسی تہذیب نے توڑا اور دانش گاہوں سے مختلف سرزمینوں کو آباد کیا۔ڈوبتی ہوئی کہنہ تہذیبوں کے متاع کو بھی فرزندان اسلام نے بچایا اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے ایک نیا جہانِ دانش بھی آباد کیا۔

۲۔۹۔۵۔قرآن اور تاریخ کا مطالعہ

قرآن حکیم نے تاریخ کو بھی انسانی ارتقا کے ایک زینے کے طور پر متعارف کروایا ہے۔اس نے پاک دلوں کو بھی الٰہی حکمتوں کا خزینہ قرار دیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے آسمانی وحی کو ہر مرحلے میں، جہاں انسان کی عقل نارسا قرار پائے، ہدایت کا چراغ قرار دیا ہے۔آج نوع انسانی کے لیے وحی کا آخری کامل اور محفوظ مرجع اللہ کی کتاب،قرآن حکیم ہے۔

۲۔ ۱۰۔ مغرب اور علوم انسانی

۲۔۱۰۔۱۔ پس منظر

مغرب میں علم کی روایت کو عام طور پر قبل از مسیح کی یونانی علمی روایت سے مربوط کیا جاتا ہے۔ جہاں تک یونان میں مختلف مکاتب فکر کا تعلق ہے تو اسے ایک اعتبار سے دو بنیادی نظام ہائے فکر میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک سوفسطائیوں کا نظام فکر اور دوسرا ارسطو اور افلاطون کا نظام فکر۔

تاہم اگلے مرحلے میں یونانی فلسفہ مسیحی الٰہیات میں تبدیل ہو گیا۔ مسیحی الٰہیات کے کردار کو مغرب کے علوم انسانی کی تشکیل اور ظہور میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وگرنہ تاریخی لحاظ سے علوم انسانی کے بہت سے مسائل قابل فہم نہ ہوں گے۔ مسیحی الٰہیات (Christian Theology) اپنے آپ کو ایسے علم کے طور پر پیش کرتی ہے جس کا موضوع ایمان ہے۔ یہی ایمان رفتہ رفتہ مذہبی پیشوائیت کے افکار کی حتمیت کی شکل اختیار کر گیا۔ اس مرحلے میں عقل و خرد، بحث و مباحثہ اور مذاکرہ کی گنجائش ختم ہو گئی۔ اس کا نتیجہ پہلے تو فکری جمود کی صورت میں نکلا اور پھر آزاد اندیشوں کے لیے استبداد اور تشدد کی صورت میں آخر کار ایک بغاوت پیدا ہوئی اور گھن کے ساتھ گیہوں بھی پس گیا۔ یہاں سے ایک نیا تصور کائنات ابھرا جو علوم کی بنیاد کو تجربی قرار دیتا ہے۔ لیکن انسان اور اس کا معاشرہ اتنا سادہ نہیں کہ اسے ریاضی کے فارمولوں کی طرح سمجھ لیا جائے۔ روشن فکری اور آزاد اندیشی نے ایک نئے جہان کی تخلیق شروع کی۔ کائنات اور انسان کی شناخت کو نئی فلسفی بنیادیں عطا ہونا شروع ہوئیں اور پھر نئے علوم ابھرنے لگے۔ معاشروں کی تشکیل نو نے بھی علم کے نئے نئے موضوعات کا تقاضا کیا۔ نئی یونیورسٹیاں اور نئی دانشگاہیں معرض وجود میں آئیں جن میں علوم کے نئے نئے شعبے قائم ہونے لگے۔

۲۔۱۰۔۲۔علم کی تعریف

یہاں ذرا رک کر یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ تصور کائنات کے اختلاف سے علم کی تعریف، موضوعات اور حدود بھی مختلف ہو جاتی ہیں۔

بنیادی طور پر علم کا اطلاق ہر آگاہی پر ہوتا ہے۔ عالم دراصل اسے کہتے ہیں جو جاہل نہ ہو۔(ورنہ مطلق طور پر کسی کو عالم کہنا شاید مناسب نہ ہو)۔ اس لحاظ سے علم کی تعریف میں تمام انسانی علوم شامل ہو جاتے ہیں، چاہے وہ تجربے کی دنیا سے تعلق رکھتے ہوں اور چاہے فکر ونظر کی دنیا سے۔ اس اعتبار سے ریاضیات، فلسفہ، طبیعیات، سوشیالوجی، نفسیات، معاشیات وغیرہ سب علوم ہیں۔ انگریزی میں (Knowledge) کا لفظ ہمارے لفظ ''علم'' کا مترادف ہے۔

البتہ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ ''علم'' فقط ان معلومات یا دریافتوں پر اطلاق رکھتا ہے جو بلاواسطہ تجربے کے ذریعے سے حاصل ہوں۔ اس تعریف کے اعتبار سے فلسفہ، منطق، اخلاق، فقہ، علم کلام اور عرفان علم کی حدود سے باہر ہو جائیں گے البتہ ہمارے ہاں پھر اسے علم نہیں بلکہ سائنس سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگرچہ عربی اور فارسی میں سائنس کا ترجمہ علم ہی کیا گیا ہے۔ ہم یہاں اردو میں سائنس کے رائج مفہوم پر بات کر رہے ہیں۔

۲۔۱۰۔۳۔علوم انسانی کی تعریف

علم کے اسی تصور کو سامنے رکھتے ہوئے علوم انسانی کی تعریف میں بھی یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیا علوم انسانی میں انسان، عالم طبیعت اور عالم ماورائے طبیعت سے متعلق تمام علوم شامل ہیں یا انسان اور عالم طبیعت ہی اس کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔

خود اس سوال کا جواب معرفت انسان اور تصور کائنات سے مربوط ہے۔ البتہ ماورائے طبیعت کو علم کی دسترس یا علم کی حدود میں سمجھنے والا کوئی دانشور عالم طبیعت سے متعلق علوم کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ علمِ معرفت یا ذرائع علم کی بحث میں اہل دانش نے اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ امام باقر الصدر کی کتاب فلسفتنا، استاد مطہری کی کتاب مسئلہ شناخت اور استاد سبحانی کی کتاب علم المعرفہ میں اسی موضوع پر اظہار نظر کیا گیا ہے۔

دینی دانش بنیادی طور پر تصور توحید کے گرد گھومتی ہے اور انسان کی ہستی کا تعین بھی اسی تصور کے ماتحت کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظریے کے مطابق انسان اشرف المخلوقات ہے اور انسانی معاشرہ ایک ہم آہنگ مجموعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان علماء وفلاسفہ کی نظر میں معاشرہ، تاریخ اور انسان ایک ہی پیکر کے اجزا ہیں اور ہر کسی کا اپنا ایک کردار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہر جزا اپنی حد تک دیگر اجزا سے معین روابط رکھتا ہے۔ کائنات میں وجود کے مختلف مراتب ہیں اور انسان کا وجودی مرتبہ ان میں سب سے بلند ہے۔ مسلمان حکماء نے مراتب عالم کی بحث کو علوم طبیعی وانسانی میں داخل کیا ہے۔ اس سلسلے میں فارابی کا ابتدائی کردار خاصا اہمیت رکھتا ہے۔

دینی تصور کائنات کے مطابق انسان ایک باہدف مخلوق ہے۔ انسان مرکز دائرہ ممکنات ہے۔ انسان خلیفۃ اللہ ہے۔ انسان چونکہ باارادہ اور فاعل مختار ہے اس لیے دیگر مخلوقات سے مختلف ہے۔ انسان مسئول اور جواب دہ ہے۔ انسان کا مطالعہ اسی لیے دیگر طبیعی مظاہر کے مطالعے سے بنیادی اور جوہری فرق رکھتا ہے۔

مغرب میں بھی علوم انسانی کے مطالعے میں انسان کے انفرادی اور اجتماعی کردار ہی کے بارے میں تحقیق کی جاتی ہے، اس کی فزیکل حیثیت علوم انسانی میں زیر بحث نہیں آتی۔ انسان کے فاعل مختار ہونے ہی کی وجہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ طبیعی مظاہرے کے بارے میں قانون بنانا آسان ہے انسان کے بارے میں مشکل ہے۔ انسان کی شناخت کے بارے میں مختلف نظریات کی وجہ سے علومِ انسانی کی حیثیت اور مقام کے بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔

۲۔۱۰۔۴۔علم پر ثقافت کے اثرات

علم اگرچہ کسی خاص علاقے اور جغرافیے سے متعلق نہیں ہوتا لیکن ثقافت سے اس کا تعلق ضرور ہوتا ہے اسی طرح آئیڈیالوجی سے بھی۔ علوم چونکہ ایک خاص ثقافت کے اندر تشکیل پذیر ہوتے ہیں اس لیے وہاں کی فکری روح ان کے آہنگ میں ضرور کارفرما ہوتی ہے اور وہ ایک خاص ثقافت ہی سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ مغرب کی ثقافت میں پروان چڑھنے والے علوم انسانی مغربی فلسفے، مغرب کی تاریخِ ثقافت اور مغربی تجربوں سے خاص مناسبت رکھتے ہیں لیکن اس سے

بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علوم مشرق میں پروان چڑھے ہوں یا مغرب میں، انسان کی عقل و فطرت ان کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ اسی طرح سے انسان کی مشترک جبلت بھی ناقابل انکار ہے لہٰذا زمان و مکان کے عناصر اور ایک خاص تصور کائنات کے علی الرغم انسان کی عقلی اور فکری دریافتوں میں مشترک سرمائے سے سب کو استفادہ کرنا چاہیے۔

۲۔۱۰۔۵۔ مغربی علوم، انسانی تہذیب کا اثاثہ ہیں

ہماری رائے میں علوم و معارف نیز مغربی تجربات آئندہ کی انسانی تہذیب کے لیے ایک اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ہم اپنے تصور کائنات کو انسانیت کی بقا کے لیے ضروری سمجھتے ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اسے کس طرح اہل مغرب کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے عقیدے، نظریے اور آئیڈیالوجی کوئی زبردستی کا سودا تو ہے نہیں، اس کے لیے خود اپنی دنیا کو اپنی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کر کے اس کی کامیابی کے بعد اسے دلیل بنایا جا سکتا ہے۔ جیسے خود اس وقت مغرب کا دعویٰ ہے کہ ان کے تصور کائنات نے انسان کی جو خدمت کی ہے وہ ماوراء الطبیعہ پر اصرار کرنے والوں سے نہیں ہو سکی۔ ثانیاً انسانوں کے تجربے اگر ناکام ہو گئے ہیں تو پھر اس ناکامی کو ثابت بھی کرنا ہوگا اور ناکامی کو علمی نارسائی کی دلیل بنانا ہوگا۔ علاوہ ازیں عقل و فطرت مغرب و مشرق کے انسان کا ایک مشترکہ سرمایہ ہے تو پھر یہ آج بھی مشترکہ نظام فکر و تہذیب کی بنیاد بن سکتا ہے۔

ہمارے ہاں بہت سے مذہبی علماء مغرب کے علوم انسانی کو تجربی سمجھتے ہیں اور انھیں دین کی حدود سے مکمل طور پر خارج جانتے ہیں۔ نیز ان علوم انسانی کو مغربی ثقافت کا حاصل قرار دیتے ہیں۔ انھیں وہ مغربی معیارات ہی سے ہم آہنگ جانتے ہیں۔ ان کے اس نقطۂ نظر کی صداقت کے ایک پہلو کو ہم پہلے ہی تسلیم اور بیان کر چکے ہیں، البتہ ہر لحاظ سے اس نظریے کی تائید نہیں کی جا سکتی۔

کاشان یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر حسن رضازادہ کی رائے میں:

جن مذہبی دانشوروں کی رائے ہے یہ علوم اسلامی ثقافت سے کاملاً بیگانہ ہیں اس لیے علوم انسانی کو معارف اسلامی کی بنیاد پر ہمیں نئے سرے سے

تشکیل دینا چاہیے۔ ہمارے ہاں ایسے دانشور بھی موجود ہیں کہ جن کا نظریہ یہ ہے کہ یہ نقطہ نظر باطل ہے کیونکہ سب کچھ جو علوم انسانی کے عنوان سے موجود ہے نہ بالفعل تجربی ہے اور نہ بالقوہ، علوم تجربی تو انسانی معارف کے پورے نظام کا چھوٹا سا حصہ ہیں۔ ثانیاً اسلامی ثقافت، مغربی ثقافت سے بنیادی اختلاف تو رکھتی ہے لیکن علم میں اسلوبِ تحقیق تمام ثقافتوں میں ایک سا ہے۔

۲۔۱۰۔۶۔ مغربی دانش نے ایک جہان نو آباد کر دیا ہے

اس واشگاف حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے تصور کائنات کے مطابق مغربی دانش وروں نے ایک جہان نو آباد کر دیا ہے۔ ایک عظیم تہذیب کی بنیاد رکھی ہے۔ ایک ایک ملک میں ہزاروں دانشگاہیں کام کر رہی ہیں اور ایک ایک یونیورسٹی میں سینکڑوں شعبے ہیں۔ ہر شعبے میں ماہرین اور پی ایچ ڈی سکالرز کی تیاری کا سلسلہ جاری ہے۔ گویا علم و دانش کا ایک سمندر ہے جو بہتا چلا جا رہا ہے یا بہتا چلا آ رہا ہے۔ مغرب نے جو بھی نظام فکر اختیار کیا اس کے مطابق تعمیر عالم کے منصوبے بنائے اور اس کی طرف پیش رفت کی۔ فزیکل علوم کے مظاہر تو ٹیکنالوجی اور سائنس کی طلسم ہوشربا کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک افسانوی دنیا آباد کیے ہوئے ہیں۔ مشرق و مغرب کے نونہالوں کو بھی اس کی مصنوعات نے اپنا گرویدہ نہیں بلکہ اسیر کر رکھا ہے۔ ایسی نئی ایجادات ہر گھر میں پہنچ گئی ہیں کہ جن کے بغیر اب ہر کسی کو اپنی زندگی ادھوری لگتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ایجادات نے انفرادی اور اجتماعی مشکلوں میں بھی بے پناہ اضافہ کیا ہے لیکن پھر معاشروں کو چلانے کے ذمہ داروں کو بھی تو اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ یہ مسائل تو انسانی بدن سے وابستہ فطری یا جبلی میلانات و خواہشات کے مظاہر و وسائل کے بارے میں بھی درپیش رہے ہیں۔ ان کے استعمال کے لیے اخلاقی اور قانونی ضوابط کی تشکیل اور ان کا نفاذ ایک الگ اجتماعی اور عمرانی معاملہ ہے لیکن بہر حال نئی انسانی ایجادات، سہولیات اور آسائشات اپنے ساتھ مشکلات اور مصائب لے کر آئی ہیں اور ان سب کے پیچھے کائنات کے رازوں کا سراغ لگانے والے ان تھک ''خدمت گزاروں'' یا

''سراغ رسانوں'' کی زحمات کارفرما ہیں۔

۲۔۱۰۔۷۔علوم انسانی کی ایک مثال: علم قانون

علوم انسانی کے ویسے تو بہت سے شعبے ہیں جن پر تفصیل سے بات کی جاسکتی ہے لیکن اس مختصر مقالے میں ہم بطور مثال آئین اور قانون کے حوالے سے علمی ارتقاء کی طرف کچھ اشارہ کرتے ہیں۔

قومی ریاستوں کا تصور جوں جوں گہرا اور قوی تر ہوتا رہا اس کے ساتھ ساتھ آئین اور قانون کا تصور بھی وسیع اور عمیق ہوتا رہا۔ آئین سازی بذات خود علم کی ایک اہم شاخ کے طور پر سامنے آئی اور پھر ریاستوں کے آئینی ڈھانچوں اور اس کے راہنما اصول وضوابط کی روشنی میں قانون سازی کا عمل زیادہ منظم اور مربوط ہوتا چلا گیا۔ آج دنیا بھر میں قانون کی تعلیم دینے والے ادارے موجود ہیں۔ بعض یونیورسٹیوں میں تو قانون کی فیکلٹیز کام کر رہی ہیں لیکن خود قانون ہی کی تعلیم کے لیے مختص یونیورسٹیاں بھی بے پناہ ہیں۔ دنیائے دانش میں آئین و قانون کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں کی شاید کوئی جامع فہرست اب تک مرتب نہیں کی گئی۔

قانون کا تصور ریاستی حدود سے نکل کر بین الاقوامی ہو چکا ہے۔ عالمی اداروں نے مختلف شعبوں میں قانون سازی کی ہے۔ بعض قوانین کا تعلق تمام ریاستوں سے ہے۔ جنگ اور امن کے قوانین، ریاستوں کے مابین تنازعات کے حل کے قوانین، صحت اور تعلیم سے متعلق قوانین، ماحولیات سے متعلق قوانین، انسانی حقوق سے متعلق قوانین، یہاں تک کہ ثقافت، زبان، آثار قدیمہ، دریاؤں اور سمندروں کے استعمال کے بارے میں قوانین بنائے گئے ہیں اور بنائے جارہے ہیں۔ ان قوانین پر عمل درآمد کے لیے الگ الگ ادارے بنادیے گئے ہیں اور ان اداروں کے اپنے ضوابط اور اہداف ہیں۔

۲۔۱۰۔۸۔اخلاق اور علم

جوں جوں علم فروغ پذیر ہے یہ سوال مغرب میں زیادہ اہم ہوتا جارہا ہے کہ کیا ''آزادی'' اور ''علم'' کے تصورات کو ''اخلاق'' پابندیوں کی ضرورت ہے یا نہیں۔ طاقتور ریاستوں کے ظہور،

انفرادی اور گروپس کے سرمائے میں بے پناہ اضافہ، نئے نئے مہلک ہتھیاروں کی ایجاد، صنعتوں کے فضلے، دھوئیں، گیس اور بدبو کے ماحولیات پر تباہ کن اثرات اور بے رحم ومقتدر سرمایہ داری نظام کی گرفت کے پیشِ نظر مغرب کے بہت سے دانشور، فرد اور معاشرے کے لیے کسی اخلاقی نظام کی ضرورت پر زیادہ زور دینے لگے ہیں۔ ہماری مذہبی روایات تو پہلے ہی ایک نظام اخلاق کی ناگزیریت پر زور دیتی چلی آئی ہیں۔ علم الاخلاق اور فلسفہ اخلاق ہمارے علوم کا حصہ رہا ہے۔ اسلامی تصور انسان کے مطابق انسان لائق تربیت بھی ہے اور قابل تربیت بھی لیکن اس کا یہ تصور ماورائے طبیعیت کے عقیدے سے قوت حاصل کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ علوم کی انفرادی تعلیم اور اخلاق کا انفرادی تصور زوال پذیر معاشروں میں کوئی بڑا کرشمہ نہیں کرسکتا۔ اس حوالے سے اصل سوال مغرب کے لیے یہ ہے کہ کیا فقط قانونی اخلاقیات ان خرابیوں کی اصلاح پر قادر ہے کہ جو انسانی معاشروں اور خود ہمارے گلوب میں در آئی ہیں اور کیا قانونی اخلاقیات ہماری دنیا کو درپیش خطرات کا مقابلہ کرسکیں گی یا نہیں۔ اس سلسلے میں تبلیغی اور علمی حوالے سے اگرچہ بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے، عالمی اور ریاستی سطح پر قانون سازی بھی کی گئی ہے اور اس دائرے میں دنیا کے تمام ممالک کو شامل کرنے کی کوششیں جاری ہیں لیکن اس حقیقت کو مانے بغیر چارہ نہیں کہ تباہی کا خطرہ وسیع اور ہمہ گیر ہوتا جارہا ہے۔ دانشوروں کو اپنے فلسفۂ علم پر بھی بازنگری کی ضرورت ہے۔

اگر اہل مشرق کے بعض دانشور اس عمل کا ادراک رکھتے ہیں تو پھر انسانیت کی مدد کے جذبے کے تحت بات کی جاسکتی ہے۔ جب کہ دوسری طرف بھی اس جذبے کا احترام کیا جائے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد رفعت اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> جہاں تک اس دائرہ علم کا تعلق ہے جس کو انسانی علوم سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہاں علمی سرگرمیوں کو منظم کرنے کے لیے تصور کائنات کے علاوہ اخلاقی قدروں کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ چنانچہ اصل سوال یہ ہے کہ وہ آفاقی تصور کائنات کیا ہے جس پر تحقیق کرنے والے باہم اتفاق کرسکیں، وہ اقدار کون سی ہیں جن کو وہ سب تسلیم کرلیں۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

> انسان میں عقیدے کے اختلاف کے باوجود اخلاقی اقدار کے سلسلے میں ان کا متحد الخیال ہونا ممکن ہے اور باہمی تعامل کے لیے ضروری بھی ہے۔ معروف و منکر کے تصورات اس اتحاد کی بنیاد ہیں۔ انسانی معاشرے کو تباہی اور انتشار بچانے کے لیے لیے اخلاقی اقدار کی آفاقیت پر زور دینا ضروری ہے۔

۲۔۱۰۔۹۔ ہمارے کرنے کا کام

مغرب کے علوم انسانی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ہماری نظر اس سوال کی طرف بھی جاتی ہے کہ اسلامی علماء کو مجموعی طور پر مغرب کے علوم انسانی کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ہم جناب محمد نجات اللہ صدیقی کی رائے سے متفق ہیں۔ ان کے نزدیک دو کام کرنے کے ہیں، ان میں سے ایک کام موجودہ علمی سرمائے کا مفید استعمال ہے اور دوسرا کام یہ ہے کہ مغرب کے موجودہ علمی سرمائے میں اضافہ کیا جائے۔ نئی معلومات فراہم کی جائیں اور تخلیقی صلاحیت سے کام لے کر علم کے دائرے کو وسیع کیا جائے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے آزاد فضا درکار ہے جہاں دماغوں اور ذہنوں کو سوچنے کی نئی راہیں تلاش کرنے کی آزادی ہو۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد رفعت کہتے ہیں:

> دونوں کاموں کی اہمیت مسلم ہونے کے باوجود ان میں سے موخر الذکر کام زیادہ ترجیح کا مستحق ہے۔

ڈاکٹر رفعت مزید لکھتے ہیں:

> علم کے دائرے کو وسیع کرنے کا کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے آفاقی ہے، یعنی اس کام کی انجام دہی میں انسانیت کے مختلف گروہوں کا باہمی تعاون ممکن بھی ہے اور ضروری بھی۔ دین اور عقیدے کا اختلاف یا اخلاقی نقطہ نظر کا اختلاف اس تعاون میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔

ان کی یہ رائے بھی بڑی جاذب نظر ہے:

علم کو حصول قیادت یا حصول اقتدار کا ذریعہ سمجھنا محل نظر ہے۔ علم کا یہ تصور منفی رویوں کو جنم دیتا ہے۔

ہم ڈاکٹر رفعت کی اس بات پر اپنے اس مقالے کو ختم کرتے ہیں:

یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ انسان کی صلاحیت محدود ہے، وہ سب کچھ نہیں جان سکتا اور انسانی علم کا ہر جز یکساں قطعیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ انسانی معلومات کا ایک بڑا حصہ ظنی ہوتا ہے اور اس میں ابہام پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قطعیت کا دعویٰ کرنے کے بجائے علم کی جستجو کرنے والوں کے لیے انکسار کا رویہ زیادہ مناسب ہے۔

مزید تفصیل کے لیے رجوع کیجیے:

۱۔ ڈاکٹر حسن زادہ (کاشان یونیورسٹی): جایگاہ علوم انسانی در فرہنگ وفلسفۂ اسلامی

۲۔ ڈاکٹر محمد رفعت (پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی): سماجی علوم کی اہمیت اور ناگزیریت

۳۔ ڈاکٹر محمد رفعت (پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی): اسلامی اساس پر علوم کی تدوین نو

۴۔ محمد علی مرادی: ظہور وتکوین علوم انسانی در غرب

۵۔ سید محمد باقر الصدر: فلسفتنا

۲۔۱۱۔فروغ الحاد: یہ تو ہونا تھا

ایک اخباری رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایک خفیہ سروے کے مطابق پاکستان میں مذہب چھوڑنے اور ملحد بننے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور اس میں شیعہ، سنی اور دوسرے تمام مسالک کے لوگ شامل ہیں، الحاد کے تیزی سے پھیلنے کا سبب سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ پر بیٹھے سابقہ مسلمان ہیں جن کے بقول مذہبی تعلیمات جھوٹ پر مبنی ہیں اس کے علاوہ وہ مذہبی عقائد کے خلاف سائنسی ثبوت بھی پیش کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر سابقہ پاکستانی مسلمان ملحدین کی اکثریت پڑھی لکھی ہے اور ان میں مذہبی مدارس سے فارغ تحصیل لوگ بھی شامل ہیں جو اسلام کو چھوڑ کر ملحد بن گئے۔ فیس بک اور ٹویٹر پر کئی ایسے گروپس اور آئی ڈیز ہیں جو لوگوں کو مذہب سے نکالنے کے لیے دن رات کام کر رہے ہیں۔ پاکستان کے علاوہ الحاد مغربی ممالک اور عرب ممالک میں بھی تیزی سے پھیل رہا ہے اور لوگ کسی بھی مذہب کو ماننے سے انکار کر رہے ہیں اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے آپ کو اگنوسٹک کہتے ہیں یعنی کہ وہ خدا کے تصور کو تو کسی حد تک مانتے ہیں مگر کسی مذہب کو نہیں مانتے۔ اتھسٹ ہوں یا اگنوسٹک اسلام کے نزدیک یہ لوگ گمراہ ہیں، اگر الحاد بڑھنے کا رجحان اسی طرح رہا تو پاکستان سمیت ساری دنیا میں مذہب کے نہ ماننے والے ملحدین کی اکثریت ہوگی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ رپورٹ ایک پہلو سے تو درست ہے کہ الحاد کے فروغ کے لیے پاکستان میں بعض لوگ شعوری کوششیں کر رہے ہیں لیکن ایسی تمام کوششوں کو کسی سازش کا حصہ کہنے سے پہلے اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ الحاد کے فروغ کے لیے خود ''مسلمان'' ''خلوص نیت'' سے کتنا حصہ ڈال رہے ہیں اور یہ بات جاننے کے لیے کسی خفیہ سروے کی ضرورت نہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم پاکستان اور مسلمان ممالک میں الحادی فکر کے پھیلنے کی وجوہات کا جائزہ

پس ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ مغرب میں کلیسا کی بساط کا لپٹ جانا اور پورے مغربی سیاسی نظام پر سیکولر فکر کا غلبہ ہو جانا کوئی دور کی بات نہیں۔ مسلمان دانشوروں نے اس مسئلے کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اور اس کی بنیادی وجہ خود کلیسا کے کار پردازوں کا طرزِ عمل اور ان کے تصورِ مذہب کو قرار دیا ہے۔ مذہبی استبداد کی جو روش کلیسا نے اختیار کی تھی اور جس طرح سے وہ عقل و فکر کو بروئے کار لانے سے روکتے تھے اور جیسے وہ مشاہداتی حقائق کا انکار کرتے تھے اس سب کا نتیجہ مذہب سے فرار کے سوا کچھ نہیں نکلنا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ کلیسا سے بغاوت بالآخر مذہب سے بغاوت پر منتج ہوئی۔ یہ خلاصہ ہے مسلمان دانشوروں کے اس نقطۂ نظر کا جو انھوں نے زوالِ کلیسا کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔

ہم سوال کرتے ہیں کہ جو کچھ کلیسا کے اہلِ حل و عقد اور مذہبی رہنماؤں نے کیا، کیا مسلمان مذہبی راہنما وہی کچھ نہیں کررہے ہیں۔ اگر ہماری بات کا جواب مثبت ہے تو پھر نتیجہ وہی نکلے گا جو مغرب میں نکل چکا ہے۔ اہلِ مغرب خدا کے رشتے دار ہیں، نہ اہلِ مشرق۔ وہ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ کا مصداق ہے۔ اس کے قوانین اٹل ہیں اس کی سنتیں نہیں بدلتیں جن اعمال کے نتیجے میں مغرب والوں نے الحاد کا راستہ اختیار کیا انھی اعمال کے نتیجے میں مشرق والے بھی الحاد ہی کا راستہ اختیار کریں گے۔ یہ قدرت کے فیصلے ہیں اور جب قوموں کی اجل آجاتی ہے تو نہ ان کا وقت پیچھے کو جاتا ہے اور نہ آگے کو۔

ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ مسلمان گروہ در گروہ تقسیم ہو چکے ہیں۔ دین کی آفاقی تعلیمات پس پشت ڈال دی گئی ہیں، انسان بہت سے اہلِ مذہب کی نظروں میں بے قیمت ہو گیا ہے، فروع کا غلغلہ ہے اور اصول پامال ہو رہے ہیں۔ دین کے بعض ظواہر مختلف گروہوں نے اختیار کر لیے ہیں اور حقیقت دین کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ مذہب کے نام پر مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں کا بے دردی سے خون بہایا جا رہا ہے۔ اپنے ذاتی اور سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کے استعمال کا معاملہ سنگین سے سنگین تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ فرقہ واریت کا دیو ہے کہ بوتل میں واپس جانے کا نام نہیں لیتا بلکہ اس کا آسیب وحشت ناک حد تک پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

مسلمان ملکوں پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں بحرین میں کیا ہو رہا ہے، سعودی عرب اپنے ملک کے اندر اور باہر مذہب کے نام پر کیا کردار ادا کر رہا ہے، شام پر کیا گزر رہی ہے، عراق کس طرح سے خون میں نہا رہا ہے، افغانستان پر کیا بیت رہی ہے، ایران کس طرح سے عالمی جکڑ بندیوں کا شکار چلا آ رہا ہے، پاکستان میں مذہبی تقریبات پر کیسے وحشت و دہشت کے سائے پڑے ہوئے ہیں۔ اس ساری صورت حال میں اگر کوئی یہ کہنا شروع کر دے کہ مذہب نے انسان کی زندگی کو خوف و وحشت میں مبتلا کر دیا ہے، نوع انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور مختلف گروہوں کو ایک دوسرے کا ازلی دشمن بنا دیا ہے تو ایسے میں مذہب ہی کو کیوں نہ چھوڑ دیا جائے۔ سچ کہیے کہ اس فکر کے پیدا ہونے کا باعث کون ہے؟

جب بھی کوئی اس صورت حال کی بنیاد پر ہمارے دین پر اعتراض کرتا ہے تو ہم قرآن کریم کی آیتیں پڑھ پڑھ کر اسے بتاتے ہیں کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ کسی ایک بے گناہ انسان کا خون ساری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ ہم احادیث کا حوالہ دے کر اپنے نبیؐ کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان اور انسان محفوظ اور سالم رہیں تو جواب میں ہمیں یہ کہا جاتا ہے کہ ایک طرف کتابوں میں لکھی ہوئی عبارتیں ہیں اور دوسری طرف وحشت ناک طریقے سے ناچتی ہوئی حقیقتیں ہیں۔ خارجی صداقتیں اور وحشت انگیز زمینی حقیقتیں چھوڑ کر اور انھیں نظر انداز کر کے ہم کتابوں کی طرف کیسے چلے جائیں؟ کیا ایک دوسرے کو قتل کرنے والے مسلمان نہیں؟

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جیسے اہل کلیسا بعض ایسے عقائد پر اصرار کرتے تھے جو خارجی حقائق پر منطبق نہیں ہوتے تھے، مسلمانوں کے ہاں بھی مذہبی مسند پر براجمان مفتیوں کے بہت سے فتاویٰ خارجی حقائق کا منہ چڑا رہے ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے مذہبی اداروں کے فارغ التحصیل عام طور پر دنیا میں ہونے والی سائنسی اور انسانی علوم کی پیش رفت سے غافل ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ دنیا پر حکم فرما ان حقائق سے بھی نابلد ہوتے ہیں جو اپنی قوت سے اپنی طے شدہ سمت کی طرف انسانی کاروان کو لے جا رہے ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر کتنے ہی مذہبی علماء ایسے ہیں جنھیں یہ تک نہیں پتہ کے کسی ریاست کے لیے آئین کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں۔ عصری علوم اور مذہبی علوم کا بُعد بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ بُعد بھی الحاد کے فروغ میں حصہ دار ہے۔

جو لوگ علی وجہ البصیرت خدا پر ایمان رکھتے ہیں انبیاء کی ضرورت کا ادراک رکھتے ہیں نیز حیات بعد از ممات پر عقیدے کو حقیقت پر مبنی اور ناگزیر جانتے ہیں انھیں اگر الحاد کی بڑھتی ہوئی روش ناگوار گزرے تو وہ پھر اہل مذہب کی ناگوار اور تکلیف دہ فکر اور حرکت کی اصلاح کے لیے سنجیدہ فکر کریں۔

باب سوم

✲✲✲✲✲✲✲

شریعت اور قانون

۳۔۱۔اسلامی قانون سازی کے تصور میں توسیع کے امکانات

۳۔۱۔۱۔ پاکستان کے آئینی تصور کی ضرورت

''اسلامی قانون سازی کے تصور میں توسیع کے امکانات'' یہ عنوان کچھ فرق کے ساتھ کچھ یوں بھی ہوسکتا ہے ''قانون سازی کے اسلامی تصور میں توسیع کے امکانات''۔ یہ موضوع نہایت اہمیت رکھتا ہے اور ایک اسلامی ملک جو اپنے آپ کو اسلامی جمہوریہ بھی کہلاتا ہو اور جس کے آئین میں یہ لکھا ہو کہ اس ملک میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بن سکتا، میں اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔ یہ موضوع اپنے اندر کئی ایک پہلو رکھتا ہے اور قانون سازی کے اسلامی تصور یا اسلامی قانون سازی کے تصور سے جڑا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی قانون سازی کے ماہرین کی آراء مختلف رہی ہیں اور اب بھی ہیں۔ ان آراء میں افراط وتفریط بھی پائی جاتی ہے اور بعض آراء کو معتدل بھی کہہ سکتے ہیں، تاہم تینوں صورتوں میں کئی ایک شیڈز موجود ہیں۔ مختلف ماہرین کا تصور قانون سازی ایک فکری پس منظر رکھتا ہے۔ ہم ذیل میں بعض نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۳۔۱۔۲۔احکام کی پانچ قسمیں

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ فقہ اور شریعت کی حدود سے کوئی چیز باہر نہیں جاسکتی۔ ہر قانون اور ہر فکر پر اسلام یا دین ایک رائے رکھتا ہے۔ ہر عمل کے بارے میں شریعت کا ایک نقطۂ نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احکام کو پانچ عناوین کے تحت تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔واجب یا فرض

یعنی ایسا کام جسے شریعت کی نظر میں بجالانا ضروری ہے اور اسے بجا نہ لایا جائے تو مکلف گناہگار ہوگا اور ممکن ہے اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے وہ کسی سزا کا بھی مستوجب ہو۔

۲۔حرام

یعنی ایسا کام جس کا نہ کرنا ضروری ہے اور جو شخص اسے بجالائے گا وہ گناہگار قرار پائے گا اور ممکن ہے ایسا کرنے سے اسلامی قانون کے تحت اسے سزا بھی دی جاسکے۔

۳۔ مستحب

یعنی ایسا کام جس کا کرنا بہتر ہے اور نہ کیا جائے تو کوئی گناہ نہیں، ایسا عمل کرنے والا لائق تحسین وستائش قرار پاتا ہے۔

۴۔ مکروہ

یعنی ایسا کام جس کا نہ کرنا بہتر ہے، کرنے والے کو کوئی سزا تو نہیں دی جاسکتی البتہ دین دار لوگوں کی نظر میں ایسا کرنے والا لائق تحسین قرار نہیں پاتا۔

۵۔ مباح

یعنی ایسا کام جس کا کرنا یا نہ کرنا شریعت کی نظر میں مساوی ہو اور مکلف چاہے تو اسے انجام دے، چاہے تو نہ انجام دے۔

اس تقسیم کی رو سے دیکھا جائے تو شریعت یا فقہ ہر عمل پر ایک رائے رکھتی ہے اور ایک حکم لگاتی ہے اور انسانی زندگی کا کوئی ایسا عمل نہیں ہے جس پر شریعت اپنی کوئی رائے نہ رکھتی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ مباحات کی تعداد گنی نہیں جاسکتی لیکن بہرحال اس تصور اور عمل کی اس تقسیم کے مطابق شریعت ہر عمل پر اپنی رائے رکھتی ہے۔

۳۔ا۔۳۔ احکام فقہی اور تصور قانون میں فرق

بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ احکام فقہی اور قانون کے عمومی تصور میں فرق ہے اور فقہی یا شرعی احکام طے شدہ اور محدود ہیں جب کہ قانون کا مدنی اور عصری تصور بہت وسیع ہے اور شریعت اس میں کوئی مداخلت نہیں کرتی۔

اسلامی قانون سازی کے حوالے سے یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ عمومی فقہا کے نزدیک دو علوم ایسے ہیں جو اس پر محیط ہیں، ایک کو علم اصول فقہ کہا جاتا ہے اور دوسرے کو علم فقہ۔ اصول فقہ دراصل ان اصول وقواعد سے بحث کرتا ہے جو مذہبی مصادر سے قانون اخذ کرنے یا حکم اخذ کرنے

میں مددگار ہوتے ہیں۔

اس کی تعریف یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اصول فقہ ایک ایسا علم ہے جس میں ان قواعد کے بارے میں بحث کی جاتی ہے جن کا نتیجہ مجتہد حکم شرعی کے استنباط میں استعمال کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ علم ایک ایسا وسیلہ ہے کہ فقیہ جس کے ذریعے شریعت کے فرعی احکام اس کے منابع سے اخذ کرتا ہے۔

یہ علم دراصل دوسرے علم میں داخل ہونے کا دروازہ ہے، اصل مقصد استنباط احکام ہے اور وہ علم جو احکام شرعی بیان کرتا ہے اسے علم فقہ کہا جاتا ہے۔

اسلامی قانون سازی کے تصور میں جن اصول یا قواعد سے بحث کی جاتی ہے وہ مختلف مکاتب فکر میں قدرے مختلف ہیں۔ مثلاً احناف کے نزدیک قرآن، سنت، اجماع اور قیاس منابع کی حیثیت رکھتے ہیں، جب کہ جعفریوں کے نزدیک قرآن، سنت، اجماع اور عقل منابع شریعت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض مکاتب فکر میں سد ذرائع، مصالح مرسلہ وغیرہ کو ان منابع میں شامل کیا جاتا ہے۔ بہرحال قرآن وسنت میں اصولاً تو کسی کا اختلاف نہیں لیکن سنت کے تصور میں اختلاف موجود ہے۔ اجماع کی تعریفیں بھی مختلف فقہا کے نزدیک مختلف ہیں۔ قیاس پر خود اہل سنت کے مختلف مکاتب فکر میں بہت تنقید کی گئی ہے۔

۳۔۱۔۴۔اصول فقہ بھی ارتقاء پذیر ہے

یہ بات بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ اجتہاد کے ان منابع کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان میں پیشرفت جاری رہی ہے۔ اس وقت اصول فقہ کی جو شکل مختلف مکاتب فکر کے ہاں موجود ہے، یہ ہمیشہ سے ایسی نہ تھی۔ ہم یہاں پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب اس میں ارتقاء کا عمل ماضی میں جاری رہا ہے تو آج بھی جاری رہ سکتا ہے۔ اسی طرح فقہ کے جن ابواب پر ماضی میں کام ہوتا رہا ہے ان میں نئے ابواب کا اضافہ کیا جاسکتا ہے، یہ اس صورت میں ہے کہ جب ہم اجتہاد کی اس شکل کو درست تسلیم کرلیں۔

۳۔۱۔۵۔استاد اعرافی کی باتیں

اسلامی قانون سازی کے اس فریم ورک میں توسیع کے حوالے سے ہم ایران کے ایک

معاصر فقیہ استاد علی رضا اعرافی کی چند باتیں پیش کرتے ہیں۔ فروری 2019 میں پاکستان تشریف لائے۔ انھوں نے 8 فروری کو اسلامی نظریاتی کونسل میں علماء اور دانشوروں کی ایک خصوصی نشست سے پیش نظر موضوع کے حوالے سے چند مفید باتیں کیں جن کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

''افسوس ہے رینا سینس (Renaissance) کے بعد علمی مدارس عوام اور معاشرے سے لا تعلق ہو گئے، ہمارے معاشرے مغربی قانون کے زیر اثر آ گئے۔ فقہ اور شریعت سے دوری کا یہاں سے آغاز ہوا، ہمارے معاشرے قانون اسلامی سے دور ہو گئے۔ ایک طرف دین ہے تو دوسری طرف قانون، اگر ہم نے ٹھیک کام کیا ہوتا تو شریعت کے متن سے حکومتی قوانین استخراج کرتے لیکن ایسا نہ ہوا۔ اب جب اسلامی ممالک نے اسلام کی طرف بازگشت کی ہے تو وہ مجبور ہوئے ہیں کہ اسلامی متون کا رخ کریں۔ قانون اور فقہ کے مابین عموم وخصوص من وجہ کی نسبت ہے۔ [یعنی دونوں میں کچھ چیزیں مشترک ہیں اور کچھ غیر مشترک]۔

مثلاً عبادات قانون کی جدید اصطلاحات سے باہر ہیں، فقہ اور قانون میں آج کی اصطلاح میں ایک مادہ افتراق ہے تو ایک مادہ اجتماع۔

مدنی جزائی قوانین عیناً فقہ اسلامی میں آتے ہیں۔ رائج قوانین جو زمان ومکان میں محدود ہوتے ہیں شریعت میں ان کا ذکر نہیں۔ عناوین فقہ تین طرح کے ہیں:

۱۔ **عناوین اولیہ:** یہ وہ عناوین ہیں جن کا متن آیات وروایات میں آیا ہے اور حکم مشخص ہے مثلاً قتل عمد اور شبہ قتل عمد وغیرہ۔

۲۔ **عناوین ثانویہ:** یہ قواعد عامہ کے تحت آتے ہیں، ان کی مثال، ضرر اور حرج کے قواعد ہیں۔

۳۔ **عناوین ولائی یا عناوین سلطانیہ:** ان سے مدنی قوانین مراد ہیں۔ حکومتیں اپنی رعایا کی مصلحت یا مفسدہ دیکھ کر اس سلسلے میں قانون سازی کرتی ہیں۔

پہلی قسم کے قوانین میں سے مدنی جزائی قوانین متون آیات وروایات سے استخراج کیے جاتے ہیں۔ ان قوانین کو قانون کی زبان میں بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں فقہی معیارات کا مکمل خیال رکھنا چاہیے۔

عناوین ثانویہ کے لیے قوانین بناتے ہوئے پوری توجہ رکھنا چاہیے کہ جس کا مصداق متعین نہیں اس کا درست مصداق متعین ہو۔

تیسری قسم کے قوانین کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے ہوں جو شریعت کی نظر میں قابل قبول ہوں اور شریعت کے دائرے کے اندر اس حوالے سے قانون سازی کی جائے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ شریعت ہمارے ملک میں نافذ ہو تو فقہ میں توسیع ضروری ہے۔ اس وقت تک فقہ کے پچاس ابواب ہیں، اس میں ہمارے ہاں کام ہو رہا ہے اور بیس نئے ابواب کا اضافہ کیا جا چکا ہے۔ ان میں تعلیم و تربیت، طبابت، ماحولیات، سماجی نظام وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرا کام قواعد عامہ میں توسیع کا پیدا کرنا ہے۔ عمومی قواعد مثلاً ضرر، حرج وغیرہ کے ساتھ نئے قواعد کی ضرورت پیش آئی ہے۔ قبل ازیں اس پر شہید باقر الصدر نے کام کیا تھا۔ ان کی کتاب ''اقتصادنا'' کی مثال دی جا سکتی ہے۔

فقہ و قانون کی فلاسفی پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس پر ہمارے ہاں تحقیق جاری ہے۔

اجتماعی زندگی اور سوشل سائنسز کے حوالے سے جو نئے مسائل پیش آ رہے ہیں ان میں بھی فقہ و قانون کو اپنا کردار ادا کرنا ہے۔''

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ایسے فقہا موجود ہیں جو رائج فقہی فریم ورک میں توسیع پر نہ فقط سوچتے ہیں بلکہ کام بھی کر رہے ہیں۔ تاہم بعض ایسے عناوین ہیں جن پر اگر اس سے بھی پہلے زیادہ غور و فکر کر لیا جائے تو نئے آفاق روشن ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور فہم شریعت میں توسیع پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں فطرت، عرف، مصلحت وغیرہ، جیسے عناوین سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر اصول فقہ کے تصور اور قواعد میں توسیع پر کچھ اذہان قائل ہو چکے ہیں تو انھیں ان عناوین پر غور و فکر ضرور کرنا چاہیے۔ تاہم یہ ہماری طرف سے کوئی نئی بات نہیں بلکہ ان میں سے بعض موضوعات پر بعض علماء خاصا غور و فکر کر چکے ہیں۔ بعض نے اس حوالے سے کتابیں بھی لکھی ہیں۔

۳۔۱۔۶۔ استاد سبحانی اور استنباط میں زمان و مکان کا کردار

استاد جعفر سبحانی جو عصر حاضر کے ایک بڑے فقیہ ہیں انھوں نے ''نقش زمان و مکان در

استنباط‘‘ کے زیرعنوان ایک فکر انگیز مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ اس میں انھوں نے انیس ایسی احادیث نقل کی ہیں جو حکم کو زمان و مکان اور دیگر شرائط سے مربوط قرار دیتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری بحث فقط عقلی نہیں بلکہ نقلی تائیدات بھی رکھتی ہے۔ ان احادیث کا نتیجہ وہ چار نکات کی صورت میں پیش کرتے ہیں:

> ۱۔ اگر حکم کا تعلق حکومت سے اور رسول اللہؐ کی معاشرے پر ولایت سے ہو اور مقصد معاشرے کے نظم کو چلانا اور اس کے مصالح کی حفاظت کرنا ہو تو ایسا حکم اس حکم شرعی سے مختلف ہے جو اللہ کی طرف سے جبریل لائے ہوں، بلکہ ایسا حکم وقتی ہوگا جسے معاشرے کے مصالح و مفاسد کے پیش نظر بنایا گیا ہو۔
>
> ۲۔ بعض اوقات حکم میں تبدیلی اس حکم کے معیار اور پیمانے کے بدل جانے اور نئے معیار اور پیمانے کے وجود میں آجانے سے ہوتی ہے۔
>
> ۳۔ بعض اوقات ایک ایسا عنوان پیدا ہو جاتا ہے جو حرمت رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے حکم میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔
>
> ۴۔ بعض اوقات معیارِ حکم وسیع ہوتا ہے، یعنی کسی ایک زمانے میں حکم کا معیار ایک چیز ہوتی ہے اور پھر کوئی دوسری چیز بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

فکری وسعت کا سراغ ہمیں گذشتہ ادوار میں بھی بہت سے علماء کے ہاں دکھائی دیتا ہے چند مثالیں ہم ذیل میں استاد سبحانی ہی کے مذکورہ مقالے سے نقل کرتے ہیں:

ابن قیم جوزی (م ۷۵۱ھ):

> انھوں نے اپنی ایک کتاب میں ایک عنوان قائم کیا ہے: ’’زمان، مکان، احوال، محرک اور منافع کی تبدیلی سے فتویٰ کی تبدیلی‘‘۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ اس فصل کے بہت سے فائدے ہیں اور اس سے لاعلمی شریعت کے بارے میں بہت سے شبہات کا باعث بنتی ہے جس کا نتیجہ حرج مشقت اور

نا قابل برداشت فرائض یا ذمہ داریوں کی صورت میں نکلتا ہے اور یہ درخشاں شریعت کہ جس نے بلند ترین درجہ کی مصلحتوں کو ملحوظ رکھا ہے، اس پر راضی نہیں کیونکہ شریعت اسلام کی بنیاد بندوں کی دنیا و آخرت میں مصلحت پر استوار ہے، وہ شریعت کہ جو سراسر عدالت، رحمت، مصلحت اور حکمت ہے، لہٰذا ہر وہ مسئلہ، جو عدالت، رحمت، مصلحت اور حکمت سے خارج ہو اور ظلم، پسماندگی، فساد اور بیہودگی کا رنگ اختیار کر لے شریعت کا حصہ نہیں ہے۔

ابو اسحاق شاطبی (م ۷۹۰ھ): وہ اپنی معروف کتاب الموافقات میں کہتے ہیں:

''شریعت کے احکام سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شارع نے بندوں کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھا ہے اور احکام کا دارومدار ان کی مصلحت پر ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک چیز جو کسی زمانے میں مصلحت رکھتی تھی، جائز ہوگئی اور دوسرے زمانے میں جب اس کی مصلحت ختم ہوگئی تو ممنوع ہو گئی۔''

ابن عابدین (م ۱۸۳۶ء): علامہ محمد امین افندی جو ابن عابدین کے نام سے مشہور ہیں اپنی کتاب مجموعہ رسائل میں لکھتے ہیں:

فقہی مسائل نص صریح کے ذریعے ثابت ہوتے ہیں یا نوعی اجتہاد کے ذریعے۔ بسا اوقات مجتہد جو کچھ بیان کرتا ہے وہ اس کے اپنے زمانے کے عرف کے مطابق ہوتا ہے، اس طرح سے کہ اگر نیا عرف پیدا ہو جائے تو وہ اس کے خلاف بات کرے گا جو وہ پہلے کر چکا ہوتا ہے۔ اسی لیے علماء نے اجتہاد کی شرائط کے بارے میں کہا ہے کہ ضروری ہے کہ مجتہد لوگوں کی عادات و عرف سے آشنا ہو۔ اس لیے بہت سے شرعی احکام زمانے کے بدلنے سے اور لوگوں کے عرف کے بدل جانے سے یا کسی ضرورت کے

پیدا ہو جانے سے یا لوگوں کے فاسد ہو جانے سے بدل جاتے ہیں۔ اس طرح سے کہ اگر حکم سابق اپنی قوت کے ساتھ باقی رہے تو لوگوں کے لیے مشقت اور نقصان کا باعث بنے گا اور ایسا ہونا ان شرعی قواعد کے خلاف ہے جو تخفیف اور آسانی پر مبنی ہیں نیز ضرر و فساد کو دور کرنے پر استوار ہیں تاکہ معاشرے کا نظم بہترین شکل اور برترین قانون کے ساتھ چلایا جا سکے۔ یہی سبب ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکابر مذہب بہت سے مواقع پر کسی مجتہد کے ایسے حکم کی مخالفت کرتے ہیں جو اس نے اپنے زمانے کی شرائط کے ساتھ تصریح کرتے ہوئے بیان کیا ہو کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ مجتہد بھی ان کے زمانے میں رہ رہا ہوتا تو وہ اپنے مذہب کے قواعد کی روشنی میں ان ہی کی طرح سے بات کرتا۔

ایسے اقوال ہم بہت سے اکابر مذہب اور علماء وفقہا کی کتب سے نقل کر سکتے ہیں۔ یہاں چند اقوال نمونے کے طور پر ذکر کیے گئے ہیں۔ ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے علماء وفقہاء کے نزدیک زمان و مکان کے تبدیل ہونے سے، عرف کے بدل جانے سے اور لوگوں کی مشکلات کے پیش نظر نئے مصالح و مفاسد سامنے آنے کی وجہ سے حکم کی تبدیلی کا امکان ہمیشہ رہتا ہے۔ ہماری رائے میں اگر ان عناوین کو بہتر طور پر زیر بحث لایا جائے تو اسلامی قانون سازی کے تصور میں عصری اور زمینی تقاضوں کی روشنی میں وسعت کے بہت سے امکانات سامنے آ جاتے ہیں۔

قرآن و سنت کے فہم کے حوالے سے بھی رائج اصولوں کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے اور دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کیا کوئی حکم زمانی اور زمینی قید سے مربوط تو نہیں۔ مولانا مودودی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (م ۱۹۷۹ء)

”انسانی زندگی کے معاملات میں سے ایک قسم کے معاملات وہ ہیں جن میں قرآن اور سنت نے کوئی واضح اور قطعی حکم دیا ہے، یا کوئی خاص قاعدہ

مقرر کر دیا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں کوئی فقیہ، کوئی قاضی، کوئی قانون ساز ادارہ شریعت کے دیے ہوئے حکم یا اس کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کو نہیں بدل سکتا لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان میں قانون سازی کے لیے کوئی مجال کار ہے ہی نہیں۔ انسانی قانون سازی کا دائرۂ عمل ان معاملات میں یہ ہے کہ سب سے پہلے ٹھیک ٹھیک معلوم کیا جائے کہ حکم فی الواقع ہے کیا؟ پھر اس کا منشا اور مفہوم متعین کیا جائے اور یہ تحقیق کی جائے کہ یہ حکم کن حالات اور واقعات کے لیے ہے۔ پھر عملاً پیش آنے والے مسائل پر ان کے انطباق کی صورتیں اور مجمل احکام کی جزئی تفصیلات طے کی جائیں اور ان سب امور کے ساتھ یہ بھی مشخص کیا جائے کہ استثنائی حالات وواقعات میں ان احکام وقواعد سے ہٹ کر کام کرنے کی گنجائش کہاں کس حد تک ہے۔''[۱]

۳۔۱۔۷۔ نصوص وظروف کا باہمی تعلق

سطور بالا سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ عموماً علمائے کرام نصوص کی تعبیر کرتے ہوئے ظروف اور حالات وشرائط کو ملحوظ رکھنے کے قائل ہیں۔ اگرچہ بعض افراط پسند افراد کے نزدیک نصوص پر غور وفکر بھی اجتہاد بمقابلہ نص قرار دیا جاتا ہے تاہم اس سلسلے میں غور وفکر کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ راقم نے اس حوالے سے اپنے رسالے ''ترکی میں احادیث کی جدید موضوعی تدوین'' میں چند نکات غور وفکر کے لیے پیش کیے ہیں یہاں انھیں موضوع کی مناسبت سے دہرانا مفید رہے گا:

(۱) ہر مخاطِب کو بات کرتے ہوئے اپنے مخاطبین اوّلین جن سے وہ بلا واسطہ خطاب کر رہا ہوتا ہے، کے درجہ فہم وعلم کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ لہٰذا کسی کی بات، قول یا حدیث سمجھنے کے لیے مخاطبین اوّلین کے درجۂ فہم وعلم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) ہر زبان ایک خاص دور میں، ایک خاص مرحلے میں ہوتی ہے۔ زبانیں بدلتی رہتی ہیں۔

[۱] مودودی، ابوالاعلیٰ: تفہیمات حصہ سوم (لاہور، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، ستمبر ۱۹۶۹) ص ۹و۱۰

زبانوں کو بھی زمان ومکان کے تقاضوں سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) بعض اوقات ایک بات کا مخاطب ایک شخص ہوتا ہے، بعض اوقات متعدد افراد، بعض اوقات ایک دور کے تمام افراد اور بعض اوقات ہر دور کے افراد۔ نصوص کو سمجھنے کے لیے اُن کے مخاطبین کا تعین ضروری ہے۔

(۴) گاہے حکم مشروط ہوتا ہے۔ شرط کے ختم ہونے سے حکم ختم ہو جاتا ہے۔

(۵) گاہے کسی حکم میں ایک دور سے آگے بڑھنے کی داخلی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔

(۶) مختلف سطح کے فہم وعلم کے مخاطبین کو بعض اوقات ایک ہی سوال کا مختلف جواب دیا جاتا ہے۔

(۷) معاشرے کے ارتقا کا کام مرحلہ بہ مرحلہ ہوتا ہے۔ سماج کو پہلے سے دوسرے مرحلے میں لے جانے کے لیے جو قانون تجویز کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ دوسرے سے تیسرے مرحلے میں لے جانے کے لیے بھی وہی قانون تجویز کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے روحِ قانون یا مقصدِ قانون کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۸) انسانی معاشرے میں بدل جانے والے اور نہ بدلنے والے دونوں طرح کے امور ہوتے ہیں۔ تغیر وتبدل کے ساتھ قانون کا جمود ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔

ایسے تمام نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''نصوص'' میں زمان ومکان کا کوئی تقاضا ملحوظ نہیں رکھا گیا؟ گویا نصوص تاثیرِ ظروف سے مبرا ہیں؟ جبکہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح نصوص میں ایسے دائمی اور آفاقی عناصر موجود ہوتے ہیں جو روحِ دین کی حیثیت رکھتے ہیں، ہمیں اپنے سماج کو ان کی روشنی میں آگے بڑھانا چاہیے۔ انبیاء کرامؑ کی الٰہی تعلیمات انسانی معاشرے کے لیے کمال وفضیلت کی راہ متعین کرتی ہیں۔ قرآن وسنت انہی تعلیمات کے امین ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اپنے ظروف کو انہی تعلیمات کے دائمی وسرمدی عناصر کی روشنی میں سنوارنے اور نکھارنے کی ضرورت ہے۔

جو فقہا بابِ اجتہاد کے کھلا ہونے کی وکالت کرتے ہیں وہ ایسے ہی دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔ اجتہاد کو زندہ اور متحرک رکھنے کے لیے ان نکات کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ نص پر ہر پہلو سے

غور وفکر کر کے اپنے لیے اور اپنے دور یا علاقے کے لیے پیغام اخذ کرنا اجتہاد بمقابلہ نص نہیں بلکہ **اجتہاد لفھم النص** ہے۔ نص کو سمجھنے کی کوشش عین منشاء اجتہاد ہے۔

اس وقت تک ہماری تمام بحث رائج طریق استنباط کی حدود کے اندر ہے لیکن اگر اس سلسلے میں بات مقاصد بعثت انبیاء سے شروع کی جائے تو یقیناً بات کے نئے زاویے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح عملاً قانون سازی کی حدود کو دیکھا جائے تو منصوص احکام کا دائرہ خاصا محدود دکھائی دیتا ہے۔ پھر ممکن ہے کہ جسے ایک فقیہ نص کہتا ہو دوسرا اسے ظاہر کہے، اس طرح بحث کے نئے زاویے پیدا ہو جاتے ہیں۔

۳۔۱۔۸۔ دیگر ادیان اور معاشرے

اس بحث کو ایک نئے زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ عموماً فقہاء یہ کہتے ہیں کہ تمام ادیان و مذاہب میں نکاح وطلاق کے جو قوانین رائج ہیں ان کے نتیجے میں ہونے والا نکاح جائز ہے اور طلاق بھی اسی طرح سے جائز قرار پائے گی۔ دنیا بھر میں نکاح کے مختلف رسم ورواج اور قوانین کے مطابق بننے والے جوڑوں کی اولاد کو حلال ہی شمار کیا جائے گا۔ کیا اس نظریے کو رسم و رواج اور قوانین کے دیگر پہلوؤں تک بھی سرایت دی جا سکتی ہے؟ ایسے فقہاء بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ غیر مسلم ریاستوں میں رہنے والے مسلمانوں کو وہاں کے قوانین کی پابندی کرنا چاہیے۔ اسی طرح ان ممالک کی عدالتوں کے فیصلے بھی انھیں قبول کرنا ہوں گے۔ اس فتوے کی بازگشت کہاں تک ہے، اس پر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ دنیا میں 180 کے قریب ممالک کے اپنے اپنے قانونی ڈھانچے موجود ہیں۔ عالمی قوانین اور معاہدے اس کے علاوہ ہیں۔ ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں پیش نظر موضوع پر پیش رفت کی ضرورت ہے۔

آخر میں ہم معاصر دانشور جناب عمار خان ناصر کی ایک تحریر سے ایک اقتباس نقل کر کے اجازت چاہتے ہیں:

> شاہ ولی اللہ نے انبیاء کی شریعتوں کے مختلف ہونے کا ایک بنیادی اصول یہ واضح کیا ہے کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ کسی قوم کو اس کی مالوف عادات اور

اخلاقی تصورات سے بالکل ہٹے ہوئے احکام وقوانین کا پابند نہیں بناتا جنھیں قبول کرنا لوگوں کے لیے ذہنی طور پر ممکن نہ ہو۔ اس لیے ہر پیغمبر اپنی قوم کے رسوم وروایات اور عادات و مالوفات کو ہی مادہ تشریع بناتے ہوئے ان میں صرف ضروری اصلاحات کرتا اور رسوم وقوانین کے پہلے سے موجود ڈھانچے کو ہی اپنی تائید اور مناسب اضافوں کے ساتھ بطور شریعت جاری کر دیتا ہے۔

اس موضوع پر کہنے کو اور بہت کچھ ہے، اس نشست میں اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

□

۳۔ ۲۔ ریاستی قوانین کی شرعی حیثیت

۳۔ ۲۔ ۱۔ بیشتر ریاستی قوانین پر علماء کو اعتراض نہیں

''ریاستی قوانین کی شرعی حیثیت'' ایک وسیع و عریض موضوع ہے اور اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ یقینی طور پر بعض ایسے ریاستی قوانین ہوتے ہیں کہ جو علماء کے فہم شریعت سے متصادم ہوتے ہیں۔ ایسے قوانین کے بارے میں تو علماء یہی کہیں گے کہ ان کو تبدیل کیا جائے لیکن بیشتر ریاستی قوانین ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے بارے میں علماء کی رائے مثبت ہوتی ہے یا پھر وہ اس کے خلاف رائے نہیں رکھتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے بارے میں تو ہمارے اس نقطہ نظر سے سب اتفاق کریں گے۔ تاہم ہر ملک کے اپنے قوانین ہوتے ہیں اور کئی حوالوں سے ہمارے ہاں کے قوانین سے مختلف ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ایسے ممالک جن کے بارے میں وہاں کے علماء کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ ان کی حکومت اسلامی ہے، ان کے قوانین کے بارے میں ان کی رائے ایسے ممالک سے یقیناً کئی پہلوؤں سے مختلف ہوتی ہے جن کی حکومتوں کو وہ اسلامی یا شرعی نہیں سمجھتے۔ البتہ اس سلسلے میں کچھ ایسے کلیات ضرور ہیں جن پر اتفاق رائے کیا جا سکتا ہے اور وہ ہر طرح کی ریاست کے حوالے سے کارآمد ہو سکتے ہیں۔

۳۔ ۲۔ ۲۔ ایک مجلس مذاکرہ

اسلام آباد میں ہم نے اسی موضوع پر ایک مجلس مذاکرہ کا انعقاد کیا جس میں مختلف آراء سامنے آئیں۔ بعض امور پر بظاہر لفظی اتفاق ضرور تھا لیکن ہماری رائے میں جب مرحلہ تطبیق اور تفصیل کا آئے گا تو وہاں بھی اختلاف رائے ظاہر ہوگا۔ مثلاً اس پر تو سب کا اتفاق تھا کہ قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی نہیں ہو سکتی۔ اب قرآن و سنت کے فہم کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس فہم میں بھی بہت ساری چیزیں مشترک ہیں تاہم بعض چیزیں ضرور مختلف ہیں اور مختلف مسالک کا

ہونا اس کی شہادت کے لیے کافی ہے۔

۳۔۲۔۳۔استاد جوادی آملی اور ریاست کا حق قانون سازی

بیشتر فقہا کی رائے یہ ہے کہ جن امور میں قرآن وسنت کا حکم موجود ہے ان کے علاوہ ایسے بہت سے شعبے ہیں جہاں فقہ صرف اصول فراہم کرتی ہے اور ریاست کو قانون سازی کا حق دیتی ہے۔ ہم مثال کے طور پر معروف فقیہ استاد جوادی آملی کا نظریہ پیش کرتے ہیں جو یقینی طور پر قابل ملاحظہ ہے:

> ”ریاستی قانون کا اصلی محور جزئی موضوعات ہیں جن کے بارے میں فقہ نہایت کم بحث کرتی ہے۔ فقہ خاص ابواب میں عبادی موضوعات کو بیان کرتی ہے جو سماجی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، زرعی وغیرہ کی مانند نہیں ہیں۔ قانون مساقات (آبیاری)، قانون مزارعہ (زرعی)، قانون مغارسہ (شجرکاری) اور دوسرے سینکڑوں قوانین فقہ میں پائے جاتے ہیں لیکن ان کی جزئی شرائط کیا ہیں؟ قانون مغارسہ کے موارد کون سے ہیں؟ مغارسہ کیا ہے؟ مزارعہ کیا ہے؟ دسیوں قانونی شقیں ہیں جنھیں فقہ نے بیان نہیں کیا۔ انھیں بنائے عقلاء کے سپرد کیا ہے یعنی عام طور پر عقلاء اس کے بارے میں جو رائے رکھتے ہیں اسی کو فقہ نے قبول کرلیا ہے اور یہ شریعت کے تائید شدہ مسائل میں سے ہیں۔ اگر یہ سب بنائے عقلاء یا شریعت کی تائید کی وجہ سے ہے تو فقہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے کہ مساقات (آبیاری) میں کتنے پانی سے سیراب کیا جائے، کتنے دن پانی دیا جائے، کب پانی دیں۔ اسی طرح مغارسہ (شجرکاری) اور مزارعہ میں بھی ہے۔ آپ کو ایک یا دو مثالیں بھی نہیں ملیں گی کہ فقہ نے مغارسہ کے بارے میں کہا ہو کہ شراکتی ہو۔ سرمایہ ایک گروہ کا اور کام دوسرے گروہ کا۔ غرس، مساقات (آبیاری) سے جدا ہے۔ مساقات یعنی آبیاری، مزارعہ یعنی فصل اٹھانا۔ یہ سب عقلی قوانین ہیں۔ یہ مسائل لوگوں کو پیش

آتے ہیں، ان سب کے لیے قانون چاہیے لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی
فقہ میں موجود نہیں ہے۔ آپ قانون مغارسہ کو کہاں سے اخذ کریں گے؟
لیکن ان شقوں کی تحقیق فقہی قوانین کی حدود میں ہوتی ہے کہ یہ قوانین فقہی
اپنے بنیادی اصولوں کو ماخذ سے اخذ کرتے ہیں۔''

۳۔۲۔۴۔ فقہی جزئیات اور چند شعبے

ہم دیگر چند شعبوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں جن کے بارے میں فقہ نے جزئیات بیان نہیں کیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم یہ کہیں کہ انھیں فلاں فقہی قاعدے کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے۔ تاہم جزئیات پھر بھی عقل انسانی کو خود اخذ کرنا ہوں گی۔ مثلاً شہر سازی اور ٹاؤن پلاننگ کے اصول و قواعد۔ شہروں کے اندر اور شہروں اور ملکوں کے مابین سفر کے قوانین۔ ٹریفک اور ڈرائیونگ کے قوانین وضوابط۔ ملک سے باہر مال لے جانے اور لے آنے کے قوانین یعنی بین الاقوامی تجارت سے متعلق قوانین۔ یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکولوں کے قیام اور انھیں چلانے کے قوانین۔ اساتذہ کے انتخاب کے معیارات اور طریق کار۔ فوج اور سرکاری اداروں میں بھرتی کے قوانین۔ سمگلنگ اور منشیات کی نقل وحمل سے متعلق قوانین۔

ان تمام شعبوں میں جو قانون سازی کی جائے گی ان کی پھر شرعی حیثیت کیا ہوگی۔ ان میں بیشتر ایسے شعبے ہیں جن کے بارے میں اسلامی اور غیر اسلامی سب حکومتوں کو قانون سازی کرنا ہوتی ہے۔ بعض جزئی امور میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شریعت کی رائے یہ ہے مثلاً منشیات کے استعمال میں شریعت اپنا ایک نظریہ رکھتی ہے لیکن اس کے بارے میں قوانین بہت وسیع اور متنوع ہیں، عالمی بھی ہیں اور ریاستی بھی۔

قرآن حکیم نے رسولوں کو بھیجنے کا مقصد ایک مقام پر یوں بیان کیا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ
النَّاسُ بِالْقِسْطِ[1]

[1]) حدید:۲۵

ہم نے اپنے رسولوں کو بینات اور واضح دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان بھی نازل کی تا کہ وہ انسانوں کے اندر قسط وعدل قائم کریں۔

بعض پہلوؤں سے قسط وعدل کا فہم مختلف ہوسکتا ہے لیکن قانون کے مساویانہ نفاذ کو یقینی طور پر عدل کی روح قرار دیا جائے گا۔ اگرچہ خود قانون کیا ہو اس پر بھی رائے مختلف ہوسکتی ہے۔ ہمیں انسانی معاشرے میں اس حوالے سے عدل وقسط کی حقیقت اور قانون کے نفاذ کے مابین ہم آہنگی دریافت کرنا ہوگی۔

بعض قوانین ہم فقہ میں مروج بعض قواعد کے تحت بھی بیان کرسکتے ہیں۔ مثلاً قواعد استنباط میں ایک قاعدہ ''لاضرر ولاضرار'' بھی ہے۔ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ٹریفک اور ڈرائیونگ کے قوانین اس قاعدے کے تحت قرار پاتے ہیں۔

دین نے بعض اخلاقی احکام بھی دیے ہیں۔ ان میں سے بعض کے لیے ممکن ہے کوئی حد یا تعزیر بیان نہ کی گئی ہو البتہ حکومت جہاں ضروری سمجھے وہاں قانون سازی کرسکتی ہے یعنی ایسے امور میں جہاں شریعت نے پہلے سے کوئی قانون نہ بنایا ہو اور شریعت کی منشاء سے متصادم نہ ہو بلکہ ممکن ہے کہ اس کی منشاء سے ہم آہنگ ہو، قانون سازی کی گنجائش سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔۲۔۵۔ ہر جگہ مذہبی اصطلاحات ضروری نہیں

ہم اپنے اس سوال پر واپس آتے ہیں کہ پھر اہل شریعت ایسے امور میں جائز وناجائز کا حکم بیان کریں گے یا نہیں۔ ہم ذاتی طور پر تو بہت سی جگہوں پر رائج مذہبی اصطلاحات کا استعمال ضروری نہیں سمجھتے لیکن وہ افراد جو ہر جگہ پر ایک فقہی اور شرعی رائے کا وجود ضروری سمجھتے ہیں انھیں بہرحال ایسے سوالوں کا جواب دینا چاہیے:

۱۔ جن چیزوں کی خرید وفروخت شریعت نے حرام قرار نہیں دی کیا ان کی سمگلنگ جائز ہے؟

۲۔ کیا ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی جائز ہے؟

۳۔ کیا حکومت کو انفرادی ملکیت میں اجتماعی مقاصد کے لیے تصرف کا حق حاصل ہے۔

یہ اور ایسے بہت سے سوالات ہیں۔ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اگر پہلے دو سوالوں کا جواب ''ہاں'' میں دے دیا جائے تو معاشرہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی اس ''ہاں'' پر خطرے سے دوچار ہو سکتی ہے۔ ان مسائل کی تفصیلات ہیں لیکن ہم یہاں فقط اشارہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح تیسرے سوال کا جواب اگر نفی میں ہو جائے تو بہت سے اجتماعی منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ حدود و قیود تو ہر مسئلے کی ہوتی ہیں اور بہت سے مسائل میں استثناءات بھی ہوتے ہیں تاہم ان سوالوں کا واضح جواب دیا جانا ضروری ہے۔ کیا فقہا یہ کہیں گے کہ سمگلنگ ہر نوع کی اور ہر چیز کی حرام ہے کیونکہ اس سلسلے میں بنائے گئے قوانین معاشرے اور ملک کے تحفظ کے لیے ہیں۔ اسی طرح سے کیا اہل شریعت یہ کہیں گے کہ ٹریفک کے قوانین جان اور مال کی حفاظت کے لیے بنائے گئے ہیں اس لیے ان کی خلاف ورزی شرعاً ناجائز ہے۔

اس موضوع پر کہنے کو اور بھی بہت کچھ ہے، تاہم اس مضمون میں ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

□

۳۔۳۔شریعت اور آئین

پاکستان میں شریعت اور آئین کے حوالے سے بحثیں جاری رہتی ہیں۔ ہمارے لکھاری بھی اس موضوع پر مشق سخن کرتے رہے ہیں۔ایک دینی طالب علم کی حیثیت سے ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ اس حوالے سے چند معروضات اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کریں۔

۳۔۳۔۱۔قرآن وسنت کی موجودگی میں آئین

یہ آج کی بات نہیں بلکہ ہم ایک عرصے سے ایک گروہ کی طرف سے یہ پڑھتے اور سنتے آرہے ہیں کہ جب قرآن وسنت موجود ہے تو پھر آئین کی کیا ضرورت ہے۔ یہ لوگ دراصل سمجھتے ہی نہیں ہیں کہ ریاست کیا ہوتی ہے اور اسے آئین کی ضرورت کیوں ہوتی ہے۔ پاکستان یا کسی بھی ملک کا آئین اٹھا کر اگر یہ لوگ دقت نظر سے دیکھیں تو یہ کوئی ایسا مخمصہ نہیں کہ جو سمجھ نہ آسکے۔مثلاً پاکستان کا آئین یہ بتاتا ہے کہ وفاقی حکومت کیسے بنتی ہے، قانون سازی کا اختیار کس کو ہے، پاکستان میں طاقت کے مراکز کون کون سے ہیں، عدلیہ کیسے معرض وجود میں آتی ہے، فوجی سربراہ کیسے بنتے ہیں، فوج کے اختیارات کیا ہیں، صوبوں میں حکومتیں کیسے بنتی ہیں، صوبوں اور وفاق کے درمیان تعلقات کی بنیاد کیا ہے، بنیادی انسانی حقوق کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔کیا یہ ساری باتیں قرآن و سنت میں صراحت سے بیان ہوئی ہیں؟ کیا قرآن وسنت میں صوبوں اور وفاقی حکومت کے مابین تعلقات کار کو بیان کیا گیا ہے؟

البتہ پاکستان کے آئین میں یہ بات واضح طور پر لکھی گئی ہے کہ اس کا کوئی بھی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہوگا نیز حکومت عوام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق عمل کرنے اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے مدد کرے گی۔اسی طرح کی دیگر شقیں بھی موجود ہیں۔ظاہر ہے کہ قرآن وسنت سے راہنمائی حاصل کر کے اور قرآن وسنت میں بیان کیے گئے اصولوں کو سامنے رکھ

کر زندگی کے تمام امور انجام دیے جاسکتے ہیں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر بات اور ہر دور میں پیش آنے والی ہر ضرورت کو قرآن وسنت میں واضح طور پر لکھ دیا گیا ہے۔

> ''قرآن وسنت کے ہوتے ہوئے کسی آئین کی ضرورت نہیں'' اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ آئین کو قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں بنایا جاسکتا ہے تو پھر یہ بات درست ہے لیکن اگر اس کا وہی مطلب ہو کہ کسی ریاست کو کسی دور میں آئین کی کوئی دستاویز درکار نہیں کیونکہ قرآن وسنت ہمارے پاس موجود ہے تو پھر سادہ ترین لفظوں میں اور نہایت احتیاط کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ''یہ ایک ایسا اشتباہ ہے جو کہنے والے کی نادانی پر دلالت کرتا ہے۔''

۳۔۳۔۲۔آئین وقانون کی زبان

بعض احباب کو آئین اور قانون کی کتابوں کے انگریزی میں ہونے پر بھی اشکال اور اعتراض ہے۔ان کا اس پر بھی اصرار ہے کہ اصطلاحیں بھی عربی یا فارسی میں ہونا چاہئیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس پر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تھوڑی سی عقل رکھنے والا شخص بھی اس پر غور کرے تو ایک خندۂ استہزا کے سوا اسے کم ہی کسی ردعمل کا مستحق سمجھے۔

قرآن وسنت آسمانی تعلیمات کا سرچشمہ ضرور ہیں لیکن کیا یہ تعلیمات فقط عرب دنیا کے لیے ہیں اور کیا دیگر زبانیں بولنے والوں کو ان کی زبانوں میں ان تعلیمات کو بیان نہیں کیا جاسکتا؟ قرآن حکیم کے مطابق زبانوں کا اختلاف اللہ کی آیات میں سے ہے۔اللہ کی کوئی زبان نہیں، زبان تو اس کے بندوں کی ہوتی ہے۔ سارے بندے اللہ ہی کے بندے ہیں اور بندے ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ اللہ نے ساری قوموں میں ہادی بھیجے ہیں اور قرآن ہی کے مطابق سارے نبی اپنی قوموں کی زبان میں بات کرتے رہے ہیں۔ سب نبی ایک ہی دین لے کر آئے ہیں گویا یہ دین ہر زبان میں بیان کیا جاسکتا ہے اور انبیاء ایسا کرتے رہے ہیں۔ ہمیں مفہوم اور معنی سے غرض ہونا چاہیے نہ کہ کسی خاص زبان سے۔ جو علمائے کرام اردو یا پشتو زبان میں آج

''شریعت'' کے نفاذ کے لیے بات کر رہے ہیں ہم نہیں سمجھتے کہ وہ کوئی غیر دینی زبان بول رہے ہیں۔ اگر کسی مولوی صاحب کو انگریزی زبان نہیں آتی تو یہ بات بھی قابل اعتراض نہیں البتہ انھیں چاہیے کہ وہ آئین اور قانون کی کتابوں کو سمجھنے کے لیے ان افراد سے مدد لیں جو ترجمہ کر کے انھیں بتا سکتے ہیں۔

بعض لوگ صدر اور وزیر اعظم کی اصطلاحوں کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خلیفہ اور امیر کے الفاظ استعمال کرنا چاہئیں۔ جو لوگ تاریخ پر نظر رکھتے ہیں جانتے ہیں کہ خود خلیفہ اور امیر کے الفاظ بھی عمل اور تعامل کے ساتھ ساتھ متشکل ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں عربوں کو عربی زبان ہی میں الفاظ اور اصطلاحوں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا انھوں نے اپنی زبان کے الفاظ سے استفادہ کیا اور جہاں ضرورت پڑی وہاں دیگر زبانوں سے الفاظ لے کر انھیں عربی رنگ ڈھنگ میں ڈھال لیا۔

۳۔ ۳۔ ۳۔ ''کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہوگا'' کی اہمیت

پاکستان کے آئین میں موجود یہ بات کہ ''کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنے گا'' اپنے اندر بہت سے امکانات لیے ہوئے ہے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ہر قانون قرآن وسنت کے مطابق ہوگا اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ قانون سازی کے لیے قرآن وسنت کے راہنما اصولوں کو سامنے رکھا جائے گا اور تیسرا پہلو یہ ہے کہ جس مسئلے میں قرآن وسنت کی واضح ہدایت نہیں ہوگی وہ مباحات کے دائرے میں آجائے گا اور مجلس قانون ساز اس میں قانون سازی کرنے میں آزاد ہو گی، بشرطیکہ پہلے دو پہلوؤں کو ملحوظ رکھا جائے۔

اصول فقہ میں ایک اصول ''الاصالۃ الاباحۃ'' کہلاتا ہے جس کی روح یہ ہے کہ ہر چیز مباح ہے مگر یہ کہ شریعت/ اسلام نے اس کے بارے میں کوئی حکم دیا ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آئین پاکستان کی مذکورہ بالا عبارت اس اصول کے مطابق ہے جو اپنے اندر بہت سی وسعتیں رکھتی ہے۔

۳۔ ۳۔ ۴۔ شریعت اور انسانی تجربات

شریعت میں انسانی تجربات کی کوئی حیثیت ہے یا نہیں۔ اس پر علمائے کرام نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے انسانی معاشرے میں رائج قوانین، رسوم اور

رواجات کے ساتھ تین طرح کا سلوک کیا:

الف) وہ قوانین یا روایات جو دینی مقاصد سے ہم آہنگ تھیں اور اس وقت کے معاشرے کے لیے آسانی سے قابل قبول بھی تھیں انھیں آپ نے من وعن قبول کرلیا۔ اس کی مثال ایک آزاد مرد کے ناحق قتل پر 100 اونٹوں کی دیت کی روایت تھی جو آنحضرتؐ کے دادا بزرگوار حضرت عبدالمطلب سے منسوب تھی، اسے آپؐ نے قبول کرلیا۔

ب) وہ رواج یا روایت جو آپؐ کے الٰہی مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ نہ تھی اور اس میں اُس دور کے حالات کے مطابق کچھ ترمیم کی جاسکتی تھی، اس میں آپؐ نے ترمیم کردی۔ اس کی مثال مردوں کو ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار عورتوں سے بیک وقت شادی کی اجازت ہے جبکہ قبل ازاں اس پر کوئی حد اور قدغن عائد نہ تھی۔ اس موضوع کی مزید بھی تفصیلات ہیں جس کا متحمل یہ مضمون نہیں ہوسکتا۔

ج) بعض رواج آنحضرتؐ کے الٰہی مقاصد کی ضد تھے اور ان کا خاتمہ آپؐ کی نظر میں ضروری تھا۔ آنحضورؐ نے انھیں ختم کرنے کے لیے اقدام کیا۔ اس کی مثال ''ربا'' کا خاتمہ ہے۔

بعض امور میں آپؐ نے نئی قانون سازی بھی کی اس کی مثال خواتین کو وراثت میں شریک کرنا ہے۔

اب ہم اپنے سوال کی طرف لوٹ کر آتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ شریعت میں انسانی تجربات کی کوئی حیثیت ہے یا نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آج بھی مختلف انسانی معاشروں میں رائج رسوم، رواجات اور قوانین پر اسی طرح نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ نیز انسان نے تجربات سے جو نئی چیزیں سیکھیں ہیں ان سے بھی استفادہ کرنے کی ضرورت ہے، یہ تجربات چاہے مغرب میں کیے گئے ہوں چاہے مشرق میں۔

۳۔۳۔۵۔ آئینی حکومتوں کا قیام

آئینی حکومتوں کا قیام ایک بہت بڑی انسانی یافت ہے۔ انسانی معاشروں میں کسی قانون اور دستور کے مطابق حکومتوں کا بننا اور چلنا ایک بہت بڑا ارتقاء ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ صدر اسلام

میں آنحضرتؐ کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئیں جن میں پہلے چار خلفاء کی حکومت بھی شامل ہے، وہ کسی لکھے ہوئے دستور اور آئین کے مطابق نہیں بنیں۔ یہاں تک کہ چاروں پہلے خلفاء مختلف انداز سے منصب حکومت پر فائز ہوئے۔ انسانی معاشرے کے ارتقاء کا سلسلہ جاری تھا وگرنہ لکھا ہوا دستور اور آئین موجود ہوتا تو ہوسکتا ہے کہ بہت سی مصیبتیں جو مسلمانوں پر آئی ہیں وہ نہ آتیں اور نہ ہی ملوکیت کا دور شروع ہوتا۔ بادشاہوں کی مرضی اور منشاء کے بجائے انسان کی اجتماعی فکر سے بننے والا نظام حکومت جس کے خدوخال کسی متفق علیہ دستاویز میں لکھ دیے گئے ہوں، کہیں زیادہ عوام کے لیے خیر خواہی کے پہلو رکھتا ہے۔ انسانی کاروان آج بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ انسان کا اجتماعی ضمیر کسی خاص گروہ، کسی خاص نسل اور کسی خاص مسلک کی حکمرانی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ایسے میں ماضی کی روشن مثالوں اور نمونوں سے سبق ضرور حاصل کرنا چاہیے لیکن اندھی تقلید کے بجائے عصری تقاضوں کو سامنے رکھ کر دین کی اصل روح کے مطابق معاشرے کو چلانے کی ضرورت ہے۔

۳۔۳۔۶۔شریعت کا مسلکی تصور

شریعت کے مسئلے میں بعض لوگوں کا تصور ان کے اپنے مسلک کے اندر ہی محدود ہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ مسالک آنحضرتؐ کے بعد معرض وجود میں آئے ہیں اور بیشتر آپؐ کی امت کے افراد کے مختلف ادوار میں غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ اس غور و فکر پر زمان و مکان کا پرتو بھی موجود ہے اور فقیہ کی ذمے داری بھی یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے لیے استنباط کرے۔ آج ہمیں نئے سرے سے نئے تقاضوں کی روشنی میں انہی بزرگوں کی سنت کے مطابق اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں دیگر مسالک کے علماء کی آراء اور دلائل پر بھی نظر ڈالنا چاہیے۔ نیز انفرادی اجتہاد کے بجائے اجتماعی اجتہاد کی روش کو اپنانا چاہیے۔ پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل اس کی ایک مثال ہے۔ یہ ایک مشاورتی ادارہ ہے لیکن موجودہ آئین پارلیمنٹ کو پابند نہیں کرتا کہ وہ اس ادارے کی سفارشات پر غور و فکر کرے۔ کونسل کی سفارشات پر اگرچہ آئین میں غور و فکر کرنے اور اس پر فیصلہ کرنے کا تقاضا کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے آئین

میں ترمیم کر کے کونسل کی سفارشات پر ایک خاص مدت میں غور وفکر ضروری قرار دینا چاہیے۔اس کونسل میں عام طور پر مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام ہوتے ہیں اور زیادہ تر سفارشات اتفاق رائے سے کی جاتی ہیں۔ان سفارشات پر کسی ایک مسلک کی مہر نہیں ہوتی اور عام طور پر تمام مسالک میں ان کے بارے میں حسن ظن پایا جاتا ہے۔یہ امر تمام عالم اسلام اور مسالک کے اندر متقید افراد کے لیے بہت سبق آموز ہے۔یہ ساری صورت حال مثالی تو نہیں مگر مثالی کی طرف آگے بڑھنے کے لیے ایک بنیاد ضرور فراہم کرتی ہے۔

۳۔۳۔۷۔اسلام حدود وتعزیرات سے شروع نہیں ہوتا

دنیا میں کوئی ایسا نظام قانون نہیں ہے کہ جس میں سزاؤں اور تعزیرات کا ذکر نہ ہو۔حقیقت یہ ہے کہ کوئی معاشرہ مجرموں کے لیے سزاؤں اور تعزیرات کے بغیر چل ہی نہیں سکتا کیونکہ انسان اپنے اختیار کی آزادی سے جہاں مثبت فائدہ اٹھاتا ہے وہاں اسے منفی طور پر بھی بروئے کار لاتا ہے۔اس لیے سزاؤں کا ہونا بہت ضروری ہے۔اسلام کے تصور قانون میں بھی مختلف درجے کے مجرموں کے لیے مختلف درجے کی سزاؤں کا ذکر موجود ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ بعض لوگوں کا تصور شریعت حدود وتعزیرات سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔دشمنان اسلام بھی اسلام پر طعن زنی کرنے کے لیے اس کے نظام سزا پر اعتراضات کرتے ہیں۔جہاں تک دشمنوں کا تعلق ہے ان کا جواب اسلام کے دانش مندوں نے اچھے انداز سے دے رکھا ہے اور وہ اس سلسلے میں اسلام کا موقف سنجیدگی سے بیان کرتے رہتے ہیں لیکن اپنے عاقبت نااندیشوں سے ہمیں یہ کہنا ہے کہ اسلام حدود وتعزیرات سے شروع نہیں ہوتا۔اسلام کا معاشرتی پہلو بہت انسان دوست ہے۔وہ بھوکوں کا کھانا کھلانے اور پیاسوں کو پانی پلانے سے شروع ہوتا ہے۔ایک خدا پرست انسان اللہ کے بندوں کو عیال اللہ سمجھ کر دیکھتا ہے۔اسلام میں قصاص بھی معاشرے کے لیے حیات بخش قرار دیا گیا ہے۔

سب سے پہلے کسی معاشرے کے لیے قانون کا ہونا ضروری ہے اور پھر اس قانون کا ہر کسی کے لیے مساوی ہونا ضروری ہے۔یہ بات اہم ہونے کے باوجود بعد کی ہے کہ وہ قانون کیسا ہو اور

کیا ہو۔ افسوس آج قاتل، دہشت گرد، دین نابلد اور وحشی شریعت کا پرچم لے کر ایک مسلمان معاشرے ہی کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا نبی رحمتؐ کی شریعت کے ترجمان وحشی بھی ہو سکتے ہیں، الامان والحفیظ۔ جن بیچاروں کو اتنا شعور نہیں کہ ایک ریاست کے لیے آئین کی کیا حیثیت ہے اور کیا آئین کی کسی ریاست کو ضرورت ہے یا نہیں، وہ آج شریعت کے علمبردار بن چکے ہیں۔ شریعت کا علم ان لوگوں کو اٹھانا چاہیے جو رحمت للعالمینؐ کے وارث بن سکتے ہیں، جو اللہ کے بندوں کے لیے خیر خواہ ہوں اور عصری تقاضوں کو سمجھ کر دین کی آفاقی تعلیمات کی روشنی میں انسانی معاشرے کی راہنمائی کر سکیں۔

۳۔۴۔اسلامی نظریاتی کونسل کی بعض سفارشات پر ردعمل

اسلامی نظریاتی کونسل نے 15 نومبر 2008 کو جو کچھ سفارشات پیش کیں ہیں جو اس کی اجتماعی اجتہادی کوششوں کا حصہ ہیں۔کوئی بھی اہل نظر اور عالم دین ان میں سے کسی رائے سے اختلاف نظر تو کر سکتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ پاکستان میں رائج عائلی قوانین نظر ثانی کے متقاضی ہیں۔عورت کی سماجی حیثیت اور کردار میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ قانون میں تبدیلی کا واقع نہ ہونا جمودِ فکر کی علامت ہے۔اجتہاد کے حقیقی طور پر دو عناصر ہیں ایک زمان اور دوسرا مکان۔ان کی تبدیلی سے فتویٰ یا قانون کا تبدیل ہو جانا عجیب نہیں ہونا چاہیے۔علاوہ ازیں مصلحت کے اصول کو تمام اجتہادی مکاتب کسی نے کسی صورت میں قبول کرتے ہیں۔عائلی مسائل پر اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی سفارشات میں کہا:

> ''یہ قانون بنا دیا جائے کہ بیوی اگر کبھی تحریری طور پر طلاق کا مطالبہ کرے تو شوہر نوے دن کے اندر اسے طلاق دینے کا پابند ہوگا، وہ اگر ایسا نہیں کرے گا تو یہ مدت گزر جانے کے بعد نکاح فسخ قرار پائے گا الا یہ کہ بیوی اپنا مطالبہ واپس لے لے۔اس کے بعد شوہر کے لئے رجوع کا حق نہیں ہوگا اور بیوی پابند ہوگی کہ مہر اور نان نفقہ کے علاوہ اگر کوئی اور اموال واملاک شوہر نے اسے دے رکھے ہیں اور اس موقع پر وہ انھیں واپس لینا چاہتا ہے تو فصلِ نزاع کے لئے عدالت سے رجوع کرے یا اس کا مال اسے واپس کردے۔''

ہمارے علم میں ہے کہ ان سفارشات پر ہر طرح کا وسیع ردعمل آئے گا۔اس ردعمل کی نوعیت علمی حدود میں رہے تو یہ سفارشات کو بہتر بنانے میں مددگار ہوگا لیکن اگر اسے مناظرے اور مجادلے

کی شکل دے دی گئی تو اس کے اثرات منفی ہو سکتے ہیں۔ تنسیخ نکاح کے حوالے سے عورت کے اختیارات کا مسئلہ ہمیشہ زیر بحث رہا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے خاص طور پر اس مسئلے کی طرف توجہ دی اور طلاق و تنسیخ نکاح کے تمام اختیارات مرد کے ہاتھ میں ہونے کے جو منفی نتائج مرتب ہو رہے تھے ان کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ہم اپنے معاشرے میں ایسے مسائل کا سامنا کرتے رہتے ہیں جن میں مرد عورتوں کو خواہ مخواہ اذیت دیتے ہوئے انھیں نہ صحیح طور پر بساتے ہیں اور نہ طلاق دیتے ہیں، یہاں تک کہ انھیں نان ونفقہ سے بھی محروم رکھتے ہیں۔ اس مسئلے کا ایک حل تو علماء نے یہ نکالا ہے کہ نکاح کے موقع پر ہی عورت شرط نکاح کے طور پر تنسیخ نکاح کا اختیار اسی طرح اپنے ہاتھ میں رکھ لے جیسے مرد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں نکاح کے مواقع پر جس طرح کی فضا ہوتی ہے اور لڑکی یا عورت اس موقع پر عموماً خاندانی امور سے جس حد تک نابلد ہوتی ہے اس کے پیش نظر یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ہر لڑکی یا عورت نکاح کے موقع پر ایسا اختیار رکھنے کی طرف متوجہ ہو یا ایسی جرأت کا مظاہرہ کر سکے لہٰذا حکومتی اور اجتماعی سطح پر اس مسئلے کی طرف توجہ ضروری ہو جاتی ہے۔

فتویٰ کا انفرادی طریقہ بھی ایسے معاملات میں بالعموم مشکلات پیدا کرتا ہے اور مفتیانِ کرام کے فتاویٰ کے اختلاف کی وجہ سے عام مسلمانوں کے لیے پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ایک اسلامی ریاست کو قدم آگے بڑھاتے ہوئے عوام کی مشکلات حل کرنے کے لیے قانون سازی کی ذمہ داری ادا کرنا چاہیے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا آئینی کردار یہی ہے کہ حکومت کے متعلقہ ادارے اسلامی حوالے سے قانون سازی کے لیے اس سے مشاورت طلب کریں یا وہ خود جس مسئلے پر ضروری سمجھے حکومت کو قانون سازی کا مشورہ دے۔

اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی مذکورہ سفارش ہماری رائے میں مزید غور وفکر کی متقاضی ہے۔ شیعہ فقہا کا نظریہ یہ ہے کہ عورت شوہر سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے اور اگر وہ طلاق نہ دے تو وہ خلع کے لیے حاکم شرع کی طرف رجوع کر سکتی ہے۔ یہ حاکم شرع اس وقت ایران میں تو خود حکومتی قاضی ہی بن چکا ہے۔ جب کہ عامۃ الناس اس مجتہد یا اس کے وکیل کی طرف رجوع

کرتے ہیں جس کے فتویٰ پر وہ اپنی عمومی زندگی میں عمل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستان جیسے ممالک میں کسی مرکزیت کا نہ ہونا اور شارحین کی آراء کا مختلف ہونا یقینی طور پر مشکلات پیدا کرتا ہے اور ہر شخص کسی ایسے فقیہ کے فتویٰ کی تلاش میں ہوتا ہے جو اس کی منشاء سے مطابقت رکھتا ہو اور یہ امر معاشرے میں فساد اور پراگندگی کا باعث بنتا ہے۔ تاہم ایسے فقہا بھی موجود ہیں جو نکاح وطلاق کے ریاستی قوانین پر عمل درآمد کو یا تو جائز گردانتے ہیں یا ریاست کے عدالتی فیصلوں کو ان امور میں شرعی طور پر بھی نافذ سمجھتے ہیں۔ جہاں تک نکاح کے معاملات ہیں عمومی رویہ علماء کی طرف سے یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی بھی معاشرے یا مذہب میں رائج طریقہ کار کے مطابق ہونے والی شادی کو وہ درست سمجھتے ہیں اور اس ذریعے سے ہونے والی اولاد کو وہ حلال زادہ جانتے ہیں۔ کم وبیش یہی صورت حال تقریباً طلاق یا عورت اور مرد کے ازدواجی رشتے کے انقطاع کے بارے میں بھی ہے۔ اسلامی ملکوں میں بالعموم نکاح کی سرکاری سطح پر رجسٹریشن کا طریقہ کار اختیار کیا جا چکا ہے جبکہ بعض ممالک میں طلاق کی سرکاری سطح پر رجسٹریشن کا طریقہ کار بھی جاری ہے۔ پاکستان میں جس وقت نکاح کی رجسٹریشن کا آغاز ہوا تھا تو بعض مذہبی حلقوں نے اس کے خلاف بھی زور وشور سے آواز اٹھائی تھی لیکن رفتہ رفتہ اب اس طریقہ کار کو قبول کر لیا گیا ہے۔ جہاں تک اس کے علمی پہلو کا تعلق ہے تو ہم اصولِ فقہ میں ''اصالة الاباحة'' کو اصل الاصول جانتے ہیں۔ عوام الناس کے لیے اس کی وضاحت یہ ہے کہ شریعت نے جس مسئلے پر بھی خاموشی اختیار کی ہے وہ مباح اور جائز ہے۔ لہٰذا جس امر سے شارع مقدس نے نہیں روکا اس کی مخالفت اہل علم کے لیے مناسب نہیں۔

اسی پس منظر میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ سفارش کہ ملک میں نکاح کی طرح طلاق کی رجسٹریشن ہونا چاہیے نہ فقط یہ کہ خلاف شریعت نہیں ہے بلکہ سماجی مسائل پر نظر رکھنے والا ہر شخص اسے معاشرے کی ضرورت قرار دے گا اور کسی چیز کے جواز کے لیے ایک راستہ معاشرے میں اس کی ضرورت کا پیدا ہو جانا بھی ہے۔

رویت ہلال کے مسئلے پر بھی کونسل نے ایک نیا طریقہ کار تجویز کیا ہے اور اسے خالص سائنسی طریقہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں اس شعبہ کے ماہرین ہی کسی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں کہ کیا پوری

دنیا کے لئے ایک ہی ہجری کیلنڈر ممکن بھی ہے یا نہیں؟ جہاں تک ہمارے علم میں ہے چاند کی ولادت اوراس کے قابلِ رؤیت ہونے کے درمیان ایک مدت ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ موضوع مزید بحث وتمحیص کا متقاضی ہے تاہم ہمیں اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اسے واقعی خالص سائنسی طریقہ سے حل کیا جانا ضروری ہے۔

آخر میں ہم اس بات پر ایک مرتبہ پھر زور دینا چاہیں گے کہ ان موضوعات کو عامیانہ بنانے سے علماء کی حیثیت مجروح ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں علمی طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے اور الزامات لگانے سے گریز کیا جانا چاہیے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے اراکین پر الزامات عائد کرنا اور ان کی پگڑی اچھالنا ہم کسی طور پر بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ ان میں وسیع مطالعات کے حامل اہل علم وفضل موجود ہیں جو ہماری سرزمین کے لیے ایک اثاثہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر دلیل ومنطق سے ان کی کسی رائے کی مخالفت کی جائے گی تو وہ اپنی کسی رائے پر غیر ضروری اصرار نہیں کریں گے۔ توہین وتضحیک اور الزام تراشی اہل علم وفضل کا شیوہ نہیں۔

باب چہارم

* * * * * * *

سماجی مباحث

□

۴۔ا۔ مذہبیات اور سماجی اخلاقیات

☆ یہ مضمون 2017ء کے اواخر میں اسلام آباد میں ایک مذہبی رہنما کی قیادت میں برپا دھرنے کی مناسبت سے لکھا گیا۔ اگرچہ اس میں مذکورہ دھرنے کے حوالے سے بعض عبارات آئی ہیں، تاہم دینی اخلاقیات اور دین کی سماجی تعلیمات کے پس منظر میں بعض کلی مسائل کے پیشِ نظر اسے شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ قارئین کرام اس کا مطالعہ اسی پس منظر میں کریں۔

۴۔ا۔ا۔ خوفِ فسادِ خلق

مذہبی شخصیات کی قیادت میں برپا دھرنوں کا ایک دور آخر کار اپنے اختتام کو پہنچا لیکن بہت سے سوالات اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ دھرنوں کے مذہبی قائدین کی دلیلیں، تاویلیں اور اندازِ بیاں کو سامنے رکھیں تو بہت کم لوگ حوصلہ کر پائیں گے کہ جو کچھ ان کے دل میں ہے اُسے آزادی اور آسانی سے کہہ سکیں۔ آزاد انصاری کا یہ معروف شعر شاید اسی کیفیت کو بیان کرتا ہے:

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

یہ کوئی آج کی بات نہیں، جبر کی تاریخ کا ہمیشہ یہی المیہ رہا ہے کہ بہت سی باتیں ان کہی رہ جاتی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے صحیح بخاری میں مروی ایک حدیث یاد آتی ہے جس کے مطابق:

''سعید مقبری سے روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو تھیلے علم حاصل کیا۔ ایک کو میں نے لوگوں میں پھیلا دیا جب کہ دوسرے کو اگر میں ظاہر کروں تو گلا

کاٹ ڈالا جائے۔''[۱]

بابا بلھے شاہ نے اگرچہ ملّاؤں کا بھیس چھوڑ کر بابوں کا بھیس اختیار کر لیا تھا جس کی وجہ سے ان کے لیے بہت کچھ کہنا اور بہت کچھ اختیار کرنا آسان ہو گیا تھا لیکن پھر بھی وہ یہ جانتے تھے کہ سچ کہنا اور دل کی بات زبان پر لانا کس قدر مشکل ہے۔ ان کی ایک نظم کا یہ بند زبان زد خاص و عام ہے:

جھوٹھ آکھاں تے کجھ بچدا اے
سچ آکھیاں بھامبڑ مچدا اے
جی دوہاں گلاں توں جچدا اے
جچ جچ کے جھوا کہندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

شاید ہماری بھی کیفیت کچھ یوں ہی ہے اور اب بات جو منہ پر آ چکی ہے وہ ادا کرنے ہی کے لیے چند سطور لکھنے کی جرأت کی جا رہی ہے۔

۴۔۱۔۲۔ ہماری بصیرت کا افق دھندلا گیا ہے

ہماری رائے یہ ہے کہ دین کا مجموعی تصور مضمحل ہو گیا ہے۔ خدا، شریعت، بندہ، حکم، قانون گویا ہر تصور گہنا گیا ہے۔ جان کی امان ملے یا نہ ملے لیکن کہے بغیر چارہ نہیں:

اُس کا میں سوچوں تو دل ڈرتا ہے جاں جاتی ہے
نام جس چیز کا ملّا نے خدا رکھا ہے

ایک روز ایک مولوی صاحب برادر عزیز جناب آصف لقمان قاضی سے کہہ رہے تھے کہ آپ میں ساری خصوصیات ایک دینی شخصیت کی موجود ہیں بس ایک ٹوپی کی کمی ہے، آپ اپنے والد صاحب کی طرح کی ٹوپی ہی اپنے سر پر رکھ لیں تو یہ کمی پوری ہو جائے گی۔

ایک دینی شخصیت کا جو تصور مولوی صاحب نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھا تھا، ہم کتنی دیر تک اُس پر غور کرتے رہے۔

---

۱) صحیح بخاری جلد اول، کتاب العلم، حدیث نمبر ۱۲۰

ہم سمجھتے ہیں کہ متون دینی میں سب کچھ موجود ہے لیکن زوال آدمیت کہیے یا دینی معاشرے کی زبوں حالی، دینی ترجیحات کا ناقص فہم کہیے یا عصری تقاضوں سے عدم آگہی، جو بھی کہیے بعض افراد کی مذہبی شدت پسندی اور بعض مذہبی شخصیات کا رویہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ دینی اُفق بہت سی آنکھوں کے سامنے دھندلا چکا ہے۔ غم بالائے غم تو یہ ہے کہ جنھیں اپنی بصارت کی خبر لینا چاہیے وہ دھندلائے ہوئے اُفق ہی کو حقیقت کے عنوان سے بیان کر رہے ہیں۔

کہتے ہیں ایک شخص چشمہ پہنے بار بار آئینے کو صاف کر رہا تھا، ایک اور آدمی اسے دیکھ رہا تھا، اس نے بڑے پیار کے ساتھ اس شخص کا چشمہ اتارا اور اس کے شیشوں کو صاف کر دیا اور کہا کہ اب لگائیے، اب لگایا تو سمجھ آیا کہ آئینہ صاف تھا اپنی عینک کے شیشوں کا مسئلہ تھا۔

جس آدمی نے موصوف کا چشمہ اُتارا تھا آج وہ خوفزدہ ہے، چشمہ اتارے بھی تو خطرہ ہے اور کچھ کہے بھی تو خطرہ ہے۔

۴۔۱۔۳۔ ’’مذہبی لوگوں‘‘ کی زبان

اسلام آباد میں مذہبی جتھے کے قائد نے جو زبان استعمال کی اسے صرف عامیانہ نہیں کہا جا سکتا ،افسوس کہ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے ان کی غلاظت آمیز زبان کی تائید میں مذہبی کتابوں سے بعض روایات جمع کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ’’مولانا‘‘ جو زبان استعمال کر رہے ہیں وہ تو بڑی بڑی بزرگ ہستیاں استعمال کرتی رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خود مولانا بھی اتنی جرأت سے اپنی زبان کو ’’مذہبی‘‘ کہنے کے لیے تیار نہیں۔ شاید اسی کو کہتے ہیں کہ چمچہ دیگ سے زیادہ گرم ہے۔ فارسی میں اس کے لیے محاورہ ہے:

’’کاسه از آش گرم تر است‘‘

اس معاملے کا یہ پہلو کتنا تکلیف دہ ہے کہ ’’مولانا‘‘ بزعم خویش اسلام کے عظیم مقتدیٰ و پیشوا خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کے عقیدے کی حمایت میں ’’مصروف جہاد‘‘ تھے۔ وہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کے بارے میں قرآن حکیم کہتا ہے:

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ[۱]

اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد گرامی ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق[۲]

یقیناً میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

بہر حال کوئی حقیقی دین داران کی گالیوں سے لتھڑی ہوئی زبان کو اسلامی تعلیمات کا ترجمان قرار نہیں دے سکتا۔ آپ کا بیان کیا ہوا مقصد آپ کے ہر عمل اور قول کی توجیہ نہیں کر سکتا۔ قول و عمل کو بہر صورت آپ کے مقصد سے ہم آہنگ ہونا ہے۔

اس سلسلے میں یہ حدیث بھی قابل ملاحظہ ہے جو حضرت انسؓ بن مالک سے مروی ہے:

لم یکن النبی صلی اللہ علیه و آله و سلم سباباً و لا فحاشاً و لا لعانا

(بخاری، ج ۸، ص ۱۳، ح ۶۰۳۱، کتاب الادب)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز گالی نہ دیتے فحش گوئی نہ کرتے اور نہ لعن طعن کرتے۔

ایک صحابیؓ نے رسول اللہؐ سے عرض کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے تو آپؐ نے دیگر نصیحتوں کے علاوہ اسے یہ بھی فرمایا:

لا تسبن أحداً[۳]

کسی کو بھی گالی نہ دینا۔

سب سے بڑھ کر تو اہل ایمان کے لیے قرآن حجت رکھتا ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ[۴]

---

۱) القلم:۴

۲) مسند البزار

۳) مسند احمد، ج ۳۴، ص ۲۳۹، ح ۲۰۶۳۶، بیروت، موسسہ رسالۃ، ط اول، ۲۰۰۱

۴) انعام:۱۰۸

جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو پکارتے ہیں انھیں گالی نہ دو کیونکہ اس طرح وہ دشمنی میں بغیر علم کے اللہ کو گالی دینے لگیں گے۔

۴۔۱۔۴۔ جائز مقصد اور ناجائز وسیلہ

رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو بیان کرنے والے بعض عمیق نظر علماء نے آپؐ کی زندگی اور روش حیات سے چند اصول اخذ کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ آپؐ جائز مقصد کے لیے ناجائز وسیلہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ مقصد کا جائز ہونا آپ کے وسیلے کے ناجائز ہونے کے لیے جواز فراہم نہیں کر سکتا۔

دھرنے مذہبی حوالے سے ہوں یا سیاسی حوالے سے، ہمیں عوام الناس کے حقوق کو بہرحال سامنے رکھنا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ ہماری حکومتوں کے کان بھی ہاتھی کے کانوں جیسے ہیں اور جب تک کلہاڑی نہ ماری جائے انھیں متوجہ نہیں کیا جا سکتا لیکن پھر بھی عوام الناس کے حقوق کو پامال کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔ اس پر ہماری سیاسی اور مذہبی قیادت کو زیادہ غور و فکر کرنا چاہیے۔

یہ امر تاسف آور ہے کہ حکمرانوں نے جو کچھ بعد از خرابی بسیار کیا، اسے بہت پہلے کیا جا سکتا تھا۔ دانش و دانائی بازار سے نہیں ملتی ورنہ ان حکمرانوں کو چند پڑیاں خرید کر بھجوائی جا سکتی تھیں جن کی بصیرت کا یہ عالم ہے جس کا اظہار ختم نبوت کے حوالے سے قانون کی عبارتوں میں کی گئی قطع و برید کے بعد خسروان دوراں کی گفتار و رفتار سے ہوا، اس نے حکمرانوں کے دیگر سارے امور کو بھی دھندلا دیا ہے۔

۴۔۱۔۵۔ عوام الناس کو اذیت نہ دو

بہرحال ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مسالک کے علماء نے مختلف مواقع پر عوام الناس کو اذیت پہنچانے سے منع کیا ہے۔ ایک دینی مسئلے پر عمل کرتے ہوئے دیگر دینی احکام کو پامال کرنا دانشمندی نہیں کہلا سکتا۔ خاص طور پر جب بندگان خدا کے حقوق پامال ہوتے ہوں اور سماجی زندگی منفی طور پر متاثر ہوتی ہو تو اہل مذہب کو اپنے طرز عمل کا بار بار جائزہ لینا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے احساس جوابدہی کے ساتھ کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ سماجی زندگی میں خلل پیدا کرنے نیز پلوں اور راستوں کو بند

کرنے کے حوالے سے ہم ذیل میں بعض اہم علمائے کرام کی چند عبارتیں پیش کرتے ہیں:

ڈاکٹر سید حسنین احمد ندوی قاسمی نے ایک تفصیلی مضمون ''راستے کا حق'' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں انھوں نے راستوں کو صاف رکھنے اور رکاوٹوں کو ہٹانے کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کو بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> اسلام نے حقوق وواجبات کی فہرست میں راستہ کے حق کا اضافہ کیا اور اس بات کو یقینی بنانے کا حکم دیا کہ راستہ مسافروں کے لیے مامون ومحفوظ ہو اور انھیں دوران سفر کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، اس کے لیے کسی بھی تکلیف دہ چیز کو راستہ سے ہٹانا بھی ایک عبادت بنا دیا گیا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
>
> **الایمان بضع و سبعون شعبة أو بضع و ستون شعبة فأفضلها قول لا اله الا اللہ و أدناها اماطة الاذی عن الطریق**[۱]
>
> ایمان کے بہت سے شعبے ہیں ان میں پہلا کلمہ یعنی لا الہ الا اللہ اور آخری راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے۔
>
> انھوں نے ایک اور حدیث بھی نقل کی ہے جس میں فرمایا گیا ہے:
>
> **بینما رجل یمشی بطریق و جد غصن شوک علی الطریق فاخرہ فشکر اللہ له فغفر له**[۲]

راستہ چلتے ہوئے ایک شخص کو کانٹوں بھری ٹہنی نظر آئی تو اس نے اسے راستہ سے ہٹا دیا، اس پر اللہ نے اس کی مغفرت فرمادی۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے رسول اللہؐ کا یہ فرمان بھی نقل کیا ہے:

> **لقد رأیت رجلا یتقلب فی الجنة فی شجرة قطعها من ظهر الطریق**

---

۱) بخاری ومسلم

۲) بخاری ومسلم

کانت تو ذی الناس[۱]

ایک شخص صرف اس بنیاد پر جنت میں چلا گیا کہ اس نے راستہ میں موجود درخت کو کاٹ کر ہٹا دیا تھا جس سے لوگوں کو دشواری ہوتی تھی۔

رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا:

نزع رجل لم یعمل خیر أقط: غصن شوک عن الطریق أما کان فی شجرة فقطعه و القاه و اما کان موضوعا فأماطه فشکر الله له بها فأدخله الجنة[۲]

ایک شخص نے کوئی اچھا کام نہیں کیا سوائے اس کے کہ کانٹوں بھری ٹہنی کو ہٹایا جو راستے پر تھی یا درخت پر تو اس عمل پر اللہ نے اسے جنت میں داخل کر دیا۔

ان احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عوامی گزرگاہ سے کانٹوں کا ہٹانا بھی اللہ تعالیٰ کو کس قدر محبوب ہے لیکن اگر خود ہی کوئی گروہ راستوں میں دھرنا دے کر بیٹھ جائے اور کاروبار حیات کو مشکل بنا دے تو اسے بہرحال اپنے اللہ کے سامنے جواب دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اگر اس کے کاموں پر اس دنیا میں گرفت نہیں ہوگی تو بھی اس دنیا میں ضرور پوچھا جائے گا جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَه ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَه ۝[۳]

پس جس نے بھی ذرہ بھر خیر کا کوئی عمل کیا ہوگا تو وہ اسے دیکھے گا اور جس نے بھی ذرہ بھر برا عمل کیا ہوگا تو وہ بھی اسے دیکھے گا۔

خدا جانے انسانوں کو اذیت دینے والا شخص کیا سمجھتا ہے کہ وہ اپنے عمل کو خیر کے طور پر دیکھے گا

۱) مسلم

۲) ابوداؤد: ۵۲۴۰

۳) الزلزلہ: ۷و۸

یا شر کے طور پر، اسی طرح گندگی اور غلیظ گالیاں دینے والا شخص کیا ان گالیوں کو خیر کے پلڑے میں پائے گا یا شر کے پلڑے میں۔

دار العلوم دیو بند کے دار الافتاء سے سوال کیا گیا:

کیا مسجد سرکاری زمین میں تعمیر کرنا ٹھیک ہے اور مسجد کی آڑ میں راستہ کی زمین ہڑپ کرنا ٹھیک ہے؟[۱]

جواب:

۱۔ سرکاری زمین میں سرکار کی اجازت سے مسجد تعمیر کرنی چاہیے، سرکاری زمین میں بغیر سرکار کی اجازت سے مسجد تعمیر کرنا صحیح نہیں، اگر کسی جگہ سرکاری زمین پر مسجد تعمیر کرلی گئی ہے تو کوشش کرکے حکومت سے اجازت لے لینی چاہیے تاکہ وہ شرعی مسجد بن جائے۔

۲۔ راستہ کی زمین پر مسجد تعمیر کرنا یا مسجد کے کسی کام میں لانا درست نہیں۔

اس موضوع پر ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ جب مسجد کے لیے راستہ بند کرنا جائز نہیں تو کسی بھی اور کام کے لیے لوگوں کی گزرگاہ میں حائل ہونا کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ اگرچہ ہر قانون میں استثناءات ہوتے ہیں لیکن اس کا فیصلہ بھی اجتماعی بصیرت سے کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی ایک فرد کو ایسا فیصلہ خود سے نہیں کرنا چاہیے۔

آیت اللہ علی سیستانی نے اپنی توضیح المسائل کے مسئلہ نمبر ۲۵۵۴ میں بیان کیا ہے:

اگر کوئی شخص لوگوں کو مسجد یا مدرسے یا پل یا دوسری ایسی جگہوں سے جو رفاہ عامہ کے لیے بنائی گئی ہوں استفادہ نہ کرنے دے تو اس نے ان کا حق غصب کیا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مسجد میں اپنے (بیٹھنے کے) لیے جگہ مختص کرے اور دوسرا کوئی شخص اسے اس جگہ سے نکال دے اور اسے اس جگہ سے استفادہ نہ کرنے دے تو وہ گناہ گار ہے۔

ان تعلیمات اور فتاویٰ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دین نے ان سماجی مسائل کو بہت عمدگی سے بیان کردیا ہے۔ ہمارا ناقص فہم چیزوں کو بگاڑ دیتا ہے۔ دین کے اس فہم کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

۱) سوال نمبر ۵۸۸۵۷، مورخہ ۲ مئی ۲۰۱۵ء۔

۴۔۱۔۶۔عوام کے دکھ کچھ اور بھی ہیں

مسئلے کا ایک پہلو اور بھی ہے وہ یہ کہ ہمارے ''مولوی صاحبان'' بالعموم ایسے مسائل کے لیے باہر نہیں نکلتے جو عوام الناس کے لیے نہایت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ انسانوں کی مصیبتیں کم کرنے کے لیے وہ عموماً آواز بلند نہیں کرتے۔ آج پاکستان میں کتنے لوگ ہیں جو پینے کے صاف پانی سے محروم ہیں اور گندے پانی کی وجہ سے لاکھوں لوگ بیمار ہورہے ہیں اور اذیتوں میں مبتلا ہیں لیکن ہمارے مذہبی راہنما شاذ و نادر ہی اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔

پاکستان پر قرضوں کا ایسا بوجھ لاد دیا گیا ہے جس سے ہماری آزادی کے گروی ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا ہے لیکن حریت و آزادی کے نبوی تصور سے ہمارے مذہبی راہنما شاید بے خبر ہیں ۔انھوں نے اس کے لیے کبھی ایسی آواز بلند نہیں کی کہ لوگ یہ سمجھیں کہ انھیں عصری مسائل کا ادراک ہے اور انھیں پاکستان کے کروڑوں انسانوں کی آزادی بہت عزیز ہے۔

مجموعی طور پر سماجی اخلاقیات کے اعتبار سے سارا معاشرہ پستی کا شکار ہے۔ معاشرے میں سماجی ناہمواری اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے۔ سچ اور جھوٹ کی تمیز مٹتی چلی جارہی ہے۔ انسانی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ غریب گھرانوں کے بیمار علاج سے محروم ہیں اور تعویذ گنڈوں کے سحر میں مبتلا ہیں لیکن مذہبی قوت کا اظہار ایسی سماجی قباحتوں کے خاتمے کے لیے نہیں کیا جاتا۔

ہمارے معاشرے میں لاکھوں گھرانے ایسے ہیں جن میں خواتین کو ان کے حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے، شریعت نے انھیں اپنی زندگی کا ساتھی منتخب کرنے کی اجازت دے رکھی ہے لیکن ہمارا معاشرہ کم ہی انھیں یہ آزادی فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح خواتین کو جائیداد میں بھی ان کے حصے سے محروم کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ خواتین پر گھریلو تشدد کے خلاف ایک دنیا سیخ پا ہے لیکن ان ساری سماجی برائیوں کے خلاف اگر بھرپور آواز سنائی نہیں دیتی تو وہ مذہبی راہنماؤں کی ہے۔ مذہبی راہنما اگر ان ساری برائیوں کے خلاف بھی ایسے ہی علم بلند کریں کہ جیسے انھوں نے مذکورہ قانون کے حوالے سے بلند کیا ہے تو معاشرے میں یقینی طور پر ان کی حیثیت اس سے کہیں زیادہ ہو جو آج دکھائی دیتی ہے۔

۴۔۱۔۷۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے

ہمیں تو یہ خطرہ ہے کہ اگر اہل مذہب نے اپنے طرز عمل پر غور و فکر کر کے اس کی اصلاح نہ کی اور دینی حوالے سے اپنی ترجیحات کو آج کی انسانیت کے مسائل سے ہم آہنگ نہیں کیا تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان سے ہی مزید دور نہ ہوگا بلکہ دین سے بھی دور ہو جائے گا۔ اس کا تجربہ پہلے ہی مشرق و مغرب میں کئی مرتبہ کیا جا چکا ہے۔ اپنے تصور مذہب کو منوانے کے لیے شدت پسندی کے رویے نے کبھی اچھے نتائج مرتب نہیں کیے۔ اللہ کے قوانین اور سنتیں پائیدار ہیں، یہ بدلتی نہیں۔ ایسا نہیں کہ ایک کام اہل مغرب کریں تو اس کا اور نتیجہ نکلے گا اور اگر اہل مشرق کریں تو ان کا اور نتیجہ نکلے گا، ایک جیسے کام کا ایک جیسا ہی نتیجہ نکلے گا۔

۴۔۲۔دینی مدارس کے ذریعے سماج کی تشکیل

پاکستان کے دینی مدارس کے حوالے سے مطالعے کے کئی اہم پہلو ہیں ہم پیش نظر سطور میں ان مدارس کے ذریعے سماج کی جس انداز سے تشکیل ہورہی ہے اس پر مختصر بات کریں گے اور اس سے اخذ شدہ نتائج کی روشنی میں ایسی تجاویز تک پہنچا جاسکتا ہے جن سے ایک مطلوب مثبت اور کمال پذیر معاشرہ تشکیل پاسکے۔

۴۔۲۔ا۔مدارس کی مختلف تنظیمیں

پاکستان میں اس وقت پانچ طرح کے دینی مدارس موجود ہیں جن کی نمائندگی مندرجہ ذیل پانچ تنظیمیں کرتی ہیں۔

ا۔وفاق المدارس العربیہ (دیوبندی مکتب فکر کے مدارس کی تنظیم)
۲۔تنظیم المدارس اہل سنت (بریلوی مکتب فکر کے مدارس کی تنظیم)
۳۔رابطۃ المدارس العربیہ (جماعت اسلامی سے وابستہ مدارس کی تنظیم)
۴۔وفاق المدارس السّلفیہ (اہل حدیث مدارس کی تنظیم)
۵۔وفاق المدارس الشیعہ (شیعہ مدارس کی تنظیم)

ان مدارس کی تعداد کم وبیش 35 ہزار ہے جن میں 30 لاکھ سے زیادہ طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں۔ان میں سے تقریباً 25 ہزار مدارس وفاق المدارس العربیہ سے وابستہ ہیں۔باقی مدارس دیگر مختلف تنظیموں سے وابستہ ہیں۔البتہ مختلف مکاتب فکر کے ایسے کئی سو مدارس موجود ہیں جو ان میں سے کسی تنظیم سے وابستہ نہیں ہیں۔حفظ وتجوید کے مدارس نیز ابتدائی سطح کے مکتب اور مدرسے ان کے علاوہ ہیں۔

علاوہ ازیں وفاقی سطح پر ایک مدرسہ بورڈ قائم ہے۔بورڈ کے چیئرمین کے مطابق اس بورڈ

سے الحاق کے لیے 650 مدارس نے درخواست دے رکھی ہے۔ بعض صوبائی حکومتیں بھی صوبائی سطح کے مدرسہ بورڈ قائم کرنے کے لیے اقدامات کر رہی ہیں۔ البتہ سرکاری سطح پر ایسے تمام اقدامات ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔

۴۔۲۔۲۔ مذہبی مدارس اور فرقہ وارانہ فضا

مذہبی مدارس چونکہ فرقے کی بنیاد پر قائم ہیں اس لیے ان کے ہاں نصاب کے بعض اجزا کا مختلف ہونا ایک فطری امر ہے۔ اس کے علاوہ عقائد و کلام کی ایسی کتب بھی شامل نصاب ہیں جن میں دیگر مکاتب فکر کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ جب یہ تنقید مذہبی زبان اختیار کرتی ہے تو مخالف کو منحرف، گمراہ، بدعتی، باطل، کافر وغیرہ جیسے القاب سے نوازا جاتا ہے۔ اس سے طالب علم کے ذہن کی ساخت دیگر مسالک کے بارے میں ایک خاص طرح کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

دیگر مسالک کے بارے میں مدرسے کا استاد جو تشریحات پیش کرتا ہے اس کے لیے متعلقہ مسلک سے کسی وضاحت یا تاویل کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ غالب دہلوی نے اگرچہ کسی اور پہلو سے بات کی ہے لیکن اس موقع پر ان کا یہ شعر یاد آتا ہے:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

مسئلہ فقط نصابی اجزا کے اختلافی پہلوؤں کا نہیں بلکہ ایک خاص مکتب فکر سے متعلق مدرسے کی فضا ایک خاص طرح کے ذہن کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار مسلسل ادا کر رہی ہوتی ہے۔ اُسی مسلک کے بڑے علما اور خطیب مدرسے کا دورہ کرتے ہیں اور طلبہ سے خطاب کرتے ہیں۔ اپنے مسلک کی خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ ساتھ دیگر مسالک کی بزعم خویش کمزوریوں اور خامیوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ طالب علم کی ذہنی فضا عام طور پر خود اسلامی مکاتب فکر کے دیگر گروہوں کے مقابلے میں پروان چڑھتی ہے جب کہ دیگر ادیان کے بارے میں ان کا رویہ بغیر کسی مطالعہ کے ہی مخالفانہ ہوتا ہے۔

بعض مدارس میں دیگر ادیان اور مخالف فرقوں کے رد کے عنوان سے خصوصی کورسز کا اہتمام

بھی کیا جاتا ہے جن میں سے بعض کا دورانیہ دو برس تک کا ہوتا ہے۔ اس کے لیے خصوصی سرٹیفکیٹ جاری کیے جاتے ہیں۔ پریکٹیکل کے لیے فرضی مناظروں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بعد میں بیشتر شعلہ بیان خطباء اور مناظر انھی کورسز کے فارغ التحصیلان ہوتے ہیں۔ مناظرے کی ایک معروف کتاب ''رشیدیہ'' کا ذکر کرنا یہاں مناسب ہوگا جس میں سکھایا جاتا ہے کہ مناظرے میں مجیب (جواب دینے والا اور دفاع کرنے والا) نہیں بننا چاہیے بلکہ سائل (سوال کرنے والا اور اقدام کرنے والا) بننا چاہیے کیونکہ یوں فریق مخالف کو بآسانی زچ کیا جاسکتا ہے۔

۴۔۲۔۳۔مذہبی نصاب کی کہنگی

ان مدارس میں پڑھایا جانے والا نصاب عام طور پر کہنہ اور قدیمی ہے۔ کتابوں کی عبارتیں بھی قدیمی اور مشکل انداز کی حامل ہیں جن کے بارے میں عموماً خود علمائے مذاہب یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ لکھنے والوں نے ان میں اپنی علمی لیاقت اور قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ورنہ جس علم پر مبنی کتب پڑھائی جاتی ہیں ان کی تدریس کا اور ان کے مطالب کی تفہیم کا آسان راستہ اور پیرایہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ دقیق اور عام طور پر لاینحل عبارتوں میں طلبہ کا ذہن الجھا رہتا ہے۔ کتابوں میں دی گئی معلومات اگر انھیں معلومات کہا جائے تو ان میں سے بھی بہت سی عصری معلومات سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں۔ دین و مذہب کے بارے میں جدید سوالات کے جوابات کے لیے طلبہ کا ذہن تیار نہیں کیا جاتا۔ آج کی دنیا کے بارے میں معلومات دینی طلبہ کو بہم نہیں پہنچائی جاتیں۔

پاکستان میں رائج دینی مدارس کا نصاب بیشتر انگریزوں کے زمانے سے بدستور چلا آرہا ہے۔ اس نصاب کو درس نظامی کہتے ہیں۔ یہ نصاب برطانوی حکومت کے قائم کردہ جدید تعلیمی اداروں میں رائج ہونے والے نصاب کے مقابلے میں تشکیل دیا گیا تھا۔ اس میں زیادہ تر عربی زبان اور مذہبی مسائل کی تعلیم پر مشتمل قدیم کتب شامل کی گئی ہیں۔ مدارس کی تشکیل و تدریس مغربی اور جدید تعلیم کے مقابلے میں روایتی مذہبی تعلیم کے تحفظ کے جذبے سے تھی اس لیے اس میں سائنسی اور عصری مضامین شامل نہ تھے جبکہ انگریزوں کی آمد سے پہلے قدیم مدارس میں یہ مضامین بھی شامل رہے تھے۔ انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد بھی یہ مدارس اپنے نصاب میں خاطر

خواہ تبدیلی نہ لا سکے بلکہ تعلیم و تدریس کے نئے اسلوب اور نئے تجربات کی روشنی میں اپنے مضامین پر مبنی جدید کتب بھی ترتیب نہ دے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی مدارس کے فارغ التحصیلان اور جدید تعلیم یافتہ افراد کے مابین فکری و عملی اعتبار سے فاصلے بڑھتے چلے گئے۔

۴۔۲۔۴۔نصاب میں موجود خامیوں کی نشاندہی

مذہبی نصاب کی خامیوں اور کمیوں کو دور کرنے کے لیے معاشرے کے مختلف طبقوں کی طرف سے اظہار خیال ہوتا رہا۔مختلف ادوار میں حکومتوں نے بھی اس کمی کا احساس کیا اور مذہبی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کی کوششیں کیں۔خود بہت سے مذہبی علما نے بھی اس کا احساس کیا، اس پر اظہار خیال کیا اور اس کے بارے میں مقالے لکھے لیکن ان سب کوششوں کا اثر بہت سست رفتاری سے دیکھنے میں آیا۔مدارس کی طرف سے اکثر ایسی کوششوں کی مزاحمت کی گئی اور انہیں اپنی آزادی کے سلب کرنے کی کوششوں کے مترادف قرار دیا گیا۔البتہ خود بہت سے علما نے اپنے مدارس میں رائج نصاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان میں موجود کمیوں کی نشاندہی کی ہے۔اگر چہ یہ نشاندہی کرتے ہوئے وہ بہت محتاط رہنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ابن الحسن عباسی اپنی کتاب ''دینی مدارس''میں لکھتے ہیں:

> مذکورہ خوبیوں کے باوصف اس نصاب تعلیم میں کچھ خامیاں بھی ہیں اور عام علمی حلقوں میں اس بات پر پھر ایک بار زور دیا جا رہا ہے کہ موجودہ نصاب میں نئے تقاضوں، عصری مزاج اور ضرورتوں کے پیش نظر مزید تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ نصاب میں تبدیلیوں کی یہ آواز بالکل بے جا بھی نہیں اور مختلف حضرات اور حلقوں کی طرف سے پیش کی گئی نئی تجاویز اور تبدیلیوں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔[1]

۴۔۲۔۵۔وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی تجویز

ابن الحسن عباسی نے مدارس کے نصاب کے مختلف اجزا پر اظہار خیال کیا ہے اور اس کی بہتری

[1] ابن الحسن عباسی: دینی مدارس (کراچی، مکتبہ عمر فاروق، ۱۴۲۶ھ) ص ۶۷ و ۷۷

کے لیے تجاویز پیش کی ہیں۔ انھوں نے بعض اہم علما کے اقوال بھی اپنے نظریے کی تائید میں پیش کیے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد یوسف بنوری کی رائے کو وہ ایک جامع اور جاندار تبصرے کے عنوان سے نقل کرتے ہیں۔ مولانا یوسف بنوری کے چند جملات درج ذیل ہیں:

> عربی مدارس کے نصاب تعلیم کی تجدید وترمیم واصلاح کی ضرورت ہے، اس لیے نہیں کہ وہ اپنے زمانے میں کافی نہ تھا یا صحیح استعمال پیدا کرنے سے قاصر تھا، بلکہ علوم جدیدہ یا معلومات عامہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے، وقت کے تقاضے بدل گئے، طبیعتوں کے سانچے بدل گئے، اذواق و افکار میں فرق آگیا۔[۱]

۴۔۲۔۶۔ تدریسی اجزا میں معقولات کی کمی

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اہل سنت کے مدارس سے آہستہ آہستہ معقولات کے اجزا کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ فلسفے کی مخالفت ایک عرصے سے جاری ہے۔ اب علم منطق کی کتب کی مخالفت شروع ہو چکی ہے۔ فلسفے کی کتب تقریباً ناپید ہو گئی ہیں۔ منطق کی جو کتابیں رائج ہیں انھیں بھی ختم کرنے کے لیے آواز اٹھائی جا رہی ہے۔ چنانچہ ابن الحسن عباسی لکھتے ہیں:

> دینی مدارس کے نصاب کی دوسری خامی یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس نصاب میں عمر کا ایک معتد بہ حصہ ان علوم میں لگایا جاتا ہے جن کی حیثیت عصر حاضر میں آثار قدیمہ سے زیادہ نہیں، اس سلسلے میں منطق، فلسفہ، قدیم علم ہیئت اور قدیم علم کلام کی بعض کتابوں کا نام لیا جاتا ہے۔[۲]

ابن الحسن عباسی نے منطق کے خلاف ابن تیمیہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

> میں نہیں سمجھتا کہ اللہ تعالی مامون الرشید عباسی سے درگزر فرمائیں گے، میرا خیال ہے اس کو اس بات کی ضرور سزا ملے گی کہ اس نے امت مسلمہ کو منطق

---

۱) ابن الحسن عباسی: دینی مدارس، ص ۹۳ بحوالہ میری علمی ومطالعاتی زندگی۔ ص ۹۴ و ۱۰۳

۲) ابن الحسن عباسی: دینی مدارس، ص ۸۸ و ۸۹

و فلسفے میں مبتلا کیا۔[۱]

۴۔۲۔۷۔نتیجہ کلام

ان سطور کے حوالے سے ہمارے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک طرف کہنہ اور قدیم کتب اور ازکار رفتہ افکار کی تدریس اور دوسری طرف عقلی اور فکری استعداد میں اضافہ کرنے والے علوم کی تدریس کا رفتہ رفتہ خاتمہ اور جدید علوم اور مختلف حوالوں سے علمی پیش رفت سے بے خبری نیز تدریس اور مطالعہ کے قدیم طریقے یہ سب مل کر کیسا انسان ڈھالتے ہوں گے اور پھر وہ انسان اگر ایک خاص فرقے کے ساتھ شدید گہری نظری اور جذباتی وابستگی بھی رکھتا ہو تو وہ معاشرے کو کس طرف لے جانے میں اپنا کردار ادا کرے گا۔

ان مدارس سے فارغ التحصیلان دیگر شعبوں کے علاوہ مساجد کی امامت کا بھی رخ کرتے ہیں۔ یہ مسجدیں بھی فرقوں میں بڑھتی چلی جاتی ہیں ہر محلے ہر علاقے ہر گاؤں میں مختلف مسالک کے فارغ التحصیلان یا تارک التحصیلان اپنے فرقے کے افراد کو تلاش کرتے ہیں اور ان کی قوت کو مجتمع کرتے ہیں اور پھر ایک نئی مسجد بنانے کی کوشش کرتے ہیں یا کسی موجود مسجد میں اپنے لیے جگہ تلاش کرتے ہیں۔ انہی مسجدوں سے ان کی شعلہ بیانیاں رنگ لاتی ہیں اور معاشرہ تقسیم در تقسیم میں مبتلا ہوتا چلا جاتا ہے یا پہلے سے موجود تقسیم مزید گہری ہو جاتی ہے۔

اس موضوع پر مزید بھی غور و خوض کی ضرورت ہے اور مدارس کے حوالے سے کئی دیگر اہم پہلو بھی ہیں جن کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جانا چاہیے۔

[۱] ابن الحسن عباسی: دینی مدارس، ص ۹۰ بحوالہ کشف الظنون، ۱۸۹۳/ ۲

۴۔۳۔اقلیتیں اور خوف کی زندگی

اخلاق اور قانون تو یہی کہتے ہیں کہ پاکستان میں اقلیتوں کو بلاخوف زندگی گزارنا چاہیے لیکن کیا ایسا ہی ہے، کیا پاکستان میں اقلیتیں بلاخوف زندگی گزار رہی ہیں؟ اس سوال کا جواب ہم میں سے ہر ایک کو معلوم ہے اور یہ جواب لمحہ فکریہ بھی ہے اور دردناک بھی۔ البتہ یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا سب مسلمان اس ملک میں بلاخوف زندگی بسر کر رہے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ دونوں سوالوں کا جواب ملتا جلتا ہی ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خوف کی یہ فضا ایک ہی طرز فکر نے مسلط کر رکھی ہے۔ اگر شدت پسند تنظیموں اور گروہوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کا فکری افق ایک سا ہی دکھائی دے گا۔ ہوسکتا ہے کہ مختلف گروہوں کے نام مختلف ہوں تاہم طرز فکر اور شدت عمل ایک جیسی ہے۔

اقلیتوں پر خوف کے سائے کا معاملہ سماجی بھی ہے، مذہبی بھی اور انتظامی بھی۔ دہشت گردی کے خلاف قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کوششوں سے اس معاملے میں اگر ایک طرف بہتری آئی ہے تو دوسری طرف بعض مذہبی گروہوں کے متشددانہ طرز عمل میں اضافہ بھی دیکھنے میں آیا ہے بلکہ بعض ایسے گروہ منظر عام پر آئے ہیں جن کے بارے میں پہلے توقع نہیں کی جاتی تھی انھوں نے مذہبی جنونیت کے مظاہرے سے بہت سے سماجی مفکرین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں ریاست کو دیگر گروہوں کی نسبت یک گونہ تیزی کے ساتھ متحرک ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اقلیتوں کے حوالے سے اس گروہ کی شدت پسندی کا دائرہ دیگر گروہوں کی نسبت وسیع تر اور شاید جذباتیت سے زیادہ معمور ہے۔ تاہم کہا جاسکتا ہے کہ قانون کی عمل داری میں تو بہتری آئی ہے لیکن مذہبی اور سماجی سطح پر ابھی بہت سا کام ہونا باقی ہے۔

پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان چاہتے ہیں کہ دنیا بھر میں جن ممالک میں مسلمان اقلیتیں بستی ہیں وہ محفوظ رہیں، اپنی مذہبی رسوم آزادی سے ادا کریں اور سماج اور حکومت کی سطح پر

ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ ہو۔ بس اسی فکر کو اپنے ملک میں بسنے والی مذہبی اقلیتیوں کے لیے اپنانے کی ضرورت ہے۔ جو حقوق ہم غیر مسلم اکثریتی ممالک اور معاشروں میں مسلمانوں کے لیے چاہتے ہیں وہی حقوق ہمیں اپنے ملک اور معاشرے میں غیر مسلموں کو دینا چاہئیں۔

ہم تو اس سے بھی بڑھ کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان تو اپنے نبیؐ کو رحمۃ للعالمین مانتے ہیں، قرآن حکیم نے انھیں یہی لقب عطا کیا ہے تو پھر مسلمان کو پورے وجود سے پیغام رحمت ہونا چاہیے مسلمان ممالک میں بھی اور غیر مسلم ممالک میں بھی۔

پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں کو اپنی تاریخ اور اپنے قائدین کا پاکستان کے لیے تاریخی موقف پیش نظر رکھنا چاہیے، جس کے مطابق پاکستان اسی لیے معرض وجود میں آیا کہ ہندو اکثریت کے ملک میں مسلمانوں کو برابر کے حقوق میسر نہ تھے یا مسلمان راہنماؤں کو یہ اندیشہ تھا کہ انھیں انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستان میں دوسرے درجے کا شہری بنا دیا جائے گا۔ اگر یہ مقدمہ درست ہے تو پھر ہمیں پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کو دوسرے درجے کا شہری نہیں سمجھنا چاہیے؛ سماجی سطح پر بھی اور سرکاری سطح پر بھی۔ یہی وعدہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی 11 اگست 1947 کی تاریخی اور معرکۃ الآرا تقریر میں کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا:

> آپ آزاد ہیں، آپ آزاد ہیں اپنے مندروں میں جانے کے لیے۔ آپ آزاد ہیں اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے اور ریاست پاکستان میں اپنی کسی بھی عبادت گاہ میں جانے کے لیے۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، ذات یا نسل سے ہو ریاست کا اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔

شاید قائد کے اسی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے پاکستان کے بزرگ قانون دان اور سابق وزیر قانون ایس ایم ظفر نے کہا کہ: دوقومی نظریہ پاکستان بنانے کے لیے تھا بعد کے لیے نہیں، اب سب پاکستانی برابر کے شہری ہیں اب ملک چلانے کے لیے ایک قومی نظریے کی ضرورت ہے۔ یہ بات انھوں لاہور میں 17 دسمبر 2018 کو ایک بشپ کی کتاب کی تقریب رونمائی سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔

بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق ایک تجزیہ کار یاسر لطیف ہمدانی کہتے ہیں کہ محمد علی جناح نے صرف 11 اگست کی تقریر ہی نہیں بلکہ لگ بھگ اپنی 33 تقاریر میں اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں بات کی۔ پاکستان کے آئین میں بھی لکھا ہے کہ دستور، قانون اور اخلاقیات کی رو سے ہر شہری کو اپنے مذہب کے اعلان، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کا حق حاصل ہے۔

یہ درست ہے کہ آئین و قانون میں اقلیتوں کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا گیا ہے لیکن ان کے بعض تحریری حقوق کی فراہمی کے لیے کوئی میکانزم موجود نہیں ہے، جس کے تحت ان کو دیے گئے تحریری حقوق کی عملی ضمانت فراہم ہو سکے۔ اس کی ایک سنگین مثال اقلیتوں کے لیے ملازمتوں کے کوٹے پر عمل درآمد کا مسئلہ ہے۔

ایک اور تجزیہ کار کے مطابق ملازمتوں کا کوٹا جو تشکیل پاکستان کے ابتدائی دنوں میں 11 فیصد تھا اور اب کم ہو کر 5 فیصد رہ گیا ہے، اس پر بھی عمل درآمد کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قانون پر عمل درآمد کے لیے کوئی قانونی طریق کار موجود نہیں یہی وجہ ہے کہ 2017 کی ایک رپورٹ کے مطابق اس کوٹے پر تقریباً دو سے تین فیصد عمل کیا جاتا ہے۔

اس حوالے سے ایک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جس قدر ملازمتیں اقلیتوں کو فراہم کی جاتی ہیں وہ بیشتر معاشرے میں پست درجے کی سمجھی جاتی ہیں۔ یہ کیا قیامت ہے کہ اقلیتوں کو بیشتر خاکروب کی ملازمت فراہم کی جائے اور اس سے بڑھ کر بھی قیامت یہ ہے کہ کوئی سیاسی پارٹی اپنے ورکروں کو خاکروب کی ملازمت مہیا کر دے اور پھر وہ ملازمت پر حاضر ہونے کو اپنی کسرِ شان سمجھیں اور صرف تنخواہ لینے پر گزارہ کریں۔ کیا اعلیٰ درجے کی ملازمتیں مہیا کرنا اس کوٹے کے تقاضوں میں شامل نہیں۔ پاکستان کی تمام وزارتوں میں اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کوٹے کی فراہمی یقینی بنانے کی ضرورت ہے۔

آخر میں ہم پھر ایک مرتبہ اس امر کی جانب توجہ دینا چاہتے ہیں کہ معاشرے کے اندر انسان دوستی کے جذبات کی پرورش ضروری ہے۔ محبت اور رافت انسانیت کا ایک گراں قدر اور خوبصورت سرمایہ ہے۔ ہمارے وجود سے یہ بات ظاہر ہونا چاہیے کہ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ ہمیں

غیر مسلموں سے اسلامی عقائد کے اظہار کی توقع نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہم رات دن جن عقائد کا اظہار کرتے ہیں ان میں سے بھی بہت سے غیر مسلموں کے عقائد سے متصادم ہوتے ہیں۔ عقائد کا اختلاف اور افکار کی رنگا رنگی معاشروں میں ہمیشہ سے ہے اور تنگ نظری سے معاشرے تنزلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تنگ نظری ایک بیماری ہے جو قوموں کو اندر ہی اندر سے کھا جاتی ہے۔ اختلاف کو برداشت کرنا سیکھنا چاہیے۔ مسلمانوں کو خاص طور پر اپنے نبیؐ کی پیروی کرتے ہوئے دوسروں کے لیے محبت و رافت کا نمونہ بننے کی ضرورت ہے۔ بعض احباب بعض آیات و روایات کے ظواہر سے یک پہلو استفادہ کرتے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ رسول اسلامؐ نے جن کے سینے پر ان ساری آیات کا نزول ہوا، غیر مسلموں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا۔ وہ رویہ ہی ان آیات کے صحیح مفہوم کا تعین کر سکتا ہے۔ جس دین کو ساری انسانیت تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے اس کی پیامبری کے لیے ساری انسانیت کے لیے خیر کا جذبہ اپنے وجود میں پروان چڑھانا ضروری ہے۔

۴۔۴۔ جنسی مسائل سے بے اعتنائی

ہمارے معاشرے میں ویسے تو بہت سے مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی ہے اور بعض چھوٹے چھوٹے مسائل پر کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں لیکن جنسی مسائل سے بہت بے اعتنائی اور غفلت برتی جاتی ہے۔ ہمارے علمائے کرام بھی اپنے خطبات جمعہ میں سنجیدگی سے جنسی مسائل کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ بدکاری کے احکام بیان کر دینا کافی نہیں۔ بدکاری کی وجوہات کا جائزہ لینا اور ان کے حل کی طرف توجہ دینا بھی علماء اور سماجی مصلحین کی ذمہ داری ہے۔ ہمیں یہ بات نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ جیسے انسان کو بھوک اور پیاس لگتی ہے اسی طرح اللہ نے اس میں جنسی طلب بھی رکھی ہے۔ ہم اپنے بچوں کی بھوک اور پیاس دور کرنے کے لیے جتنی بھاگ دوڑ اور جس قدر جتن کرتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی ہم ان کے جنسی مسائل کے حل کے لیے نہیں کرتے۔

دوسری طرف آنکھ چرانے سے حقائق تبدیل نہیں ہوتے، چنانچہ ہماری غفلت کی وجہ سے معاشرے میں اس حوالے سے بے اعتدالی اور افراط وتفریط نے جنم لے لیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے جوانوں میں معاشی بلوغت دن بدن تاخیر کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے، جب کہ جنسی بلوغت کے جلد پہنچ جانے کے لیے جبلی تقاضے ہی نہیں بلکہ غیر فطری دعوت بھی معاشرے میں عام ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ گناہ کی دعوت تو عام ہے لیکن دعوت قبول کرنے والے کے لیے تعزیر اور سزا مقرر ہے۔

نشہ بھی تم ہی پلاؤ تم ہی بے ہوش کہو
اہل انصاف کی نظروں میں یہ کردار نہیں

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مسائل کو سنجیدگی سے لیا جائے اور انسانیت کا درد رکھنے والے لوگ ان پر غور وفکر کر کے ان کے حل کے لیے آواز اٹھائیں اور جن کے لیے میسر ہو وہ ان کے لیے

قدم بھی اٹھائیں۔

□

اس مسئلے کا ایک اور پہلو شادی بیاہ کے راستے میں ہماری خود اختیاری مشکلات بھی ہیں۔ ہم نے شادی بیاہ کے لیے دن بدن تقریبات کا اضافہ کر لیا ہے اور ہر تقریب مہنگی سے مہنگی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس سلسلے کو آسان بنانے کی ضرورت ہے۔ امراء ان مواقع پر اپنی دولت کی بے ہنگم نمائش کرتے ہیں۔ ہزاروں لوگوں کے لیے طرح طرح کے پکوانوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں، وہ ان تقریبات پر مختلف انداز سے بے تحاشا خرچ کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو شادی کی تقریب کے لیے دعوتی کارڈ اتنے مہنگے شائع کرتے ہیں کہ غریب آدمی انھیں دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔

کم وسائل افراد بھی اپنی نام نہاد ساکھ یا عزت کے غلط مفہوم کے پیش نظر شادی بیاہ کے موقع پر اپنے آپ کو مقروض کر لیتے ہیں۔ پھر یہ قرض سالہا سال ادا ہوتا رہتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس عزت کے حصول کے لیے یہ قرض حاصل کیا جاتا ہے وہ تو قرض خواہوں کے اصرار و تکرار کی وجہ سے خاک میں مل جاتی ہے۔ بیٹے یا بیٹی کے سسرال والوں کو بھی جلد معلوم ہو جاتا ہے کہ سب دکھاوا اور ریاکاری تھی۔ اب اس کا عذاب اس نو بیاہتا جوڑے ہی کو بھگتنا ہوتا ہے یا پھر ان کے والدین کو۔

شادی کے لیے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کا نکاح کے لیے رضامند ہونا بشرطیکہ کوئی قانونی یا شرعی مسئلہ بیچ میں حائل نہ ہو، ابتدائی طور پر ناگزیر ہے، جب کہ بعض علماء کے نزدیک اس کے لیے دو گواہ بھی ضروری ہیں۔ نکاح پڑھنے کے لیے بھی کسی مولوی صاحب کی ضرورت نہیں بلکہ لڑکا لڑکی یا کوئی غیر مولوی بھی یہ خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔ اس کے لیے پاکستانی قوانین کے مطابق رجسٹریشن بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ رہ گیا کنواری لڑکی کے لیے والد کی ولی کی حیثیت سے رضامندی تو یہ شرعی اعتبار سے اس درجے کی ضرورت نہیں ہے جیسی ہم عام طور پر سمجھتے ہیں۔ اگر شرعی ولی اپنی ذمہ داری پوری نہ کرتا ہو اور سہولت کار کا فریضہ جو اسے سونپا گیا ہے، اسے مناسب طریقے سے ادا نہ کرتا ہو تو پھر لڑکی اپنے باپ کی اجازت کی پابند نہیں ہے۔ جہاں تک ولیمے کا تعلق ہے تو اسے ضرور مستحب قرار دیا گیا ہے لیکن مستحب کو واجب نہ سمجھا جائے بلکہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک طرح سے معاشرتی طور پر اعلان کا طریقہ ہے۔ کسی مسجد میں باجماعت نماز کے بعد

نمازیوں کے سامنے نکاح کی سادہ سی تقریب کے ذریعے اس کا اعلان کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی اور آسان راستہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں خواہ مخواہ بعض چیزوں کو اپنی ناک کا مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔ ماں باپ اپنی خواہش کو زبردستی اپنی اولاد پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض خاندانوں میں یہ رواج موجود ہے کہ ان کی لڑکی کی شادی ان کے خاندان سے باہر نہیں ہوسکتی۔ اس رواج کی خلاف ورزی کے گا ہے بہت ہولناک نتائج سامنے آتے ہیں۔ یہ مسئلہ سماجی تو ہے ہی لیکن قانونی بھی ہے۔ اگر قانون نافذ کرنے والے ادارے اور افراد اپنی ذمہ داریاں ادا کریں اور جائز طریقے سے ایک دوسرے کو اپنا شریک حیات بنا لینے والے افراد کا تحفظ کریں تو ایسے مسائل سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

ہمارے ڈراموں میں عام طور پر اس موضوع پر توجہ دی جاتی ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ معاشرے کے اہل رائے افراد کو اور خاص طور پر سماجی امور میں فعال اداروں اور علماء کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ اس کردار کی عدم موجودگی کی وجہ سے یا تو معاشرے میں تہ در تہ گناہ کا سلسلہ جاری ہے یا پھر ہمارے جوان مختلف طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہماری جوان نسل بروقت شادیاں نہ ہونے کی وجہ سے اپنی صلاحیتوں کے نکھار اور اظہار سے بھی محروم ہے۔ وہ خود اعتمادی کی دولت سے بھی محروم ہوتی چلی جارہی ہے۔ جنسی ضرورت بہت منہ زور ہوتی ہے۔ اسے مناسب طریقے سے معاشرے میں راستہ نہ ملے تو پھر غیر مناسب راستوں سے نہیں بچا جاسکتا۔

بعض لوگ شرم کے مارے اس موضوع پر بات نہیں کرتے۔ طرح طرح کے نفسیاتی مسائل کا شکار نوجوان اس بارے میں کچھ کہہ بھی نہیں پاتے۔ ہمارے ہاں ایسے سماجی ادارے بھی نہیں جو اس مسئلے کو دردمندی سے حل کرنے کے لیے اقدام کریں۔ مذہبی نقطۂ نظر سے اس وقت جس طرح کی قدغنیں شادی بیاہ کے امور میں موجود ہیں ان کا بھی ازسرنو جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور جوانوں کی جنسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مناسب تجاویز سامنے آنا چاہئیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس خواہش کو بے لگام کر دیا جائے لیکن اس خواہش کو اچھی، باوقار اور خوبصورت لگام دینے کا

بھی اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک سے زیادہ شادی کی ہمارے مذہب میں اجازت سمجھی جاتی ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ معاشرہ عموماً اس کے راستے میں حائل ہو جاتا ہے اور اس سلسلے میں بہت سی سماجی بلکہ اب تو قانونی مشکلات بھی موجود ہیں۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ ہر مرد ضرور دوسری شادی کرے لیکن جس قدر اس کی اجازت موجود ہے اس قدر معاشرے میں اس کے لیے ہموار رائے موجود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے ہاں بیواؤں اور مطلقہ عورتوں کے لیے بھی شدید مشکلات ہیں۔ اگر مرد کو ضرورت ہو اور وہ دوسری شادی کرنا چاہے تو اس بات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے کہ بیوہ یا مطلقہ خاتون سے شادی نسبتاً اس کے لیے آسان ہو۔

حکومت جہاں جوانوں کو مختلف انداز سے برسر روزگار کرنے کے لیے فکر مند رہتی ہے، اسے بھی ان کے جنسی مسائل اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ماسٹر پلان بنانا چاہیے۔

یہ موضوع اس سے زیادہ وسیع اور پہلودار ہے جس قدر ہم نے اس پر بات کی ہے البتہ یہ توجہ دلانے کے لیے ہماری ایک ابتدائی کوشش ہے۔ ہم سماجی مصلحین اور علماء سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اس کے لیے زیادہ غور و فکر کرنے اور مسائل کا جائزہ لینے کے لیے اجتماعی تدابیر اختیار کریں۔

۴۔۵۔کثرت معلومات نے بے خبر بنا دیا

۴۔۵۔۱۔حجاب نور

اہل عرفان کہتے ہیں ''کثرت ظہور نے اُسے چھپا رکھا ہے''۔ یہ بڑی گہری اور خوبصورت بات ہے۔ وہ ایک حکایت بیان کرتے ہیں۔ایک روز سمندر میں ایک مچھلی دوسری سے کہنے لگی: بہن! میں نے سنا ہے کہ پانی کوئی بہت اہم چیز ہے، اس کے بغیر زندگی نہیں ہوتی۔تم نے اُسے کہیں دیکھا ہے؟ دوسری مچھلی نے پہلی سے کہا: دیکھا تو میں نے بھی نہیں لیکن سنا میں نے بھی یہی ہے۔ایک روز پانی کی ایک بڑی سی لہر نے پہلی مچھلی کو اٹھا کر ساحل پر پھینک دیا۔اُوپر سورج کی تمازت اور نیچے ساحل کی ریت، مچھلی تڑپنے لگی۔کوئی پاس کھڑا تھا کہنے لگا: یہ واپس پانی میں نہ گئی تو مر جائے گی۔کسی چیز کی بہتات اور کثرت عموماً اُس کی اہمیت سے غافل کر دیتی ہے۔ ہمارے لیے عام طور پر ہوا کا یہی حال ہے۔ امام حسینؑ ایک عارفانہ دعا و مناجات میں اللہ سے ''حجاب نور'' ہٹانے کی بات کرتے ہیں۔نور جو حقائق کو آشکار کرتا ہے گاہے خود حجاب بن جاتا ہے۔

شاید آنے والی بات کا بیان شدہ مطلب سے کوئی زیادہ تعلق نہ ہو لیکن اسے بھی پڑھ لینے میں کچھ مضائقہ نہیں۔اگرچہ آپ اسے خود کلامی کہہ سکتے ہیں۔آپ سے تو ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور نے انسان کو جتنا غافل و بے خبر کر دیا ہے اس کی مثال گذشتہ ادوار میں نہیں ملتی۔ کثرتِ آراء اور ہجومِ اطلاعات نے عجیب فضا پیدا کر دی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہر طرف دھول اُٹھی ہے اور اس طوفانِ گرد نے چہروں کی شناخت ختم کر دی ہے۔

دھول اٹھی ہے چاروں طرف
چہرے دھندلے دھندلے ہیں

ایسے میں پہچانے کون؟

کون سے اُجلے میلے ہیں

گرد کے اس گرداب نے اُجلے اور میلے کی تمیز ختم کر دی ہے۔

۴۔۵۔۲۔معلومات کی یلغار

ڈھیر ساری ویب سائٹس، یوٹیوب، فیس بک، گوگل اور جانے کیا کیا۔ ہزاروں ٹی وی چینل، بے شمار ریڈیو اسٹیشن، ان گنت اخبارات وجرائد، موضوعاتی وغیر موضوعاتی، مقامی، قومی اور بین الاقوامی۔ مقالات، انٹرویو، ٹاک شو، مذاکرے، سیمینار اور کانفرنسیں۔ کارٹون، فلم، ڈرامہ، موسیقی وغیرہ کے موضوعات پر الگ الگ چینل اور ویب سائٹس۔ اخبارات اور جرائد کی ویب سائٹس، حکومتوں اور اداروں کی ویب سائٹس۔ ایک ایک موضوع پر سینکڑوں آراء اور تجزیے۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ پھول کانٹوں میں گھرا ہے اور کوئی کہہ رہا ہے کانٹے پھول کی حفاظت کر رہے ہیں۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ جنگ امن کے لیے ہے اور کوئی کہہ رہا ہے ''ظلم رہے اور امن بھی ہو، کیا ممکن ہے تم ہی کہو۔'' دہشت گردی، انتہا پسندی، دھماکے، خودکش حملے، دہشت گردی کے خلاف جنگ اور خدا جانے کیا کیا۔ کوئی کہتا ہے ظالم مارا گیا، کوئی کہتا ہے ظالم نے مار ڈالا۔ کوئی کہتا ہے یہ آزادی کی تحریک ہے اور کوئی کہتا ہے یہ فتنہ وفساد ہے۔ کوئی پرندے کے مارے جانے پر غم کا گیت گا رہا ہے اور کوئی انسانی بدن کے اعضاء اکٹھے کرنے کا منظر پیش کر رہا ہے۔

۴۔۵۔۳۔طرح طرح کا ردعمل

ایسے میں بعض لوگوں نے اپنی پسند کے چینل یا اخبار یا موضوع کا انتخاب کر لیا ہے اور باقی تمام امور سے اپنے آپ کو لاتعلق کر لیا۔ بہت سے لوگ اس کثرتِ اطلاعات سے گھبرا کر اور کثرتِ آراء سے اُکتا کر چین کی وادی کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ بہت سے افراد ہر وقت کی اضطراب انگیز خبروں کی وجہ سے بیمار ہو گئے ہیں۔ بعض کا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے اور بعض ہارٹ اٹیک کے جاں گسل مرحلوں سے گزر چکے ہیں۔ بعض جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ ایسے میں فیصلہ کرنا اور ترجیحات طے کرنا انسان کے لیے دُوبھر بلکہ بہت حد تک ناممکن ہو گیا ہے۔ ''وکی لیکس'' جیسی

ویب سائنس نے اور طرح کے ہنگامے کھڑے کر دیے ہیں۔

۴۔۵۔۴۔ پتلی تماشا

یہ ہماری ترقی کا کمال ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا اس پتلی تماشے کے پیچھے نچانے والی انگلیاں بھی ہیں یا نہیں۔ کیا تماشا گر یہی کچھ چاہتا ہے جو تماشائیوں پر بیت رہی ہے؟ تماشا گر ایک ہے یا زیادہ ہیں؟ مختلف تماشا گر ہونے کی صورت میں مداریوں کے مقاصد کیا ہیں اور آخر کار اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

کیا انسان کو تھم کر اور ٹھہر کر سوچنے کا موقع مل سکے گا یا نہیں؟ کیا مداری ایسا ہونے دیں گے؟ میں نے کئی مرتبہ اکتا کر ریڈیو اور ٹی وی سننا اور دیکھنا بند کر دیا، کئی کئی ہفتے تک گاہے اخبارات پڑھنا بند کر دیے۔ پریشانی واضطراب میں آخر مجھے ایسے فیصلے کرنا پڑے۔ سچائی اور جھوٹ کے مابین حد فاصل میڈیا اور انفارمیشن کے اس ہنگامے میں کیسے تلاش کی جائے۔ تنہائی میں بیٹھ کر، ساری دنیا سے کٹ کر سوچنے لگتا ہوں تو کہیں قریب سے زبردست دھماکے کی آواز آتی ہے، کئی دفعہ گھر کی کھڑکیاں لرز اُٹھیں، ایمبولینس کی چیخوں نے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ گویا میں کمبل کو چھوڑنا بھی چاہوں تو وہ مجھے نہیں چھوڑتا۔ اس کیفیت سے دوچار ہر آدمی یہ کہتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ:

کاش کوئی مجھ کو سمجھاتا
میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا

یوں لگتا ہے کہ آج کا انسان پوری تاریخ انسانیت میں سب سے زیادہ بے خبر اور سب سے زیادہ مضطرب ہے۔

۴۔۵۔۵۔ طبیب درد آشنا کی ضرورت

کیا دنیا میں کچھ حکیم، دانشور اور فلسفی ایسے ہیں کہ جو اس مشکل سے نکلنے کے لیے انسانیت کی راہنمائی کر سکیں۔ کیا کوئی طبیب درد آشنا ہے جو اس درد کا مداوا کر سکے۔ گذشتہ دور کے لیے تو یہ بات سچ ہے کہ:

لفظوں کی نہ محتاج تھی یہ سوز کہانی
ہوتے تھے طبیبوں میں بھی کچھ رنج چشیدہ

البتہ بقول حالیؔ:

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا

آج کے اس اضطراب اور غفلت کا بھی ضرور کوئی علاج ہے۔

میں کیا اور میری بساط کیا، لیکن میرا خیال ہے کہ ''انفارمیشن ٹیکنالوجی'' کے مراکز جن کے ہاتھ میں ہیں انہی کی ''معرفت'' میں ہمارے سوال کا جواب پنہاں ہے۔

طاقتور ذرائع ابلاغ کن کے ہاتھوں میں ہیں؟

سب سے زیادہ اسلحہ کون بیچتے ہیں؟

سب سے زیادہ خطرناک اسلحہ کن کے پاس ہے؟

انسانیت کا سب سے زیادہ خون کون بہار ہے ہیں؟

انھیں ہی نہیں اُن کے وابستگان کو بھی پہچاننے کی ضرورت ہے۔ وہ کوئی سا لبادہ اوڑھ لیں، مذہب کا یا سیکولرازم کا، وہ ملا ہوں یا جدیدیت پسند دانشور۔

ہم یا قلب رنجور کے ساتھ معاشرے سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ جائیں یا مضطرب انسان کی نجات کی فکر کریں۔

یاد رہے کہ پہلی صورت تو قابل عمل نہیں۔

دوسری صورت ہی بچتی ہے آگے جو مزاج یار میں آئے۔

۴۔۶۔نئی ایجادات کے ثقافتی اثرات

۴۔۶۔۱۔ایجادات سے تبدیلی تو آتی ہے

انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب انسان شعور سنبھال رہا تھا تو اس نے اپنی ضروریات اور ماحول کے مطابق چیزیں ایجاد کیں، بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ ایجادات بھی نئی سے نئی سامنے آتی رہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہر اہم ایجاد اپنے ساتھ ایک نئی تبدیلی لیکر آتی ہے۔ جب انسان نے پتھر سے لوہے کا استعمال سیکھا، جانور کو سواری کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا تو اس سے اس کی زندگی میں ایک نئی اٹھان پیدا ہوئی۔ جب اس نے خود رو چیزوں کے علاوہ خود چیزیں اگانا شروع کیں تو ایک اور تبدیلی آئی۔ اسی طرح جب انسان پہلے سے زیادہ تیز رفتار ہو گیا یہ پہیے کی ایجاد کا کرشمہ تھا۔ ایک مرتبہ پھر ریڈیو اور ٹیلی فون کی ایجادات سے انسانی معاشرے میں بڑی واضح اور سریع رفتار تبدیلی آئی۔ اس سے انسان کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ، ایک ملک سے دوسرے ملک میں رابطے آسان ہو گئے۔ فاصلے سمٹنا شروع ہو گئے اور یوں انسان علاقائی دائرے سے نکل کر عالمی دائرے میں داخل ہو گیا۔ ایجادات کے ساتھ بدلتی ثقافت میں اگر کوئی چیز نہیں تبدیل ہوئی تو وہ انسان کی جمال پسند طبیعت اور علم دوست فطرت ہے۔

۴۔۶۔۲۔تغیر پذیر ثقافتیں

کچھ ظاہری تبدیلی کے بعض عناصر ایسے ہوتے ہیں جو انسان کے رہن سہن، اس کے لہجوں اور اس کے لباس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسان کی بہت ساری تخلیقات اس کی فطرت کی وجہ سے مشترک ہیں لیکن بعض ایسی چیزیں تخلیق ہوئیں جنھوں نے پوری انسانیت کو آپس میں جوڑ دیا۔ ان کے باعث ایسی ثقافت پروان چڑھی جس سے انسان ایک دوسرے کے

اور زیادہ قریب ہوگیا۔ انٹرنیٹ اس کی ایک واضح مثال ہے۔ موبائل فون کی ایجاد سے بھی ہماری زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

۴۔۶۔۳۔بعض ایجادات کے ہولناک نتائج

یہ ساری ایجادات جہاں ایک طرف ہماری زندگی کی ضروریات کی غمازی کرتی ہیں، وہاں ہمیں انسان کے لیے ان کے ہولناک اور تباہ کن اثرات بھی سامنے رکھنے چاہئیں۔ یہاں ایک اہم سوال چیزوں کے استعمال کا پیدا ہوتا ہے یعنی اس امر کا جائزہ لیا جانا کہ کسی چیز کا استعمال اس کے وجود کو منفی یا مثبت بناتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک چیز دوا کے لیے استعمال ہوتی تھی، وہ نشے کے لیے استعمال ہونا شروع ہوئی تو اس کے اثرات منفی ہوگئے اور وہ انسان کے لیے ہولناک ہوتی چلی گئی۔ اسی طرح ایک چیز انسان نے اپنے دفاع کے لیے بنائی تو وہ جارحیت کے لیے استعمال ہونا شروع ہوگئی۔ بڑے پیمانے پر انسان کی تباہی کے سامان تیار ہوگئے، ایٹم بم بنا لیے گئے۔ اس کے نتیجے میں طاقتور قوموں نے عالمی سطح پر خوف پیدا کر کے دوسرے ملکوں کے وسائل ہتھیانا شروع کر دیے۔

بیک وقت معاشرے میں ایسی ایجادات بھی ہو رہی ہوتی ہیں جن کے مثبت اور منفی اثرات مرتب ہو رہے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چہرے کے داغ دھبے دور کرنے کے لئے ایک دوا ایجاد ہوتی ہے تو دوسری طرف طرح طرح کی کریمیں اور پاؤڈر مارکیٹ میں آجاتے ہیں۔

۴۔۶۔۴۔پیداوار نہیں مارکیٹنگ

کہیں لپ سٹک بیچی جارہی ہے تو کہیں انسانی جذبات و احساسات کو بھڑکانے کا سامان موجود ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ بعض ایجادات سے بڑی گھمبیر مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ اب ایک آدمی اپنے موبائل سے دوسرے کے موبائل پر جب چاہتا ہے فون کرتا ہے۔ اسے احساس نہیں کہ دوسرا شخص آرام کر رہا ہے، واش روم میں ہے، یا کہیں اور مصروف ہے۔ پھر اس پر شکایات کہ آپ نے میرا فون نہیں اٹینڈ کیا، میں نے فون کیا تھا۔ آج دیکھا جائے تو

انسانی زندگی مختلف ایجادات کے باعث بے شمار مسائل کا شکار ہوگئی ہے۔ ہم جس تیز رفتاری کے ساتھ نت نئی ایجادات اور جدیدیت کے دور میں داخل ہو رہے ہیں، ہمارے ہاں اس درجے کا شعور نہیں ہے۔ ہمیں ایک گہری سازش کے تحت ''کنزیومر سوسائٹی'' میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ ہم ہر چیز بیچ رہے ہیں، ہر چیز خرید رہے ہیں۔ ہمیں ذرا رک کر ان کے اثرات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ فقط ایجادات کے ظواہر کو نہ دیکھیں، ان کے پیچھے کارفرما مقاصد کو بھی سمجھیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جہاں ہمارے نظام تعلیم میں ''سائنٹیفک ڈیویلپمنٹ'' کے حوالے سے شعور موجود ہونا چاہیے وہاں ہمیں نظام تعلیم بنانے والے، قوم کے لیے سوچنے والے دماغ بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں فلسفی پیدا کرنے ہیں، ہمیں آج ماہرین عمرانیات کی ضرورت ہے۔ ہمیں، مختلف چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے تھنک ٹینک بنانے پڑیں گے۔

ہمارے ہاں پیداواری عمل نہیں ہو رہا۔ ہم اپنے نوجوانوں کی صلاحیتوں کو خرید وفروخت کے لیے بروئے کار لا رہے ہیں اور ان کو ایسی ہی تعلیم دے رہے ہیں جس سے وہ اچھی مارکیٹنگ کرنے والے اور اچھا سودا بیچنے والے قابل لوگ بن جائیں۔ اس قسم کی صورت حال کو مناسب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۴۔۶۔۵۔ سماجی سائنس دانوں کی اہمیت

اس کا حل کیا ہے؟ اس کا حل ایک اجتماعی قومی شعور ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ قائد پاکستان محمد علی جناح بنیادی طور پر ایک سوشل سائنٹسٹ تھے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس ملک کا تصور پیش کرنے والے لوگ علامہ اقبال، سرسید احمد خاں اور مولانا الطاف حالی، جنھوں نے ایک نسل اور ایک قوم تیار کی جن کی کوششوں سے لاکھوں لوگوں کی ذہن سازی ہوئی یہ سب سوشل سائنٹسٹ تھے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ دینی حوالے سے ہمارے انبیاء و مصلحین اپنے اپنے مقام پر ماہرین عمرانیات تھے، انسان شناس تھے۔ انسان کی عقل کے خزینے کو باہر نکالنے والے تھے۔ حضرت علیؑ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ انبیا اس لیے آئے کہ

انسانوں کی عقلوں کے دفینے اور فطرت کے خزانے باہر نکالیں۔ اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں سماجی انقلاب کے بانی، انسانی شعور کو ارتقا بخشنے والے انبیاء ہی تھے۔ آج ہماری یونیورسٹیوں میں یہ شعبے زوال پذیر ہیں نتیجتاً ہم کنزیومر سوسائٹی بن کر رہ گئے ہیں۔

۴۔۶۔۶۔اندھی تقلید کا انجام

نت نئی ایجادات سے ہماری نوجوان نسل کے ثقافتی شعور پر اثرات کا جائزہ لیا جائے تو بہت سے مثبت پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثلاً انٹرنیٹ کے ذریعے ہمارا نوجوان آسٹریلیا میں بات کر رہا ہے، امریکہ میں چیٹ کر رہا ہے۔ ان ایجادات اور سہولیات نے دراصل ہمیں عالمی شہری بنا دیا ہے۔ یہ سہولتیں ہمیں سرحدوں سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ یہ مادی ترقی آخر کار انسان کو قوموں اور سرحدوں کے محدود تصور سے نکال کر ایک آدمیت کی طرف لے جانے کا سبب بن رہی ہے۔ جہاں تک اس کے منفی پہلوؤں کا تعلق ہے وہ بھی بہت خطرناک ہیں اگر ہم انھیں سامنے رکھیں گے تو منفی اثراث سے بچ جائیں گے، ورنہ ہمیں اسی عذاب سے گزرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جس عذاب سے آج مغرب گزر رہا ہے۔ ہماری نوجوان نسل کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جن قوموں نے انسان کے روحانی اور کائنات کے روحانی پہلوؤں کو نظر انداز کیا ان کی اخلاقیات تباہ ہوگئیں۔ وہ اپنی مادی ضروریات کی تکمیل کے لئے دوسری قوموں کے استحصال کے راستے پر چل پڑیں۔ مغرب کے تاجرانہ ضمیر نے دوسری قوموں کو ''خریداروں کا سماج'' بنانے کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اس کا آخر کار نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔ اس کا نتیجہ خود مغرب کے لیے بھی اچھا نہیں ہوگا۔

مغرب کی اندھادھند تقلید کے بجائے ایجادات کو قبول کرنے اور انھیں استعمال کرنے سے پہلے اپنے قومی اور انسانی اہداف کا تعین ضروری ہے۔ انہی اہداف کی روشنی میں ایجادات کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ نت نئی ایجادات کے بے ہدف اور بے ہنگم استعمال سے جو ثقافت جنم لے رہی ہے اسے آزاد قوم کی ترقی پسندانہ اور اعلیٰ مقاصد کی حامل جامع انسانی ثقافت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۴۔ ۷۔ مقدسات کی بہتات

۴۔ ۷۔ ۱۔ سب کچھ مقدس قرار پا جائے تو!

اصولی طور پر یہ بات مانی جاسکتی ہے کہ کسی بھی قوم، مذہب یا قبیلے کے ''مقدسات'' کا احترام کیا جانا چاہیے۔ پُرامن بقائے باہمی کے لیے عام طور پر اسے ایک سماجی قانون کی حیثیت حاصل ہے لیکن کیا کیا جائے کہ مقدسات کا تصور بڑھتے بڑھتے بہت پھیل گیا ہے اور مقدسات کی ایسی بہتات ہوگئی ہے کہ انسان سوچتا ہے کہ اب کسی بھی موضوع پر، کسی بھی شخصیت پر اور کسی بھی نظریے پر بات کرنے کی گنجائش نہیں رہی، کیونکہ ہر موضوع، ہر شخصیت اور ہر نظریہ رفتہ رفتہ مقدس ہوتا چلا جارہا ہے۔

قومیں مقدس، دستاویزات مقدس، جماعتیں مقدس، شخصیات مقدس، نظریات مقدس اور یہاں تک کہ علاقے، شہر، قبریں، گلیاں سب مقدس ہوتی چلی جارہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ رسمیں اور رواج بھی مقدس ہو گئے ہیں۔ مختلف مذاہب کی رسمیں شعائر ہوگئی ہیں اور مسلمان مذاہب کے ماننے والوں میں وہ شعائر مذہب یا شعائر اسلام قرار پاتی چلی جارہی ہیں۔ بعض اہل مذاہب نے جانوروں کو بھی مقدس بنالیا ہے۔ ایسے میں اگر بات کرنا ہو تو انسان کیا کرے!

ماضی میں بادشاہوں کے سامنے یہ کہا جاتا تھا کہ اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں، لیکن آج یہ کہہ کر بھی انسان کی جان کو امان شاید نہ مل سکے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو انسانی فکر و نظر میں جمود کی تہیں مزید دبیز ہوتی چلی جائیں گی اور آسمان والے زوال آدمیت کا تماشا کرتے رہیں گے۔

۴۔ ۷۔ ۲۔ توہین اور تنقید میں فرق ہے

ہماری رائے یہ ہے کہ توہین اور تنقید میں فرق روا رکھ کر ہم تازہ فکر کو دعوت دے سکتے ہیں۔ ایک نظریہ اگر دوسرے کے نزدیک درست نہیں تو اچھے انداز سے اس پر تنقید کی گنجائش ہونا چاہیے۔

شخصیات کے مسئلے کو بھی اسی طرح سے لینا چاہیے۔ بعض خاص ادوار کے افراد کو بعض قومیں یا گروہ مقدس قرار دے لیتے ہیں، پھر اس دور اور اُس دور کے افراد پر تنقید کی گنجائش بھی روا نہیں جانتے۔

چند مثالوں سے ہم اپنی بات کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بزرگ اساتذہ اور علماء اپنی کلاس میں اپنے طلبہ کے سامنے کسی ایک مسئلے پر مختلف علماء کے افکار اور ان کے دلائل پیش کرتے ہیں۔ پھر ان کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہیں اور اس مسئلے پر اپنی رائے اور اپنی دلیل بیان کرتے ہیں۔ اس دوران میں ہم نے دیکھا ہے کہ وہ دیگر علماء، بلکہ اکابر علمائے سلف کے نظریات بیان کرتے ہوئے اور ان پر تنقید کرتے ہوئے ان کا نام بہت ادب سے لیتے ہیں لیکن ان کے نظریے کو رد کر کے اپنا نظریہ ان کے مقابل پیش کرتے ہیں اور طلبہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے استاد نے اپنے اکابر اسلاف کی توہین کی ہے۔

کیا یہی رویہ ایک مکتب فکر کے علماء دوسرے مکتب فکر کے علماء پر تنقید کرتے ہوئے اختیار نہیں کر سکتے اور کیا دوسرے مکتب فکر کے علماء اسے توہین کے بجائے تنقید کے زمرے میں شمار نہیں کر سکتے؟ ہم سائنسی اور سماجی علوم میں بھی نقد و تنقید دیکھتے اور پڑھتے رہتے ہیں۔ وہاں کوئی ایسی مشکل پیش نہیں آتی۔

بعض رسوم، نظریات اور عقائد ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر تنقید کیے بغیر معاشرہ پیش رفت نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں انبیاء نے شرک اور اس کے مظاہر کے خلاف جو جرأت مندانہ جدوجہد کی ہے، اسے بطور نمونہ ذکر کیا جا سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جن بتوں کو کلہاڑے سے توڑ دیا وہ سب اس دور اور اس بستی کے لوگوں کے لیے مقدسات کی حیثیت رکھتے تھے لیکن یہ ایسے مقدسات تھے جن پر ضرب لگائے بغیر جمود، انحراف اور ظلم کا استیصال ممکن نہ تھا۔ اس ضمن میں دیگر انبیاء اور خاص طور پر آخری نبی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرز عمل بھی شاہد کے طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔

۴۔۷۔۳۔ قرآن کی ضرب کاری

ماضی میں بھی ایسا رہا ہے اور آج بھی بہت سے لوگ اپنے آباؤ اجداد کو مقدس جان کر ان کے

نظریات کو مقدس قرار دے لیتے ہیں اور ان پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

قرآن حکیم نے اس طرز عمل پر ایک کاری ضرب لگائی ہے اور وہ لوگ جو اپنے نظریے یا عقیدے کے صائب ہونے کے لیے اپنے آباؤ اجداد کے نظریے کو بطور دلیل پیش کرتے تھے، ان سے کہا گیا کہ کیا اگر تمھارے آبا کچھ علم اور خبر نہ رکھتے ہوں تب بھی تم ان کے نظریے اور عقیدے کو اختیار کیے رہو گے۔ یہ بھی دراصل انسانی ضمیر و وجدان کو جھنجھوڑنے کا ایک طریقہ ہے۔

۴۔۷۔۴۔کیا زوال کے اسباب تلاش نہ کیے جائیں؟

بعض مسلمان مفکرین نے اس پہلو پر سوچنا شروع کیا کہ مسلمانوں کے زوال کی وجوہ کیا ہیں، کیوں آج مسلمان پسماندگی اور نکبت کا شکار ہیں۔ اس سوال پر غور کرنا اس لیے ضروری ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے زوال کی وجوہ کو نہ جان سکے وہ پلٹ کر کمال کا راستہ اختیار نہیں کر سکتی۔ اس میں مشکل اس وقت پڑ جاتی ہے جب زوال یا انحراف کے مراحل کو سمجھنے کے لیے بعض شخصیات کے طرز عمل پر تنقید کی نوبت آتی ہے۔ چنانچہ مولانا مودودی نے اپنی معروف کتاب ''خلافت و ملوکیت'' میں صدر اسلام کی تاریخ پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی۔ انھیں بعض افراد کے بعض کام درست دکھائی نہ دیے۔ انھوں نے اس وجہ سے کہ کہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو، بڑی احتیاط سے قلم اٹھایا اور بعض افراد پر سلجھے ہوئے انداز سے تنقید کی۔ اسے ان کی جسارت اور بعض مقدسات کی توہین سمجھا گیا۔ یہ درست ہے کہ ان کی اس تنقید سے بعض لوگوں کو صدر اسلام کی تاریخ کے بعض پہلوؤں کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملی لیکن مولانا کے حصے میں جو طعن و تشنیع آئی اور توہین کے جو تیر ان پر چلائے گئے ان کا سلسلہ بھی دراز ہے اور ابھی تک رکا نہیں۔

۴۔۷۔۵۔گاؤ پرستی کا المیہ

ہم مختلف مثالوں کے ذریعے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں، اس سلسلے میں ہندوستان میں گاؤ پرستی نے جو اسلام اور مسلمان دشمنی کی صورت اختیار کر رکھی ہے، اسے بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاں مشترکہ طور پر بہت سے جانوروں کو ذبح کرنا اور ان کا گوشت کھانا روا سمجھا جاتا ہے۔ ان میں پرندوں اور آبی جانوروں کا گوشت بھی شامل

ہے۔ گائے کے بارے میں ہندوؤں کا خاص نقطۂ نظر ہے، وہ اسے گاؤ ماتا قرار دیتے ہیں لیکن ایسے میں کسی دوسرے مکتب فکر کے انسان کی قیمت کا گائے کی قیمت سے کم ہو جانا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ اب صورت حال یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ کوئی شخص گائے کا گوشت لے کر جا رہا ہے تو اس کی جان کے لیے کوئی امان نہیں یا شک بھی ہو جائے کہ اس کے پاس گائے کا گوشت ہے تو اسے قابل گردن زدنی سمجھا جاتا ہے۔ افسوس کہ ایسے میں بھارت کے اندر کسی مرد دانا کی آواز میں وہ طاقت نہیں رہی جو وحشی انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے اور انھیں قائل کر سکے کہ گائے جتنی بھی مقدس ہو، انسان سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔

۴۔۷۔۶۔ ایک مومن کی حرمت کعبہ سے زیادہ ہے

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجر اسود اور کعبۃ اللہ کو بہت مقدس قرار دیا، بیت اللہ کے حج کو ہر مستطیع مسلمان پر فرض قرار دیا۔ مسلمان شب و روز اس گھر کا طواف کرتے رہتے ہیں اور اپنی ہر نماز کے لیے اس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے بیت اللہ کی عظمت اور اس کے عظیم تقدس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کے سامنے کھڑے ہو کر، اس سے مخاطب ہو کر آپؐ نے فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ، لحرمۃ المومن اعظم عند اللہ حرمۃ منک: مالہ و دمہ، و ان نظن بہ الا خیرا[۱]

اس کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے مومن کی عزت و حرمت تیری عزت و حرمت سے بڑھ کر ہے، اس کے مال کے لحاظ سے، اس کے خون کے لحاظ سے اور اس لحاظ سے کہ اس کے بارے میں خیر کے علاوہ کوئی گمان نہ کیا جائے۔

اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مومن کے بارے میں بدگمانی بھی کعبۃ اللہ کی توہین سے بڑھ کر ہے۔

اس حدیث کے متن یا مفہوم کو محققین نے درست قرار دیا ہے۔

ہم خانہ کعبہ کو انسانیت کا مرکز سمجھتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ''قِیٰمًا لِّلنَّاسِ'' کہہ کر اسے

---

۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن

انسانوں کے قیام اور اٹھ کھڑا ہونے کا مقام ہی قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک جسے آخری زمانے میں انسانیت کا نجات دہندہ بن کر آنا ہے، جو رسول اسلام کا ہم نام ہوگا اور جسے ''مہدی'' یعنی ہدایت یافتہ ہادی و رہبر کہا گیا ہے اسی خانہ کعبہ سے اپنے قیام کا آغاز کرے گا اور وہ مظلوم انسانیت کا حامی بن کر اٹھے گا۔ خانہ کعبہ ایک مرتبہ پھر انسانیت کے مرکز کے طور پر سامنے آئے گا۔ گویا دنیا کے مادی مظاہر میں سے مسلمانوں کے نزدیک خانہ کعبہ سے زیادہ مقدس کوئی مقام اور چیز نہیں۔ جب ایک مومن کی عزت وحرمت اللہ کے نزدیک اس سے بڑھ کر ہے تو پھر کسی بھی چیز کی حرمت ایک مومن کی حرمت تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔ اب ان چیزوں کی حیثیت کا تعین آپ خود کر لیں جنھیں انسانوں نے ''محترم'' قرار دے رکھا ہے۔ ایسی احادیث ہمیں دعوت دیتی ہیں کہ ہم اپنے انسانی تصورات کو درست کریں۔

ممکن ہے مندرجہ بالا حدیث میں ''ایک مومن'' کے ذکر سے کوئی یہ مطلب نکالے کہ یہاں ''انسان'' کا لفظ نہیں آیا لہٰذا ہم جسے ''مومن'' سمجھیں گے، اسی کی حرمت کے قائل ہوں گے۔ فکر کی ایسی کجی اور ''میں نہ مانوں'' کا تو کوئی علاج نہیں تاہم قرآن حکیم میں ایک انسان کے ناجائز قتل کو بھی پوری انسانیت کا قتل اور ایک انسان کا احیاء اور اسے موت سے بچانے کو پوری انسانیت کو زندہ کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

۴۔۷۔۷۔ آیۃ اللہ خامنہ ای کا فتویٰ

چند سال پہلے اسلامی جمہوریہ ایران کے روحانی پیشوا آیۃ اللہ خامنہ ای نے اہل سنت کے مقدسات کی توہین کو حرام قرار دیا تھا۔ یہ فتویٰ صحابہ کرامؓ اور امہات المومنینؓ کے احترام کو ملحوظ رکھنے کے لیے تھا۔ ایسا ہی فتویٰ دوسری طرف سے بھی آنا چاہیے تھا۔ ایسا کرنا ضروری ہے۔ امت اسلامیہ کے اتحاد کے لیے ایسے فتووں اور ان پر عمل کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن مسئلے کا دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ کیا مقدسات کی کوئی فہرست بنائی جا سکتی ہے؟ اس کے لیے کوئی علاقہ یا زمانہ مقرر کیا جا سکتا ہے؟ کیا ہر فرقے اور مذہب کی قدرے مختلف فہرست نہیں بن جائے گی؟ ہر مذہب کے اپنے اکابر، اپنے مقابر اور اپنے مقدسات ہیں۔

کیاان کے کسی نظریے کی علمی تنقید بھی مقدسات کی توہین کے ضمن میں شمار کی جائے گی؟ بدقسمتی سے ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ہم کسی گروہ کو مستثنیٰ نہیں کرتے۔

۴۔۷۔۸۔سوال کرنا بھی توہین قرار پایا ہے

ہمارے ہاں مذہبی جماعتیں اور مذہبی قائدین کی کثیر تعداد ہے۔اُن کے ماننے والے اپنے قائد کے بارے میں کوئی سوال بھی برداشت نہیں کر پاتے۔سوال کرنے والے پر یوں ٹوٹ پڑتے ہیں کہ جیسے وہ نعوذ باللہ توہین رسالت کا مرتکب ہوا ہے۔ایسا ردعمل کرتے ہوئے ہم یہ بھی نہیں سوچتے کہ جماعتوں، تنظیموں، اداروں اور افراد کی عمر کتنی ہے۔تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ بعض نظریات کسی دور میں بہت اہمیت اختیار کر گئے تھے یہاں تک کہ اُن کی بنیاد پر قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا تھا لیکن آج ان نظریات کی زیادہ سے زیادہ کتابی حیثیت رہ گئی ہے، یعنی تاریخ کی کتابیں خبر دیتی ہیں کہ کسی دور میں ان نظریات پر معرکہ آرائی رہی ہے۔

قرآن کے قدیم یا مخلوق ہونے کا معرکہ

قرآن کے مخلوق ہونے یا نہ ہونے کا موضوع کسی دور میں اتنا اہم ہو گیا کہ بڑی بڑی شخصیات، حکمرانوں سے مختلف رائے اختیار کرنے کی وجہ سے پس دیوار زنداں رہیں اور بہت سے لوگ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔اشاعرہ اور معتزلہ کے معرکے بھی تاریخ کے سینے پر مندمل ہو جانے والے گھاؤ ہیں۔کبھی اشاعرہ کو حکمرانی ملی تو انھوں نے معتزلہ کے خلاف کشت و خون سے دریغ نہ کیا، بڑے بڑے معتزلی علماء موت کے گھاٹ اتر گئے۔انھیں قضاوت کے عہدوں سے محروم کر دیا گیا۔ان کی گواہی کو ناقابل قبول قرار دے دیا گیا۔انھیں حکومتی مناصب سے معزول کر دیا گیا، انھیں جیلوں کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔معتزلہ جو اپنے آپ کو خرد پسند اور عقل کا محافظ کہتے تھے انھوں نے بھی اشاعرہ پر کچھ کم ظلم نہ توڑے جب اقتدار ان کے گھر کی لونڈی بن گیا تو انھوں نے اشاعرہ کے ساتھ وہ کچھ کیا کہ جس کی یادیں تاریخ کے سینے کا داغ ہیں۔

۴۔۷۔۹۔تاریخ آئینہ عبرت ہے

افسوس کہ ہمیں تاریخ سے سروکار نہیں رہا ورنہ تاریخ تو آئینہ عبرت کی حیثیت رکھتی ہے۔

جب کسی شخص کی نظر میں ہزاروں سال کی تاریخ ہوتی ہے اور وہ اس کی اونچ نیچ کی وجوہات کو جان لیتا ہے، حکومتوں کے آنے جانے کا تماشا کر لیتا ہے، افراد کے ابھرنے اور ڈوبنے کا منظر بار بار دیکھ لیتا ہے، نظریات کے قوت پکڑنے اور پھر ان کی ہوا نکل جانے کا نظارہ کر لیتا ہے تو اپنے دور کی شخصیات، نظریات، جماعتوں، حکومتوں اور خاندانوں کے امکانی عروج و زوال کو آسانی سے سمجھ رہا ہوتا ہے۔ افسوس ہم بہت سطحی سوچ رکھنے والے اور سطحی علم رکھنے والے لوگوں کے مابین زندگی گزار رہے ہیں۔ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر شدت پسندی کو دیکھ کر خون کے آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے۔ بقول بلھے شاہ

جھوٹھ آکھاں تے کجھ بچ دا اے
سچ آکھاں بھانبڑ مچ دا اے
جی دونہاں گلاں توں جچ دا اے
جچ جچ کے جیبھا کہندی اے
منہ آئی بات نہ رہندی اے

بلھے شاہ کو اپنی بات کہنے کے لیے جو بھیس اختیار کرنا پڑا ہر کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ آزاد انصاری کا ایک مشہور شعر اس کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے:

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

۴۔۷۔۱۰۔ بات کہنے کے لیے سو حیلے

بڑے بڑے علماء، فلسفی اور دانشور اپنے دور میں اپنے دل کی بات نہ کہہ پائے۔ بعض نے زندگی کا ایک حصہ غاروں میں گزار دیا، بعض نے اپنی بات کہنے کے لیے نئی اصطلاحوں سے کام لیا، بعض نے چند دوستوں کا انتخاب کر لیا اور کھلے بندوں بات کہنے سے گریز کیا۔ بعض نے شعر کی زبان میں اشاروں، کنایوں اور تلمیحوں سے کام لیا۔ بعض نے ایسے ایسے جملے کہے کہ جن میں ایک سے زیادہ مطالب کا امکان تھا۔ بعض نے اگر کھل کر بات کہی تو بعد میں وہ سولی چڑھائے گئے،

زندان کے حوالے کیے گئے، یا پھر فتووں کی زد میں ایسے آئے کہ صدیوں تک انسان اُن کی کتابوں سے کسب فیض نہ کر سکا۔

ہم جس دور میں رہ رہے ہیں اس کے گردوپیش پر تبصرے کے لیے بھی احتیاط کی سو تدبیریں کرنا پڑتی ہیں۔ پھر بھی صورت حال یوں دکھائی دیتی ہے:

جب میں نے کسی سے نہ کہا دردِ کشیدہ
پھر بعد مرے کون لکھے میرا جریدہ

۴۔۷۔۱۱۔ پھر فکری ارتقا کیسے ہو؟

جس معاشرے میں سوال کرنا بھی جرم ہو جائے اس میں فکری ارتقا کا امکان کتنا باقی رہ جاتا ہے؟ سوال کرنے کا ہی مسئلہ نہیں ہر خرابی کا ذمہ دار دوسرے مذہبی گروہ اور اس گروہ کے قائد یا قائدین کو قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی ہر ''توہین'' روا اور اپنے پر ہونے والا کوئی سوال بھی ناجائز۔ ہر مسلک کی مختلف جماعتوں، گروہوں اور دھڑوں میں ایسی شدت پسندی کے مظاہر دیکھے جا سکتے ہیں۔

عقائد و نظریات کا بھی یہی عالم ہے۔ بعض عقائد و نظریات بعض گروہ اپنے امتیازات میں سے قرار دے لیتے ہیں۔ پھر اس بات پر اصرار کہ ہم اپنے ''امتیازات'' کو نہیں چھوڑیں گے۔ امتیازات اتنے اہم ہو جاتے ہیں کہ ''مشترکات'' اتنے اہم نہیں رہتے جتنے امتیازات اہم ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ہمارے تشتت اور زبوں حالی کو یوں بیان فرمایا ہے:

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ

ہر جماعت اس پر خوش ہے جو اس کے پاس ہے (یعنی اس کے امتیازات ہیں)۔

بات کہہ کے بھی یہی سوچ رہا ہے ثاقب
تم سے کہنا ہے ابھی ساری کہانی یارو

□

۴۔۸۔القاب کی بیساکھیاں

بعض القاب ایسے ہوتے ہیں کہ عام انسان انھیں پڑھ کر حیرت میں کھو جاتا ہوں۔کبھی تو ایک شخص کے نام کے ساتھ اتنے ڈھیر سارے القاب ہوتے ہیں کہ اصل نام کا پتہ ہی نہیں چلتا اور سمجھ نہیں آتی کہ موصوف کو کس لفظ سے پکاریں۔ایسے میں دل تو کہہ رہا ہوتا ہے کہ

کس نام سے پکاروں کیا نام ہے تمھارا

لیکن زبان کو یارائے اظہار نہیں ہوتا۔عامۃ الناس جن افراد کو علمائے کرام کہتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ شاید سب سے عجیب وغریب القاب ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کم از کم لقب یا خطاب یا سابقہ ان کے ناموں کے ساتھ ''علامہ'' ہوتا ہے۔عربی زبان کے ماہرین کا کہنا ہے کہ جب کسی کے علم وفضل کی بنیاد پر اس کے لیے مبالغے کا صیغہ استعمال کرنا ہو تو ''علاّم'' کہا جاتا ہے اور جب مبالغے کی بھی انتہا ہو جائے تو ''علاّمہ'' کا لفظ بروئے کار لایا جاتا ہے۔

بعض افراد واقعاً علامہ ہوتے ہیں۔وہ نہ کہلوائیں تب بھی ہوتے ہیں۔بقول شاعر

تصنع سے بری ہے حسنِ ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

ایسے اہل علم موجود ہیں کہ جن کے نام کے ساتھ ایسے کلمات سجتے ہیں لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جن پر عالم یا علامہ ہونے کی تہمت ہے۔میر درد کا یہ شعر ان کے حسب حال ہے:

تہمتِ چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے ہم آئے تھے کیا کر چلے

ایسے افراد اس خوش فہمی میں ہوتے ہیں کہ لوگ واقعاً شیخ الاسلام، حجۃ الاسلام، علامہ وغیرہ کے القاب ان کے لیے سنجیدگی سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ ایسے

کلمات ''غلط العام'' کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ باخبر لوگ جانتے ہیں کہ یہ علمی لحاظ سے معذور لوگوں کی بیساکھیاں ہیں۔ بیساکھیوں کے سہارے چند قدم چلا تو جا سکتا ہے لیکن معذور ہونے کے درد کا اس سے درماں نہیں ہوتا۔ مشکل صرف ''علماء نما'' افراد کے حوالے سے نہیں سیاست و ریاست، منصب و قیادت اور مسند و مقام کے اعتبار سے بھی طرح طرح کے القاب بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ گاہے ان القاب کو استعمال کرنے والوں کی داخلی کیفیت یہ ہوتی ہے:

وہی معزز کہ جن سے لفظوں کی آبرو بھی پناہ مانگے
وجوب ٹھہرا ہے اُن کے ناموں سے پہلے عزت مآب رکھنا

ایک بڑے ''مولانا صاحب'' فوت ہو گئے۔ شہر کے گلی کوچوں میں ان کی وفات کی مناسبت سے ایک اشتہار لگا تھا جس پر یہ حدیث بھی لکھی تھی:

''جب کوئی عالم فوت ہو جاتا ہے تو ایک ایسا گڑھا یا خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے کوئی اور چیز پُر نہیں کر سکتی۔''

میں غور کرتا رہا کہ آج دنیا میں یا شہر میں کونسا خلا پیدا ہوا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس ناچیز کو کسی قسم کا کوئی خلا محسوس نہ ہوا۔ میں سوچتا رہا کہ یہ کیسا خلا ہے جو محسوس ہی نہیں ہو رہا۔ دوسری طرف کتنے ہی ایسے نام صفحۂ ذہن پر ابھرے جن کی ضرورت آج بھی دنیا کو محسوس ہو رہی ہے اور ان میں سے کتنے ہی ہیں جنھیں ہم ''علماء'' نہیں کہتے۔ میں نے سوچا کہ یہ کیوں نہ کر لیا جائے کہ جن کے جانے سے خلا کا احساس ہو انھیں علماء سمجھ لیا جائے۔ ہاں ایسا کرنے سے عالم کی تعریف کچھ مختلف یا وسیع تر ضرور ہو جائے گی۔

اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ انسانوں میں نفرتیں بانٹنے والے، مذہب کے نام پر تقسیم کرنے والے ایسے کتنے ہی عالم نما افراد ہیں جن کے زمین میں سما جانے پر ''خس کم جہاں پاک'' کا محاورہ صادق آتا ہے۔ یوں کیوں نہ کہا جائے کہ جو گڑھے انھوں نے کھودے ہوتے ہیں ان میں سے کم از کم ایک گڑھا تو بھر جاتا ہے۔

علم کے تصور میں بھی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ تخصص کے اس دور میں صرف ایک شعبے کی

اصطلاحوں کو جاننے والے اور کسی ایک شعبے کے ماہر کے لیے "عالم" کے لفظ کا استعمال اشکال سے خالی نہیں۔ علامہ اقبال کے نزدیک بعض لوگ تو لغات کے ہی قارون ہوتے ہیں:

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

کہتے ہیں کہ طب اور فلسفے کے امام بوعلی سینا کو ان کی زندگی کے آخری ایام میں کسی نے پوچھا کہ آپ اپنے آپ کو علم کے کس مرتبے پر پاتے ہیں تو ان کا کہنا تھا کہ میں نے یہ جان لیا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ بقول جگن ناتھ آزاد

ابتدا یہ تھی کہ میں تھا اور دعویٰ علم کا
انتہا یہ ہے کہ اس دعوے پر شرمایا بہت

حقیقی عالم اپنی دانائی یا معرفت کا توشہ لے کر جب کائنات کی عظمتوں اور معرفت کے وسیع سمندر کے سامنے اپنے آپ کو کھڑا پاتا ہے اور اپنے علم کو ان امور کے مقابلے میں پیش کرتا ہے جنھیں وہ نہیں جانتا تو اپنے علم کو ذرہ ناچیز کے سوا کچھ نہیں پاتا اور بے ساختہ وہی کچھ کہتا ہے جو بوعلی سینا نے کہا کیونکہ وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ اس کے توشے میں بیشتر ظن وگمان اور تخمین وقیاس ہے۔

کتنے کم نام ہیں جو علم کے حوالے سے تاریخ کو یاد رہ گئے ہیں اور کتنے وہ افراد ہیں جن کے ناموں کے ساتھ القاب کا بھاری بوجھ لٹکا ہوتا تھا اور وہ تاریخ کی گہرائیوں میں اتر کر گم ہو گئے ہیں۔

حصول علم اور معلومات کے فرق نے بھی ہمیں مشکلات سے دوچار کر رکھا ہے۔ علم تو کسی حقیقت کا سراغ لگا لینے سے عبارت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں منقول ہے کہ وہ دعا کیا کرتے تھے:

اللھم ارنا الاشیاء کماھی[۱]

اے اللہ! ہمیں اشیاء کو ایسا دکھا جیسی وہ ہیں۔

بس کسی چیز کو ویسا ہی دیکھ لینا جیسی وہ ہے، اس کے بارے میں حصول علم سے عبارت ہے۔

۱) بحار الانوار، ج ۱۶، ص ۱۰

البتہ بہت سے افراد کو یہ وہم ہوتا ہے یا غلط اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی چیز کو ویسا ہی جان لیا ہے جیسی وہ ہے۔ انھوں نے کسی خاص حوالے یا کسی خاص پہلو سے اس چیز کو پہچانا ہوتا ہے۔

اس کی مثال ''معرفت انسان'' کا موضوع ہے۔ علم نفسیات ہو یا انسان کے بارے میں علم طب، علم بشریات ہو یا انسانی روابط کا علم، انسانی معاشرے کی حرکیات کا علم ہو یا تاریخ کا علم اور شاید تمام رائج علوم معرفت انسانی کی مختلف شاخیں ہیں اور انسان کی تلاش کے درپے ہیں لیکن ابھی انسان ''کما ھو'' دریافت نہیں ہو سکا۔

بہت سے افراد کسی خاص علم کی اصطلاحوں سے واقف ہوتے ہیں۔ بہت سے افراد معلومات کا ایک ''خزانہ'' رکھتے ہیں۔ ان سب کو ''عالم'' کہنا اگرچہ کچھ ایسا غلط بھی نہ ہو لیکن ان کی محدودیت، موضوعیت یا معروضیت کا تصور عموماً نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

عام سادہ دل اور سادہ اندیش افراد سے کیا کہنا، بات تو اہل علم سے کہنے کی ہے۔ عالم ہونا بہت بڑا اعزاز اور بہت بڑا مرتبہ ہے لیکن عالم یا علامہ کہلوانا کتنا بڑا دعویٰ ہے۔ جب بے علم، جاہل، عالم نما اور حریص علی الدنیا اور مرتبہ و منصب کے درپے افراد اپنے آپ کو عالم یا علامہ کہلا رہے ہوں تو اہل علم کو شرم آتی ہے کہ ان کے لیے وہی القاب استعمال کیے جائیں جو بے شمار نااہلوں کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ لقب، خطاب یا خاص طرح کا لباس کسی کو عالم نہیں بناتا۔ عالم ہوتا ہے اور وہ لقب یا لباس کا مرہون منت نہیں ہوتا۔ جب حسب حال الفاظ اہل افراد کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں تو یہ لفظوں کے لیے بھی اعزاز ہوتا ہے جب کہ لقب اور خطاب محروم عن الفضل افراد کے لیے بیساکھی ہیں اور خاص طرح کا لباس ایسے لوگوں کا بہروپ ہے۔ رہ گئے ہر لباس میں افراد کو ان کی حقیقت کے ساتھ پہچان لینے والے لوگ تو وہ باندازِ بہادر شاہ ظفر کہہ رہے ہوتے ہیں:

کیا چل سکے گا ہم سے کہ پہچانتے ہیں ہم
تو لاکھ اپنی چال کو ظالم بدل کے چل

۴۔۹۔ نبیؐ رحمت کے ماننے والے زحمت نہ بنیں

پوری کائنات نبی کریمؐ پر درود وسلام بھیجتی ہے چنانچہ سنن ترمذی میں امیر المومنین امام علیؑ سے روایت ہے، آپ فرماتے ہیں:

میں نبی اکرمؐ کے ساتھ مکہ میں تھا جب ہم مضافات شہر کی طرف نکلے تو جو بھی پہاڑ اور درخت آپ کے سامنے آتا السلام علیک یا رسول اللہ کہتا۔[1]

نبیؐ کریمؐ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ رحمت للعالمین ہیں، سارے جہانوں کے لیے رحمت ہیں، سارے زمانوں کے لیے رحمت ہیں، سب سرزمینوں کے لیے رحمت ہیں اور سب مخلوقات کے لیے رحمت ہیں۔ آپ کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ[2]

یعنی یہ اللہ کی رحمت کا ایک مظہر ہے کہ آپ ان کے حق میں بہت نرم ہیں اگر آپ ترش رو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے اردگرد سے چھٹ جاتے پس آپ ان کی غلطیاں معاف کر دیں بلکہ ان کے لیے اللہ سے مغفرت بھی طلب کریں، مزید یہ کہ انھیں مسائل میں شریک مشورہ بھی رکھیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی سیرت اور روش حیات کو اسوۂ حسنہ قرار دیا یعنی خوبصورت نمونہ۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حسن اور خوبصورتی انسانوں کو جذب کرتی ہے جب کہ بدصورتی سے ہر انسان گریزاں ہوتا ہے۔ گویا آپ کے وجودِ ذی جود میں جاذبیت ہی جاذبیت ہے۔

---

[1] حدیث ۳۶۲۶

[2] آل عمران: ۱۵۹

آپؐ کے بارے میں قرآن حکیم ہی کا ارشادِ گرامی ہے:

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ[1]

اور بے شک آپ اخلاق کے بلند ترین درجے پر فائز ہیں۔

آپؐ جیسے تھے، آپ کی خواہش تھی کہ آپ کے ماننے والے بھی اسی سانچے میں ڈھل جائیں، اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر کہ ان کا اسوہ حسنہ اپنائیں گویا یہی کہنا چاہا ہے کہ ان کے ماننے والے ان کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ اگر چہ یہ امر بہت عظیم ہے اور اس تک رسائی کسی کے بس میں نہیں لیکن ہماری زندگی کے لیے رخ متعین کر دیا گیا ہے۔ ہمیں بہر حال انہی کے راستے پر چلنا ہے۔ اب یہ ہر کسی کی طلب، آرزو، استطاعت، کوشش اور توفیق پر منحصر ہے کہ کوئی آپؐ کی کس قدر قربت حاصل کر سکتا ہے۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:

وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا[2]

اور انسانوں سے خوبصورت پیرائے میں بات کرو۔

جب کسی سے بحث ومجادلہ کی نوبت آئے تو بھی اچھے سے اچھا انداز اختیار کرو:

وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ[3]

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر رحمن کے بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا[4]

یہ لوگ زمین پر نرم روی سے چلتے ہیں اور جاہل لوگ جب ان سے خطاب کرتے ہیں تو انھیں سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں۔

---

۱) القلم: ۴

۲) البقرہ: ۸۳

۳) النحل: ۱۲۵

۴) الفرقان: ۶۳

یہ ساری باتیں اگر سچی ہیں اور ضرور سچی ہیں تو پھر ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ ہم نبیؐ رحمت کی کیسی امت ہیں اور ان کے کیسے ماننے والے ہیں۔ کیا ہم بھی اپنے گھر والوں کے لیے شفیق اور مہربان ہیں جیسا کہ نبیؐ کریم تھے اور کیا ہم جب اپنے گھر سے باہر قدم رکھتے ہیں تو رحمت بن کر نکلتے ہیں یا زحمت بن کر، ہم دوسروں کے لیے شفقت اور مہربانی کا پیغام لے کر روانہ ہوتے ہیں یا سختی و ترش روئی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہمارے لہجوں میں نرمی ہوتی ہے یا سختی، ہمارے چہرے متبسم ہوتے ہیں یا خشن! ہمیں تو فرمایا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو السلام علیکم کہو بلکہ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ سلام میں پہل کرو، نبی کریمؐ کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ آپؐ ہمیشہ سلام میں پہل کیا کرتے تھے۔ امیر المومنین امام علیؑ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کی ہر سنت پر عمل کیا ہے لیکن ایک پر نہیں کر سکا اور وہ یہ کہ آپؐ ہی ہمیشہ سلام میں پہل کرتے رہے، میں کوشش کے باوجود کبھی سلام میں پہل نہیں کر سکا۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا دین پوری دنیا پر غالب آجائے تو پھر ہمیں اخلاق محمدیؐ کو اپنانا ہوگا۔ مسلمان پوری دنیا میں جہاں جہاں ہیں انھیں اپنے وجود سے، اپنے برتاؤ سے، اپنی زبان سے، اپنے چہرے سے اور اپنی رفتار سے رحمت کا پیغام دینا ہوگا۔ ہمیں رحمت کی علامت بننا ہوگا۔ آج انسانیت مسلمان نما جن درندوں کے ہاتھوں زخم خوردہ ہے بدقسمتی سے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلواتے ہیں بلکہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا پر اسلامی حکومت اور اسلامی خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اسلامی حکومت کے لیے اسلامی اخلاق ناگزیر ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے:

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

ہمیں ملکوں کو فتح کرنے کی فکر ترک کر کے دلوں کو فتح کرنے کی حکمت اختیار کرنا ہوگی۔ ہمارے ہاتھوں سے اگر خود مسلمان ہی اتنے نالاں ہوں کہ الامان الحفیظ کی صدائیں بلند کر رہے ہوں تو ہم غیر مسلموں کے لیے رحمت کے پیامبر کیسے بن سکتے ہیں۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے ہمیں رسول اللہ کی سیرت کو سمجھنا ہوگا۔ آج ہم کوئی ایک آیت لے کر اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آپ نے پورے قرآن حکیم کو سامنے رکھ کر مختلف قوموں، ملتوں، گروہوں اور لوگوں سے کیسا برتاؤ کیا۔ آپؐ

نے یثاق مدینہ میں بت پرستوں اور اہل کتاب کو بھی شریک کیا۔ آپؐ نے حبشہ کے مسیحی حاکم کو سچا اور عادل قرار دیا۔ آپؐ نے قتل وخون سے بچنے کے لیے اپنے لہو کے پیاسوں سے صلح کی۔ آپؐ نے نجران کے مسیحیوں کو امان نامہ لکھ دیا۔ اگر ہم اپنے مسلمانوں کے لیے ہی امان کے قائل نہیں تو غیروں کے لیے ہماری سنگدلی کا کیا عالم ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ القاعدہ ہو، داعش ہو یا ان کی مثال کوئی اور گروہ ان میں سے کوئی بھی رحمت کا پیامبر نہیں، یہ تو بشریت کے لیے زحمت اور اذیت کے پیامبر ہیں۔ یہ نبی رحمت کے نمائندے نہیں۔ جس کے وجود سے رحمت جھلکتی ہوگی اور جس کی زبان سے محبت چھلکتی ہوگی وہی نبی رحمت کا نمائندہ ہوگا۔ ہمارے نبیؐ نے غیروں کو بھی امن وسلامتی کا پیغام دیا، جب تک کوئی آپؐ پر حملہ آور نہ ہوا آپؐ نے تلوار نیام سے نہیں نکالی، آپ ہی پر قرآن کریم کی یہ آیات اتری ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ جس نے ایک انسان کو بے گناہ قتل کر دیا، اس نے گویا ساری انسانیت کا خون بہا دیا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا [۱]

مسند احمد ابن حنبل میں ایک صحیح حدیث میں ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرتؐ نے سب حاضرین سے سوال کیا کہ کیا میں تمھیں بتاؤں کہ مومن کون ہوتا ہے؟ پھر آپؐ نے فرمایا:

من امنه الناس علی اموالهم و انفسهم، و المسلم من سلم الناس من لسانه ويده [۲]

جس سے سب انسانوں کے اموال اور ان کی جانیں محفوظ ہوں اور مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے انسان سلامت رہیں۔

آیئے ان تعلیمات کی روشنی میں ہم آپس میں اور ساری انسانیت کے لیے رحمت ہو جائیں کیونکہ ہم نبیؐ رحمت کے ماننے والے ہیں۔

---

۱) المائدہ: ۳۲

۲) حدیث ۲۳۹۵۸

۴۔۱۰۔اپنی دریافت اور مسئلہ شناخت

۴۔۱۰۔۱۔اپنی ذات کی تلاش

مسئلہ شناخت دراصل اپنی ذات کی شناخت کا مسئلہ ہے۔ جو لوگ شناخت کے بحران کا عنوان قائم کرتے ہیں وہ پہلے مرحلے میں فرد کی ازخود بیگانگی اور دوسرے مرحلے میں سماجی بیگانگی کی حکایت کرتے ہیں۔ سماج سے انسان اُس وقت تک بیگانہ رہے گا جب تک اسے ادراک ذات حاصل نہ ہو جائے۔ گذشتہ صدی میں یورپ میں مذہبی عمرانیات (Sociology of Religion) کے نام سے ایک نیا علم معرض وجود میں آیا۔ اس علم کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی کہ مذہب دراصل ازخود بیگانگی (Self Alienation) کی وجہ سے جنم لیتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا دعوے دار جرمن فلسفی فویر باخ (Feuer Bach) ہے جسے مارکس کے استاد کا درجہ دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف فلسفہ الٰہیات کے ماہرین گذشتہ کئی صدیوں سے یہ بات کہتے چلے آرہے ہیں کہ انسان اپنے نفس کو نہ پہچاننے کی وجہ سے فکری طور پر بھٹکتا پھرتا ہے۔ لہٰذا کہا جاتا ہے کہ خدا شناسی کے لیے بھی اپنی ذات کی شناخت ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں بھی آیا ہے:

قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ۔۔۔[۱]

کہہ دیجیے کہ اصل ہار جانے والے وہی ہیں کہ جو اپنی ذات کو ہارے بیٹھے ہیں۔

شاید عاشقوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے جو کہتے ہیں:

دل گیا ہوش لٹے چین چھنا نیند گئی
دیکھ کیا کیا ہیں ترے عشق میں ہارے بیٹھے

---

[۱] الزمر: ۱۵

دونوں متضاد فلسفوں کی بنیاد دراصل خود فراموشی ہے۔ یعنی اپنی ذات کو فراموش کر دینا اور ناخود کو خود سمجھنے لگنا۔

۴۔۱۰۔۲۔ دائمی اور زمانی و مکانی شناخت

دوسری طرف شناخت کے بحران کا حل پیش کرنے والے عموماً ایک نئے بحران میں داخل ہونا تجویز کر رہے ہوتے ہیں۔ انسانی وجود کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ اپنی شناخت کو ظاہر کرنا عموماً غلط نہیں ہوتا لیکن اس امر سے انسان کی نظر چوک جاتی ہے کہ یہ شناخت حقیقت کی حامل ہونے کے باوجود محدود ہے، مکانی ہے یا زمانی ہے، ظواہر حیات سے وابستہ ہے۔ موسموں کے تغیر کی طرح بدل بھی سکتی ہے۔ ثقافتوں کے تبدیل ہوتے مظاہر کی طرح کچھ کی کچھ ہو سکتی ہے۔ انسان دراصل کیا ہے؟ اس سوال کے درست جواب سے بہت کچھ جڑا ہوا ہے۔ اگر اس کا جواب ایسا ہو کہ جس پر زمان و مکان کی تبدیلی کے مظاہر اثر نہ کرتے ہوں تو یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی کچھ نہ کچھ ایسی شناخت ضرور ہے جو پائیدار ہے، تبدیل نہ ہونے والی ہے، مشترک ہے، ہر کوئی اس کی بنیاد پر اپنے آپ کو، دوسرے کو اور اپنے سماج کو پہچان سکتا ہے، اس کی پہلی اور ناگزیر شناخت یہی ہے۔ اسی پس منظر میں ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ انسان کو از سرِ نو اپنی دریافت کی ضرورت درپیش ہے لیکن دریافت کا یہ سفر فکری اور روحانی طور پر آزادی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ دباؤ، مجبوری اور پراپیگنڈا کے تحت نہیں۔

اگر شناخت کے ابتدائی عناصر مشترک ہیں تو پھر وجود انسانی کے خارجی مظاہر کا تنوع نفرت و عداوت کا باعث نہیں بن سکتا۔ اس طرح زبانوں، رنگوں، نسلوں اور ثقافتی مظاہر کا اختلاف گلستان کے مختلف پھولوں کے رنگ اور مہک کے اختلاف کی طرح ہو جائے گا۔

قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تمام انسانوں کو نفس واحدہ سے پیدا کیا گیا ہے یعنی ان کی بنیاد ایک ہی ہے، پھر اسی نفس واحدہ سے اس کا جوڑا پیدا کیا گیا ہے اور پھر ان کو ملانے سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیے گئے۔[۱]

---

[۱] سورہ نساء آیہ ۱

۴۔۱۰۔۳۔ بنی آدم ایک دوسرے کے اعضاء ہیں

قرآن حکیم نے تمام انسانوں کو بنی آدم کہا ہے، گویا سب آدمؑ کے بیٹے اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ شیخ سعدی نے اس بات کو یوں نظم بند کیا ہے:

بنی آدم اعضای یکدیگرند
که در آفرینش ز یک گوهر ند
چو عضوی به درد آورد روزگار
دگر عضو ها را نماند قرار
تو کز محنت دیگران بی غمی
نشاید که نامت نهند آدمی

بنی آدم ایک دوسرے کے اعضا اور حصے ہیں کیونکہ یہ سب ایک گوہر سے پیدا کیے گئے ہیں جب کسی ایک حصے کو تکلیف ہوتی ہے تو دوسرے اعضا بھی قرار نہیں پاتے اگر تمھیں دوسروں کی تکلیف کا احساس نہیں تو شاید تمھارا نام آدمی نہ رکھا جا سکے۔

انسانوں کا مختلف زبانیں بولنا اور مختلف رنگوں کا حامل ہونا ایک حقیقت رکھتا ہے لیکن یہ حقیقت بھی اپنے اندر ایک حُسن اور زیبائی رکھتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیت اور نشانی قرار دیا ہے۔ اللہ کی آیت اور نشانی حَسین اور خوبصورت ہی ہے۔ اللّٰہ جمیلٌ اس پر شاہد ہے۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ[۱]

اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق نیز زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔

مختلف قبائل اور خاندانوں میں انسانوں کا تقسیم ہونا بھی کوئی ایسی تقسیم نہیں جو دوسرے سے نفرت کی بنیاد بنتی ہو کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تمھارے قبائل اور خاندان اس لیے بنائے ہیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ گویا قبائل اور خاندان شناخت کی بنیاد تو ہیں لیکن اس سے پہلے وہ

۱۔ الروم: ۲۲

سب کسی ایک بنیاد اور مرکز سے وابستہ ہیں جسے نفس واحدہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی یہ آیت اسی حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے:

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ [1]

اے انسانو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے ہیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، یقیناً زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہی ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ قبیلوں، خاندانوں زبانوں رنگوں، نسلوں اور علاقوں کا فرق اور اس کی بنیاد پر ایک دوسرے کو پہچاننا اور شناخت کرنا کوئی غلط اور منفی بات نہیں ہے لیکن اس کی بنیاد پر اپنے آپ کو دوسروں سے بالاتر اور مافوق سمجھنا، دوسرے کو کم تر سمجھنا یا پھر اس فرق کی بنیاد پر کسی کا احساس کمتری میں مبتلا ہو جانا درست نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو اپنے مقام انسانی کی حفاظت کرتا ہے اور جو قرآن کریم کی نظر میں متقی ہے، وہی قابل تکریم ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل نے پشاور میں منعقد ہونے والی ایک مکالماتی نشست میں اسی پس منظر میں فرمایا تھا:

اسلام متنوع شناختوں کو احترام دیتا ہے اور ہر شہری کو یہ آزادی بھی فراہم کرتا ہے کہ پرامن طور پر وہ اپنی پہچان کا قولی و عملی اظہار کر سکے۔ اگر مذہب کی حقیقی تعلیمات کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ شناخت کے مسائل کو حل کرتا ہے، الجھاتا نہیں ہے۔

۴۔۱۰۔۴۔ مسئلہ شناخت کے پیچھے استعماری مقاصد

دنیا میں اس وقت شناخت کے مسئلے پر طرح طرح کے نظریات موجود ہیں۔ اس حوالے سے بعض قوموں، گروہوں، مختلف مذاہب کے ماننے والوں اور مختلف رنگوں اور نسلوں کے لوگ طرح

---

[1] الحجرات: ۱۳

طرح کے حالات سے گزر رہے ہیں۔ بعض گروہ شناخت کے ایک خاص تصور کی وجہ سے بظاہر طاقتور ہو گئے ہیں اور بعض شناخت ہی کے معرکوں میں کچلے گئے ہیں یا کچلے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس میدان کارزار میں عام لوگوں کی فکری آویزش نے گروہی یا قومی گرم یا سرد معرکوں کی شکل اختیار کر لی ہے یا معاملہ اس سے زیادہ سنگین اور پیچیدہ ہے۔ دنیا میں جہاں بھی ہمیں شناخت کا بحران یا شناخت کی بنیاد پر مسائل دکھائی دیتے ہیں کیا حقیقی طور پر وہاں اصل مسئلہ شناخت ہی کا ہے؟ کیا اس کے پیچھے استعماری یا استیصالی مقاصد کارفرما نہیں، کیا سیاست، حکومت، اقتدار، سرمایہ، ہوس اور حرص کا اس میں کوئی کردار نہیں؟ شناخت کے مسائل کو آویزش اور جنگ میں تبدیل کر دینا کس کے مقاصد پورے کرتا ہے۔ کیا ملکوں کو توڑنے، لوٹ مار کرنے اور اپنی صنعتوں کی گراں قیمت مصنوعات کو فروخت کرنے کے لیے شناخت کے مسئلے سے سوئے استفادہ نہیں کیا جا رہا؟

شناخت کے مسئلے کی سنگینی کو سمجھنے کے لیے اس کے پیچھے چھپے ہوئے سیاسی اور استعماری ہتھکنڈوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

یہ درست ہے کہ انسان مختلف جغرافیوں میں بستے ہیں۔ ان کے مختلف رنگ ہیں، وہ مختلف قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں اور مختلف قومی ریاستوں کے شہری ہیں۔ ان میں سے ہر پہلو حقیقت رکھتا ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے جنگ کیوں شروع ہو جاتی ہے، اس کی وجہ سے نفرتیں کیوں پروان چڑھنے لگتی ہیں؟ بعض لوگ اپنی شناخت کے کسی حصے کو چھپانے پر کیوں مجبور ہو جاتے ہیں؟ ہم سمجھتے ہیں کہ جس معاشرے میں کسی فرد یا گروہ کو اپنی مذہبی، لسانی، قومی یا علاقائی شناخت چھپانا پڑ جائے سمجھ لیں کہ وہاں پر فکری استبداد کی حکمرانی ہے۔

۴۔۱۰۔۵۔ ”پاکستانی“ کی شناخت

آپ دیکھیں گے کہ پاکستان میں جو فرقہ زیادہ طاقتور ہے اس کے افراد سینہ تان کر اسی فرقے سے اپنی شناخت کو ظاہر کرتے ہیں جب کہ جو لوگ اقلیتی مذہب یا معاشرتی لحاظ سے کمزور گروہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ کم ہی اپنی شناخت کو ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ اقلیتوں سے وابستہ افراد کا

اصرار رہتا ہے کہ انھیں ان کے مذہب کے بجائے پاکستانی ہونے کے عنوان سے پہچانا جائے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب ان کی شناخت ایک پاکستانی ہونے کے حوالے سے کی جائے گی تو وہ دیگر تمام مذاہب و مسالک کے ماننے والوں کے برابر ہو جائیں گے۔ حالانکہ ہماری نظر میں اگر وہ اپنے مذہب یا مسلک کے عنوان سے بھی اپنی شناخت کروائیں تو بھی انھیں معاشرے میں برابر کا احترام حاصل ہونا چاہیے، اس کے لیے ضروری ہے کہ اکثریتی گروہ اپنے طرز عمل کو تبدیل کرے۔

پاکستان کے سیاستدانوں کو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حسب ضرورت کبھی اپنے آپ کو قومی سطح کا سیاستدان ظاہر کرتے ہیں اور کبھی اپنی حیثیت صوبے یا علاقے کے عنوان سے منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی سیاسی ضروریات کے لیے وہ صوبائی تعصب یا قبائلی تعصب کو ہوا دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ کسی صوبے یا قبیلے یا قوم سے تعلق دوسروں سے نفرت کا باعث نہیں بننا چاہیے۔ ہاں اگر واقعاً کسی علاقے یا صوبے یا قبیلے کو کسی دور میں تعصب کا نشانہ بنایا گیا ہے اور اسے اس کے جائز حقوق سے محروم رکھا گیا ہے اور ترقی کے راستے اس پر مسدود کر دیے گئے ہیں تو وہ ضرور خصوصی توجہ اور محبت کا حق رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دور کے بنی اسرائیل کو فرعونیوں کے استبداد سے نجات دلانے کے لیے قیام کیا تھا۔ یہ قبیلہ پرستی نہ تھی بلکہ مظلوم اور مستضعف قوم یا گروہ کی نجات کی جدوجہد تھی۔

۴۔۱۰۔۶۔ریاست اور شناخت

شناخت کا عصر حاضر میں بہت بڑا عنوان ریاست قرار پائی ہے۔ اس وقت دنیا میں کم وبیش 180 ریاستیں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ریاست سے دوسری ریاست میں جانے والا شہری اپنی ریاست سے اپنی شناخت کو وابستہ کرتا ہے۔ وہاں کا پاسپورٹ اپنی شناخت کے لیے پیش کرتا ہے۔ اس طرح سے دیکھیں تو ریاستوں کی موجودہ تقسیم نے انسانوں کو کم وبیش 180 خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ اس حوالے سے ایک پہلو بہت ہی اہم ہے کہ آج دنیا میں جو ریاستی سرحدیں موجود ہیں یہ ہمیشہ سے یوں نہ تھیں اور نہ ہمیشہ یوں رہیں گی، ملک پھیلتے اور سکڑتے رہتے ہیں۔ یوں شناخت بھی پھیلتی اور سکڑتی رہتی ہے۔ مثلاً 1947 سے پہلے برصغیر کے انسان قومی اعتبار سے ایک

ہی شناخت رکھتے تھے، ہندی یا ہندوستانی۔ پھر اس کے بعد جب بٹوارا ہوا تو ہم بھارتی اور پاکستانی شناختوں میں بٹ گئے۔ 1971 میں جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا تو مشرقی پاکستانیوں کی شناخت پاکستانی نہ رہی بلکہ وہ بنگلہ دیشی ہو گئے۔ اس سے زیادہ تقسیم ہمیں دوسری جنگ عظیم کے بعد خلافت عثمانیہ سے وابستہ علاقوں میں دکھائی دیتی ہے۔ آج جو بہت سے چھوٹے چھوٹے ممالک یا ریاستیں موجود ہیں ان کا وطن یا ریاست کی حیثیت سے کوئی وجود نہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہر دور کے زیادہ تر لوگوں کو اپنی ریاستی شناخت سے متعصبانہ وابستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعد میں یہی تعصب نئی سرحدوں کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تعصب فقط اپنی ریاست سے محبت کا ترجمان نہیں ہوتا بلکہ اکثر و بیشتر تاریخی عوامل کی وجہ سے دوسری کئی ایک ریاستوں سے نفرت کا باعث بھی بنتا ہے۔ حالانکہ آج کی ریاست کی حدود کل کو مزید سکڑ بھی سکتی ہیں اور پھیل بھی سکتی ہیں۔ ایسے میں انسانوں کو سوچنا ہے کہ ریاست کی موجودہ قومی شناخت کے ساتھ ہماری وابستگی کی سطح کیا ہونا چاہیے۔ پھر بات ایک ریاست کی حدود تک نہیں رہتی بلکہ اس کے اندر یعنی ایک خارجی وحدت کے باوجود لسانی، قبائلی اور قومیتی بنیادوں پر تقسیم در تقسیم کے سلسلے دکھائی دیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر دوسروں سے نفرتیں بھی پنپ رہی ہوتی ہیں جو کبھی منہ زور بھی ہو جاتی ہیں۔ بلوچستان سے پنجابیوں کی لاشوں کا اپنے علاقوں کی طرف آنا پاکستان کے اندر نفرت کے ابلتے لاووں کی ایک مثال ہے۔

۴۔۱۰۔۷۔ سچائی کا ایک عنصر تو ہر کہیں ہوتا ہے

بعض لوگ اپنے محدود مقاصد کے لیے بعض شناختوں کے علم بردار بن جاتے ہیں اور مختلف شناختوں کے مابین تنازع پیدا کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اپنی شناخت کو ''مقدس'' قرار دے کر دوسری ہر شناخت سے ٹکراؤ کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس سے معاشرے میں نفرتوں کی بنیاد پڑتی ہے۔ ہر شناخت اپنے درجے پر سچائی کے ایک عنصر کی حامل ہوتی ہے۔ ایک رنگ کے مختلف شیڈز ہوتے ہیں یہ معاشرے کی رنگا رنگی کا حصہ ہوتے ہیں۔

۴۔۱۰۔۸۔ علامہ اقبال کا پیغام

علامہ اقبال پر اگرچہ کئی حوالوں سے اعتراضات کیے جاتے ہیں لیکن آیئے دیکھتے ہیں کہ

مندرجہ نظم میں وہ کیسے مختلف شناختوں کے حامل افراد کو ایک دوسرے سے گلے لگنے کا پیغام دے رہے ہیں:

آ، غیریت کے پردے اِک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سُونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اِک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

۴۔۱۱۔فضیلت کا معیار قومیت نہیں، تقویٰ ہے

پیش نظر مقالہ ستمبر 2016ء میں مفتی سعودی عبدالعزیز آل الشیخ کے بیان کے پس منظر میں لکھا گیا۔

بیان کا لنک ملاحظہ ہو

https://www.bbc.com/arabic/middleeast/2016/09/160906_saudi_iran_mufti_hajj

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری حج کا خطبہ دیا تو اس میں یہ بھی ارشاد فرمایا:

يا ايها الناس ان ربكم واحد و أباكم واحد ألا لافضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا أسود على أحمر ولا أحمر على أسود الا بالتقوى [1]

لوگو! بے شک تمھارا رب ایک ہے اور بے شک تمھارا باپ ایک ہے، ہاں عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

قرآن حکیم پہلے ہی ارشاد فرما چکا تھا:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ [2]

اے لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھارے گروہ اور قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے۔

---

۱) مجمع الزوائد: ج ۳، ص ۲۶۶، مسند احمد: ۵، ۴۱۲

۲) الحجرات: ۱۳

رسول اللہ تشریف لائے تو مکہ کے لوگ بت پرست اور مشرک تھے سوائے چند ایک کے۔ اسی طرح تمام عرب میں بت پرست اور اہل کتاب ہی رہتے تھے۔آپ کی دعوت اور جدو جہد کے نتیجے میں آہستہ آہستہ اسلام پھیلتا چلا گیا اور پھر آپ کے بعد عرب سرحدوں سے نکل کر دیگر ملکوں اور براعظموں تک پہنچتا رہا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ایران جسے اس زمانے میں فارس کہتے تھے، سے گزرتے ہوئے ہندوستان تک آ پہنچا۔ دوسری طرف وہ اہل افریقہ کے دلوں کو فتح کرتا رہا اور پھر ان سے آگے بڑھ کر یورپ تک پہنچ گیا۔ ظاہر ہے یہ تمام لوگ پہلے مسلمان نہ تھے۔

نبی پاکؐ کے روشن اصولوں کے لحاظ سے تمام انسان مساوی ہیں اور جیسا کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

حیرت کی بات ہے کہ سعودی عرب کے مفتی اعظم نے اس سرزمین پر اور ان دنوں میں تفرقے کی بات کی ہے جس سرزمین پر اور جن دنوں میں رسول اللہؐ نے انسانوں کی مساوات کی بات کی تھی۔ حال ہی میں سعودی عرب کے مفتی شیخ عبدالعزیز آل الشیخ نے ایرانی قیادت اور ایرانی لوگوں کے بارے میں ایسے کلمات ادا کیے ہیں جنھیں دہرانا بھی ہم اپنے لیے بہت مشکل محسوس کر رہے ہیں۔ ہم ''نقل کفر، کفر نباشد'' کے مصداق شیخ کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں:

یجب أن نفهم أن هؤ لا ليسوا مسلمين، فهم أبنا المجوس، وعدائو هم مع المسلمين امر قديم

واجب ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہیں پس یہ مجوس کی اولاد ہیں اور مسلمانوں سے ان کی دشمنی ایک امر قدیم ہے۔

اگر مفتی آل شیخ نے اتنی صراحت سے اور اتنے واشگاف الفاظ میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف یہ بات نہ کی ہوتی یا وہ ایک نہایت حساس اور اہم منصب پر نہ ہوتے تو ہم اسے نظر انداز کر دیتے لیکن افسوس کہ حج کے مہینے میں، محترم ترین ایام میں اور محترم ترین سرزمین پر ایک انتہائی اہم روحانی منصب پر فائز ایک شخصیت نے اسلام کی روح کے خلاف ایسی بات کی ہے جس سے اہل ایمان کی روحیں زخمی ہو گئی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جب اہل ایران اسلام لے آئے تو ان کی حالت بھی ان عربوں جیسی ہو گئی جو آنحضرتؐ کی دعوت پر اسلام لے آئے تھے۔ اب نہ ہمارے لیے مناسب ہے کہ ہم حجاز کے مسلمانوں سے کہیں کہ اے مشرکوں کی اولاد اور نہ یہ مناسب ہے کہ ہم ایرانیوں سے کہیں کہ اے مجوس کے بیٹو۔ یہ توہین آمیز القاب اسلام میں روا نہیں۔ اسی طرح سے قرآن حکیم یہ بھی ارشاد فرماتا ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا [1]

اور جب کوئی تمھیں سلام کہے تو اسے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں۔

نبی کریمؐ کی مختلف احادیث میں واضح طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں مسلمان ہوں، تو تم یہ نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو، کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا ہے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود نبی کریمؐ نے فارس کے رہنے والوں سے ان کے مسلمان ہونے کے بعد ان سے کیا سلوک کیا۔ اس کی سب سے بڑی مثال حضرت سلمان فارسی کی ہے جن کے بارے میں ایک حدیث میں رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ جنت تین افراد کی مشتاق ہے: علی، عمار اور سلمان کی۔ حدیث کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

(قال رسول اللہ(ص): اشتاقت الجنۃ الی ثلاثۃ علی و عمار و سلمان)

اس حدیث کے بارے میں امام حاکم کہتے ہیں:

ھذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ [2]

یہ حدیث اسناد کے لحاظ سے صحیح ہے اگرچہ اسے بخاری و مسلم نے درج نہیں کیا۔ [3]

سنن ترمذی میں بھی یہ حدیث روایت کی گئی ہے۔

آنحضرتؐ کی یہ مشہور حدیث کس نے نہیں سنی:

---

[1] نساء: ۹۴

[2] سنن الترمذی، حدیث ۳۷۳۲

[3] مستدرک الحاکم، حدیث ۴۶۶۶

سلمان منا أهل البيت.

سلمان ہم اہل بیت میں سے ہیں۔

اس حدیث کو حاکم، طبرانی اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے۔[1]

ہاں البتہ اللہ تعالیٰ جو دلوں کے بھید جانتا ہے وہ اگر کسی گروہ کے بارے میں کچھ فرمادے تو وہ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے۔ چنانچہ وہ اعراب کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ [2]

عرب بدو سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور اس قابل ہیں کہ جو احکام خدا نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں ان سے واقف نہ ہوں اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ [3]

عرب بدو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اے رسول آپ ان سے کہہ دیں کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ کہو کہ ہم نے سر تسلیم خم کرلیا ہے اور ایمان ابھی تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

اسی طرح رسول اکرم بھی کسی قوم، کسی فرد یا کسی علاقے کے بارے میں جو فرمائیں وہ برحق ہے چونکہ ان کے علم کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے۔ آیئے اس سلسلے میں آنحضرت کی اس حدیث پر نظر ڈالتے ہیں۔

---

[1] المستدرک، ۳/ ۵۹۸ اور مسند طبرانی، ۶/ ۲۶۱

[2] التوبہ: ۹۷

[3] الحجرات: ۱۴

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

اللهم بارک لنا في شامنا و في يمننا

یا اللہ ہمیں ہمارے شام اور یمن میں برکت عطا فرما۔

قالوا: و في نجدنا؟

صحابہ نے پوچھا اور ہمارے نجد میں؟

اس سوال پر بھی آنحضرتؐ نے اپنا پہلے والا جملہ دہرایا:

قال: اللهم بارک لنا في شامنا و في يمننا۔

یا اللہ ہمیں ہمارے شام اور یمن میں برکت عطا فرما۔

قالوا: و في نجدنا؟

صحابہ نے پھر پوچھا اور ہمارے نجد میں؟

قال: هناک الزلازل و الفتن, و بها يطلع قرن الشيطان

آنحضرتؐ نے فرمایا: وہاں سے زلزلے اور فتنے نکلیں گے اور وہاں سے شیطان کا سینگ نمودار ہوگا۔[1]

سرزمین نجد کے ہونہار فرزند جناب مفتی آل شیخ کی توجہ ہم اہل فارس کے بارے میں آنحضرتؐ کی احادیث کی طرف بھی دلانا چاہتے ہیں۔

صحیح بخاری میں حدیث نمبر ۴۵۱۸ ملاحظہ کیجیے:

عن أبي هريره (رض) قال كنا جلوسا عند النبي (ص) فأنزلت عليه سورة الجمعة وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ قال قلت من هم يا رسول الله فلم يراجعه حتى سأل ثلاثا و فينا سلمان الفارسي وضع رسول الله (ص) يده على سلمان ثم قال لو كان الايمان عند الثريا لناله رجال أو رجل من هؤلاء

---

۱) صحیح بخاری، ح ۷۱۰۳ و صحیح مسلم، ح ۲۹۰۵

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہؐ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سورہ جمعہ نازل ہوئی اور جب آپ اس آیت تک پہنچے ''اور ان میں سے اور لوگوں کی طرف بھی (ان کو بھیجا ہے) جو ابھی ان (مسلمانوں سے) نہیں ملے۔'' حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں یا رسول اللہ یہ کون لوگ ہیں آنحضرت نے توجہ نہیں فرمائی۔ یہاں تک کہ آپ سے تین مرتبہ یہ سوال کیا گیا اور ہم میں سلمان فارسی موجود تھے رسول اللہ نے سلمان پر اپنا ہاتھ رکھا پھر فرمایا اگر ایمان ثریا تک جا پہنچے تو اس کی قوم میں سے رجال یا رجل اسے واپس لے آئے گا۔

صحیح مسلم میں بھی اسی طرح کی حدیث منقول ہوئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله (ص) لو كان الدين عند الثريا لذهب به رجل من فارس أو قال من أبناء فارس حتى يتناوله[1]

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر دین ثریا تک جا پہنچے تو فارس کا ایک شخص یا فرمایا فارس کے بیٹے اسے پا لیں گے۔

یہی وہ اہل ایران ہیں جنھیں رسول اللہؐ ابنائے فارس کہہ رہے ہیں یا سلمان کی قوم کے لوگ کہہ رہے ہیں اور مفتی آل شیخ انھیں ابناء المجوس کہہ کر خطاب فرما رہے ہیں۔

اسی طرح کی روایات مسند احمد ابن حنبل، سنن ترمذی اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہیں۔ خارج میں بھی آنحضرتؐ کی پیشگوئیاں پوری ہوتی ہوئی واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ ہم زیادہ تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتے صرف ابناء فارس میں سے چند محترم اسماء اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ عظیم مفسر امام زمخشری ۲۔ عظیم محدث امام بخاری

۱) صحیح مسلم، فضائل الصحابہ، فضل فارس، رق الحدیث، ۴۶۱۸

۳۔ عظیم فقیہ امام ابوحنیفہ ۴۔ عظیم نحوی سیبویہ
۵ عظیم مورخ طبری ۶۔ عظیم متکلم واصل بن عطاء
۷۔ امام اللغۃ فیروز آبادی صاحب القاموس المحیط
۸۔ امام غزالی ۹۔ امام فخر الدین رازی
۱۰۔ عظیم فیلسوف ابن سینا ۱۱۔ اور ابن رشد

ہمیں افسوس ہے کہ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم اس موضوع کا حق ادا کرسکیں۔ ہمیں علامہ اقبال یاد آتے ہیں جنھوں نے اسلام کے نظریہ قومیت سے ہٹ کر جب مدرسہ دیوبند کے سربراہ حسین احمد کی بات سنی، (اگرچہ بعض محققین نے بعدازاں حضرت حسین احمد سے اس بات کی نسبت کو درست نہیں کہا) تو آپ نے ارتجالاً اس ردعمل کا اظہار کیا:

عجم ہنوز نداند رموز دین ورنہ
زدیوبند حسین احمد این چہ بوالعجبیست
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربیست
بمصطفی برسان خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبیست

ہم بھی ارتجالاً اس میں کچھ تصرف کے ساتھ عرض کرتے ہیں:

عرب عجم را مساوی کند پیمبرؐ ما
ولی زمفتی بے اصل این چہ بے ادبیست
سرود بر سر منبر سرودۂ باطل
ز سرزمین نبیؐ باز این چہ بو العجبیست
بمصطفی برسان خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبیست

باب پنجم

✲✲✲✲✲✲✲

عرفانیات

۵۔۱۔صوفیا کی روایت میں انسان دوستی

صوفیا کا مشرب عشق الٰہی اور انسان دوستی ہے۔ان کی انسان دوستی ان کے عشق الٰہی سے پھوٹتی ہے۔ وہ خدمت انسان میں رضائے الٰہی تلاش کرتے ہیں۔ یہی انبیاء کا راستہ ہے، یہی قرآن کی سبیل ہے۔تمام آسمانی کتابیں انسانوں کے لیے خیر اور بھلائی کا پیغام رکھتی ہیں۔تمام انبیاء انسانوں سے محبت کا عملی نمونہ رہے۔انسان دوستی پیغام انبیاء کی روح ہے۔صوفیا اور عرفا کے طرز عمل اور فکر کے پس منظر میں یہی آسمانی ہدایت اور آسمانی ہادیوں کا کردار موجود ہے۔صوفیا کے کلام اور خاص طور پر تصوف کی شعری روایت میں انسان دوستی اپنی گہرائیوں اور پہنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔

صوفیا کے نزدیک یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان مردم بیزار ہو کر مقبول بارگاہ پروردگار ہو جائے۔صوفیا اور عرفا نے اپنے عمل اور قول کے ذریعے انسانی معاشرے کے لیے امن وسلامتی کا پیغام دیا۔انھوں نے تمام انسانوں کو عیال اللہ جانا، انھوں نے نفرت کے بجائے محبت کا پیغام عام کیا۔ان کی انسان دوستی دین کے پھیلنے اور مقبولیت کا سبب ہوئی۔ ہمارے بلند پایا شعراء نے بھی جن میں سے بیشتر صوفی مشرب ہیں، اپنی شاعری میں یہی پیغام عام کیا ہے۔

حضرت فاطمۃ الزہرؑا کی فقیر و محتاج کے لیے دل سوزی کو ایک شعر میں علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں:

بھرِ محتاجے دلش آں گونہ سوخت
با یھودے چادرِ خود را فروخت
پوری کی احتیاج کچھ ایسے فقیر کی
چادر جو پاس تھی وہ یہودی کو بیچ دی

مولانا رومی کو روایت تصوف و عرفان میں بہت بلند مقام حاصل ہے، ان کا کلام صلح و آشتی

کے پیغام سے مملو ہے وہ ہر حالت میں خلق خدا سے خیر کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

خیر کن با خلق، بهر ایزدت
یا برایِ راحتِ جان خودت
تا هماره دوست بینی در نظر
در دلت ناید زکین ناخوش صُور

وہ کہنا چاہتے ہیں کہ تم نیکی اللہ کی رضا کے لیے کرو اور اگر خدا کی رضا کے لیے نہیں کرتے تو کم ازکم اپنی حفظ و راحت جان کے لیے ہی کرو اور یہ سلسلہ جاری رکھو، اس صورت میں سب لوگ تمھارے ہو جائیں گے اور تمھارے دوست بن جائیں گے اور تمھاری جان کینے اور دشمنی والی صورتیں نہیں دیکھے گی۔

قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے کہ تمام انسانوں کو نفس واحدہ سے پیدا کیا گیا ہے یعنی ان کی بنیاد ایک ہی ہے، پھر اسی نفس واحدہ سے اس کا جوڑا پیدا کیا گیا ہے اور پھر ان کو ملانے سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیے گئے۔[۱]

نبی کریمؐ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ تمام مسلمان ایک بدن کی طرح ہیں، اس کے ایک حصے کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا بدن بے خواب ہو جاتا ہے۔ ایک اور حدیث میں یہی بات تمام انسانوں کے لیے کی گئی ہے۔ شیخ سعدی نے اس بات کو یوں نظم بند کیا ہے:

بنی آدم اعضای یکدیگرند
که در آفرینش ز یک گوهر ند
چو عضوی به درد آورد روزگار
دگر عضو ها را نماند قرار
تو کز محنت دیگران بی غمی
نشاید که نامد نهند آدمی

۱) سورہ نساء، آیت ۱

بنی آدم سب ایک دوسرے کے اعضاء کی طرح ہیں کیونکہ سب ایک گوہر سے پیدا کیے گئے ہیں، کسی ایک حصے کو کسی روز اگر تکلیف ہو جائے تو تمام دیگر اعضاء بے قرار ہو جاتے ہیں، اگر تو دوسروں کی تکلیف سے بے غم ہے تو پھر شاید تمھارا نام آدمی نہیں ہو سکتا۔

سعدی نے معاشرے میں امن و سلامتی اور صلح و صفا کے لیے بھی بہت خوبصورت پیغام دیا ہے۔ ایک مقام پر وہ کہتے ہیں:

جهاندیده بعد از دو رکعت نماز
به داور برآورد دست نیاز
که ای برفرازندۂ آسمان
به جنگش گرفتی به صلحش بمان

ایک جہاں دیدہ شخص دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد اللہ کے حضور دست نیاز بلند کرتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ اے آسمانوں کی بلندیوں پر رہنے والے ہماری زمین پر سے جنگ کو ختم کر دے اور یہاں امن و صلح قائم فرمادے۔

ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

من امروز کردم در صلح باز
تو فردا مکن در به رویم فراز

میں نے آج امن و صلح کا دروازہ کھولا ہے، تم آنے والے کل کو میرے سامنے اپنا دروازہ نہ کھولنا۔

حافظ شیرازی بھی اس وادی میں کسی سے پیچھے نہیں، وہ فرماتے ہیں:

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرفست
بادوستان مروّت با دشمنان مدارا

اس زمین کا آرام و راحت ان دو حرفوں کی تفسیر سے عبارت ہے کہ دوستوں سے مروت رکھو اور دشمنوں سے مدارا کرو۔

دوسروں کو آزار نہ دینے کے حوالے سے کہتے ہیں:

مباش در پی آزار و هرچه خواهی کن
که در شریعت ما غیر از این گناهی نیست

کسی کے درپئے آزار نہ ہو اور اس کے علاوہ جو چاہو کرو کیونکہ ہمارے شریعت میں اس کے علاوہ کوئی گناہ نہیں ہے۔

سعدی کے نزدیک تو طریقت اور سلوک الی اللہ فقط خدمت خلق میں پنہاں ہے۔

وہ کہتے ہیں:

طریقت به جز خدمت خلق نیست
به تسبیح و سجاده و دلق نیست

طریقت، تسبیح، سجادہ اور چادر کا نام نہیں بلکہ طریقت خدمت خلق کے سوا کچھ بھی نہیں۔

عموماً عرفا و صوفیا مظاہر شریعت کے بجائے بندگان خدا کی دلجوئی کو اپنا مطمح نظر قرار دیتے ہیں اور اسی ذریعے سے اپنے پروردگار سے رضا جوئی کے درپے رہتے ہیں۔ بابا بلھے شاہ سے منسوب ایک شعر ہے جسے بعض لوگ میاں محمد بخش کا قرار دیتے ہیں اور جو زبان زد عام ہے، یہی پیغام لیے ہوئے ہے۔

مسجد ڈھا دے مندر ڈھا دے ڈھا دے جو کجھ ڈھیندا اے
اک بندے دا دل ناں ڈھاویں رب دلاں وچ رہندا اے

امام خمینی کا دیوان بھی ایسے اشعار سے معمور ہے۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

در میخانه گشائید به رویم، شب و روز
که من از مسجد واز مدرسه بیزار شدم
جامۀ زهد و ریا کندم و برتن کردم
خرقۀ پیر خراباتی و هشیار شدم

میرے سامنے میخانے کا دروازہ کھول دو کہ میں دن رات اس میں جاؤں کیونکہ میں مسجد اور

مدرسے سے بیزار ہو گیا ہوں، میں نے زہد و ریا کا جامہ پھاڑ دیا ہے اور پیر خراباتی کا خرقہ پہن لیا ہے اور مجھے ہوش آ گیا ہے۔

خدمت خلق کے حوالے سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے پیر و مرشد خواجہ عثمان ہارونیؒ کا ایک قول اپنی کتاب ''انیس الارواح'' کی دسویں مجلس میں یوں بیان کیا ہے:

جب کوئی پیاسے کو پانی پلاتا ہے، اس وقت اس کے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں، وہ ایسا ہوتا ہے جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو، اگر وہ مر جائے تو اس کا شمار شہداء میں ہوگا۔ پھر فرمایا جو شخص بھوکے کو کھانا کھلائے اللہ اس کی ہزار ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور جہنم کی آگ سے اسے آزاد کرتا ہے اور جنت میں اس کے لیے محل مخصوص کرتا ہے۔

فرحت احساس کا ایک خوبصورت شعر صوفیانہ مٹھاس اور محبت کو لیے ہوئے ہے:

علاج اپنا کراتے پھر رہے ہو، جانے کس کس سے
محبت کر کے دیکھو نا محبت کیوں نہیں کرتے

صوفیاء کی رائے میں ملا اور پادری انسانوں کو تقسیم کرتے ہیں جب کہ مشربِ تصوف انسانوں کو باہم جوڑنے کا نام ہے۔ علامہ اقبال اپنی ایک مختصر نظم میں ملا کے بارے میں اپنا نظریہ نہایت عمدگی سے بیان کرتے ہیں:

مَیں بھی حاضر تھا وہاں، ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ مُلّا کو مِلا حکمِ بہشت
عرض کی مَیں نے، الٰہی! مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیِ اقوام و مِلل کام اس کا
اور جنّت میں نہ مسجد، نہ کلیسا، نہ کنشت!

عبید اللہ سندھی ایک مقام پر کہتے ہیں:

ہمارے صوفیاء کرام نے خدا پرستی کی اس عملی شکل، انسان دوستی کو تو اصل دین قرار دیا تھا ان کا تو یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ جسے صرف اپنے گروہ یا جماعت سے محبت ہے اور وہ دوسروں کو جو اس کے ہم عقیدہ نہیں نفرت سے دیکھتا ہے، وہ سچا موحد اور خدا پرست نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی تعلیمات میں اس بات پہ زور دیتے تھے کہ تمام انسانوں کو ''عیال اللہ'' سمجھو اور ان کا اپنا عمل بھی اس کا شاہد تھا، لیکن اس سے یہ خیال نہ ہو کہ انھوں نے صواب اور ناصواب اور ثواب و گناہ کی تمیز اٹھا دی تھی، بے شک وہ نیکوکار کو اچھا سمجھتے تھے لیکن غلط کار کا ان کو نیکوکار سے زیادہ خیال رہتا تھا اور جس طرح ماں اپنے نافرمان بچے کے لیے زیادہ کڑھتی ہے اور اس کا اسے دوسروں سے زیادہ خیال ہوتا ہے اسی طرح غلط کار کو سیدھے راستے پر لگانے کے لیے یہ خدا پرست بزرگ تیار رہتے تھے۔

ان کی یہ کیفیت دراصل قرآن کریم کی اس عبارت کی عکاسی ہے:

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ [1]

یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کی نافرمانی پر خوش نہیں ہوتا بلکہ اسے افسوس ہوتا ہے وہ اظہار حسرت و غم کرتا ہے۔ صوفیاء اور عرفاء کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

ہم اپنی گفتگو کو ڈاکٹر طاہر القادری کی اس بات پر تمام کرتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں درج ذیل دو رویے ہمیشہ رہے ہیں:

صوفیاء کا رویہ:

اس رویہ کے حاملین کا طرز ہمیشہ سے لوگوں کو اسلام میں داخل کرنا رہا ہے اور ہے۔

انتہا پسندوں کا رویہ:

اس رویہ کے حاملین کا رویہ ہمیشہ سے مسلمانوں کو اسلام سے خارج کرنا رہا ہے اور ہے۔

---

۱) یٰس: ۳۰

۵۔۲۔حروف اور لفظ بے جان نہیں ہوتے

۵۔۲۔۱۔حواس خمسہ کی حدود

جاندار اور بے جان کا ایک تصور مادی کائنات پر نظر رکھنے والے سائنسدانوں کا ہے۔ان کی اپنی تعریف کی حدود کے نقطۂ نظر سے وہ درست بھی ہے لیکن کائنات صرف مادی نہیں ہے اس لیے جاندار کی وہ تعریف جو مادی کائنات کے لیے کی گئی ہے اسے غیر مادی کائنات کے لیے درست سمجھنا حدود سے تجاوز ہے۔جو لوگ مادی کائنات کا سراغ لگانے نکلے ہیں،ان کی تلاش پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔انھیں مادی کائنات کے حقائق کی ضرور جستجو کرنا چاہیے۔تلاش و جستجو حقیقت کے سراغ کے لیے ہو تو اس پر اعتراض کوئی اہل عقل وخرد کر بھی نہیں سکتا البتہ مادی کائنات کا قانون دریافت کرنا اور اسے ماورائے مادہ پر بھی محیط جاننا،کسی طور مناسب نہیں،اسی کو ہم حدود سے تجاوز کہتے ہیں۔

۵۔۲۔۲۔حواس خمسہ سے غائب حقائق

جو افراد ''اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ'' کے مصداق ہیں اور حقیقی مصداق ہیں،وہ حواسِ مادی سے ماوراء حقائق ہی کو غیب جانتے ہیں اور ان کے ''وجود'' کو تسلیم کرتے ہیں۔وجودِ باری تعالیٰ، ملائکہ کا وجود نیز جنت وجہنم کا وجود مادی حواس سے غیب ہے۔''اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ'' ان حقائق پر ایمان رکھتے ہیں۔

البتہ غیر مادی حقائق صرف وہی نہیں جن کا ذکر ہم نے مندرجہ بالا سطور میں کیا ہے۔اس سلسلے میں کچھ مزید اشارے ہم آئندہ کی سطور میں کریں گے۔پہلے یہ عرض کر دیں کہ حقیقت اور وجود کے معاملے میں اختلاف رائے کی ایک بنیادی وجہ ''ذرائع علم'' کے فہم میں اختلاف ہے۔اس موضوع کو دانش مندوں نے ''علم المعرفہ'' یا ''مسئلہ شناخت'' کے زیر عنوان بیان کیا ہے۔اہل دین کے نزدیک ''وحی'' بھی ''ذرائع علم'' میں سے ہے۔مادی کائنات کی شناخت حواسِ خمسہ کے ذریعے کی

جاتی ہے اور حواسِ خمسہ کے ذریعہ اکٹھی کی جانے والی معلومات کے تجزیہ وتحلیل کا کام ''عقل'' سے لیا جاتا ہے۔ جو لوگ وحی کو ذریعہ علم کے طور پر مانتے ہیں وہ حواس وعقل سے حاصل ہونے والے نتائج کی نفی نہیں کرتے اور نہ ان ذرائع علم کی اہمیت کا انکار کرتے ہیں۔ وحی کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات کا بنیادی تعلق ماورائے مادہ حقائق سے ہے۔ البتہ مادی کائنات کی حدود میں پہنچنے والی وحی کو ''نزول'' کرنا پڑتا ہے یعنی نچلے مرتبے اور درجے پر موجود مخلوق کو اس کی سطح کے مطابق حقائق پہنچانا پڑتے ہیں۔ پھر کوئی جتنا ان حقائق کو اخذ کرتا چلا جاتا ہے اتنا ہی بلند تر حقائق تک رسائی کا امکان اس کے لیے پیدا ہوتا جاتا ہے۔

۵۔۲۔۳۔ ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے

قرآن حکیم، منزل من اللہ وحی الٰہی کی محفوظ ترین شکل ہے۔ اس کے مطابق کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے، اس کی حمد کے ساتھ لیکن مادی کائنات میں اسیر انسان اس تسبیح کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا۔

اس سلسلے میں قرآن حکیم کی چند آیات ملاحظہ فرمائیں:

اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ [1]

اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو البتہ تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ [2]

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ [3]

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ [4]

---

[1] ۱۷۔ بنی اسرائیل: ۴۴

[2] ۵۷۔ حدید: ۱

[3] ۵۹۔ حشر: ۱۔ وصف

[4] ۶۸ جمعہ: ۱۔ وتغابن

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔

۵۔۲۔۴۔اشیائے عالم کی تسبیح حقیقی ہے یا غیر حقیقی

مسئلہ اس حوالے سے یہ ہے کہ اشیائے عالم کی تسبیح حقیقی ہے یا غیر حقیقی؟ بعض کا کہنا ہے کہ ہر چیز اپنے وجود میں اللہ کے سبّوح وقدوس اور محمود ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا یہ دلالت کرنا ہی ''تسبیح وتحمید'' ہے۔ یعنی یہ تسبیح زبان حال سے ہے۔

ہم عرض کریں گے کہ یہ کونسی بات ہے جو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ہر شخص ذرہ بھر بھی غور کرے تو اس حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ بات کہنا اور سمجھنا غلط نہیں ہے کہ ہر چیز کا وجود اللہ کے سبّوح وقدوس اور محمود ہونے پر دلالت کرتا ہے لیکن جب قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح وتحمید کرتی ہے تو کیا وہ یہی کہنا چاہتا ہے؟ اختلاف رائے یہاں پر ہے۔ کیا ہر چیز شعور اور ارادے کے ساتھ اللہ کی تسبیح کرتی ہے یا نہیں؟ اگر شعور اور ارادے سے تسبیح وتحمید کرتی ہے تو پھر یہ حقیقی ہے ورنہ نہیں۔ اسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ ''لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں''۔ یعنی ہم اس تسبیح کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

یہ رویہ درست نہیں کہ قرآن حکیم کی جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے اس کی ایسی تاویل کر لی جائے جو ہماری سمجھ میں آجائے۔ پیغمبر اکرمؐ کو جو ''انشراح'' حاصل ہوا کیا وہ ہمیں بھی حاصل ہے؟ کیا قلب محمدؐ پر جو حقائق اترے ہیں وہ تمام تر ہمارے سینے پر بھی اترے ہیں اور اترتے ہیں؟ اس کا آسان جواب ہے نہیں۔ اگر یہ جواب درست ہے تو قرآن حکیم کے ایسے مقامات جو ہماری سمجھ میں نہ آئیں ان کے بارے میں یہ مان لینے میں کیا مضائقہ ہے کہ اس امر کی حقیقت ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور زیر بحث معاملے میں خود قرآن ہی یہ فرما رہا ہے کہ تم اس تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ تو آیئے اعتراف کر لیں کہ اس تسبیح کی حقیقت کو ہم نہیں سمجھتے، مگر یہ کہ حقیقتوں کی گہرائیوں اور وسعتوں میں سے کسی کو کچھ عطا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ منتخب فرما لے جیسا کہ بعض کے بارے میں فرمایا ہے:

عِنۡدَهٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡکِتٰبِ[1]

---

۱) ۲۷۔نمل:۳۹

یا۔۔۔مَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ[1]

یا جنھیں ’’ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ ‘‘[2] فرمایا گیا ہے۔

ان میں سے پہلی آیت حضرت سلیمانؑ کے ایک مصاحب کے بارے میں ہے جس نے پلک جھپکنے میں تختِ بلقیس حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں لا حاضر کیا۔

۵۔۲۔۵۔ پہاڑوں اور پرندوں کا حضرت داوٗدؑ کے ساتھ ہم آواز ہونا

اسی طرح حضرت داوٗد علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم میں ہے کہ پہاڑ اور پرندے ان کے ہمراہ ہم آواز ہو کر اللہ کی تسبیح کرتے تھے:

> اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ O وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَۃً کُلٌّ لَّہٗٓ اَوَّابٌ[3]
>
> ہم نے پہاڑوں کو ان کے ساتھ مسخر کر دیا جو رات دن ان کے ساتھ مل کر اللہ کی تسبیح کرتے تھے نیز پرندے بھی ان کے ساتھ اکٹھے ہو جاتے تھے سب ان کی آواز میں آواز ملاتے تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہاڑ اور پرندے ویسے تو اللہ کی تسبیح کرتے ہی تھے جیسا کہ ہر چیز کا عمومی طور پر اللہ کی تسبیح کرنا مذکور ہو چکا ہے لیکن حضرت داوٗد ان کی تسبیح سنتے بھی تھے اور وہ صبح و شام لحنِ داوٗدی کے ساتھ ہم آواز ہو کر بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے تھے۔ اگر تسبیح کا مفہوم زبانِ حال میں تسبیح ہو تو پھر حضرت داوٗد کی کیا خصوصیت باقی رہ جاتی ہے۔

۵۔۲۔۶۔ آنحضرتؐ کے ہاتھوں پر کنکریوں کا تسبیح کرنا

انبیاء و اولیائے الٰہی کے بہت سے معجزات و کرامات بھی اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ رسول خاتمؐ کا بھی ایک معجزہ اس ضمن میں بہت شہرت رکھتا

---

[1] ۱۳۔ رعد: ۴۳

[2] ۳۔ آل عمران: ۷

[3] ۳۸۔ ص: ۱۸ و ۱۹

ہے کہ آپؐ کے ہاتھوں پر کنکریوں نے "کلمہ" پڑھا۔ استاد مطہری نے اس واقعے کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> شنیده اید که سنگریزه در کف مبارک پیغمبر اکرم تسبیح گفت۔ از جمله معجزات پیغمبر اکرم این بود که مشتی سنگریزه را به‌دست گرفتند و مردم دیدند سنگریزه‌ها در مشت پیغمبر تسبیح خدا می گویند۔ در اینجا معجزهٔ پیغمبر این نبود که سنگریزه را به تسبیح درآوردند، معجزهٔ پیغمبر این بود که گوش افراد را باز کردند و آنها صدای سنگریزه را شنیدند۔ آن سنگریزه همیشه تسبیح می گفت، معجزهٔ پیغمبر در شنواندن این صدا به آن گوشها بود نه در به صدا درآوردن آن سنگریزه‌ها[1]
>
> آپ نے سن رکھا ہے کہ سنگریزوں نے پیغمبر اکرمؐ کی ہتھیلی مبارک پر تسبیح پڑھی۔ پیغمبر اکرمؐ کے معجزات میں سے ایک یہ ہے کہ آپ نے کچھ سنگریزے اپنی مٹھی میں لیے اور لوگوں نے دیکھا کہ سنگریزوں نے آپ کے ہاتھ میں اللہ کی تسبیح پڑھی۔ اس مقام پر رسول اللہ کا معجزہ یہ نہ تھا کہ آپؐ نے سنگریزوں کو تسبیح پڑھوائی بلکہ آپ کا معجزہ یہ تھا کہ آپؐ نے لوگوں کے کان کھول دیے اور انھوں نے سنگریزوں کی تسبیح سنی۔ وہ سنگریزے تو ہمیشہ سے اللہ کی تسبیح کرتے تھے۔ رسول اکرم کا معجزہ یہ تھا کہ آپ نے وہ تسبیح لوگوں کو سنوائی۔

۵۔۲۔۷۔ فراق نبیؐ میں کھجور کے تنے کی گریہ وزاری

حدیث کی مختلف کتب میں مسجد نبوی میں لگے کھجور کے خشک تنے کا ایک ایمان افروز واقعہ نقل ہوا ہے۔ اس کے مطابق آنحضرتؐ جب مسجد میں خطبے کے لیے کھڑے ہوتے تو اس کے ساتھ

---

۱) آشنائی با قرآن (تفسیر سورۂ نور) ج ۴۔ مرتضیٰ مطہری انتشارات صدرا، چاپ اول، ۶۹ ۱۳ ھ ش، ص ۱۷۴ و ۱۷۵

ٹیک لگا لیا کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کو احساس ہوا کہ اس طرح کھڑا رہنے میں آپ کو زحمت ہوتی ہے۔ ایک صحابیؓ نے آپ کے لیے منبر تیار کرنے کی اجازت طلب کی۔ آپ کی اجازت کے بعد ایک تین درجوں والا منبر تیار کیا گیا۔ جب آنحضرتؐ پہلی مرتبہ خطبے کے لیے اس منبر پر تشریف لے گئے تو کھجور کے اس تنے نے گریہ وزاری شروع کر دی جس سے آپ ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کے یہ الفاظ اس سلسلے میں نقل کیے گئے ہیں:

> فصاحت النخلہ صیاح الصبی، ثم نزل النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فضمھا الیہ، تئن أنین الصبی الذی یسکن
>
> کھجور کے تنے نے بچوں کی طرح گریہ وزاری شروع کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر سے اتر کر اس کے پاس آ گئے اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس پر وہ تنا بچوں کی طرح سسکیاں لیتا خاموش ہو گیا۔[۱]

صحیح بخاری ہی میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ اور حضرت انس ابن مالکؓ سے یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

> فسمعنا لذالک الجذع صوتا کصوت العشار، حتی جاء النبیؐ فوضع یدہ علیھا فسکنت
>
> پس ہم نے اس پر اس تنے کے رونے کی آواز سنی، وہ یوں رویا جیسے کوئی اونٹنی اپنے بچے کی جدائی میں روتی ہے۔ اس پر نبی پاکؐ اتر کر اس کے پاس آئے اور اس پر اپنا ہاتھ رکھا تو اسے سکون آ گیا۔[۲]

کائنات کی اس مخفی حقیقت کے جلوے گاہے گاہے انبیاء کے علاوہ ان کے راستے کے راہیوں پر بھی بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم استاد مطہری ہی کے بیان کردہ دو واقعات

---

۱) بخاری، الصحیح، ۳: ۱۳۱۴، رقم: ۳۳۹۱، بیہقی، السنن الکبریٰ، ۳: ۱۹۵، رقم: ۵۳۸۹

۲) بخاری، الصحیح، ۳: ۱۳۱۴، کتاب المناقب، رقم: ۳۳۹۲، دارمی، السنن، ۱: ۳۰، رقم: ۳۴، بیہقی، السنن الکبریٰ، ۳: ۱۹۵، رقم: ۵۳۸۷، ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ۱: ۲۵۳، ابن جوزی، صفوۃ الصفوہ، ۹۸۱

نقل کرتے ہیں۔

۵۔۲۔۸۔شیخ عباس قمی کا واقعہ

شیخ عباس قمی مرحوم جو ایک نہایت متقی انسان تھے، نے قم میں اپنے ایک خطاب کے دوران میں منبر پر بیٹھے ایک واقعہ سنایا۔ میں نے یہ واقعہ خود ان کی زبانی تو نہیں سنا البتہ قم میں اس وقت دو مراجع تقلید موجود ہیں جو اس خطاب کے دوران موجود تھے، میں نے ان کی زبانی سنا ہے۔ ان میں سے ایک آیۃ اللہ گلپایگانی ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں ان کے منبر کے پاس بیٹھا تھا جب انھوں نے یہ واقعہ سنایا۔ انھوں نے بتایا کہ جوانی میں جب میں خوب اچھی حالت میں تھا، اب تو وہ حالت نہیں رہی، میں وادی السلام میں زیارت کے لیے گیا۔ ایک دم مجھے لگا کہ کہیں دور سے ایک خوفناک آواز آ رہی ہے۔ بالکل ایسے لگا جیسے کچھ لوگ کسی اونٹ کو داغ رہے ہیں اور وہ چیخ رہا ہے لیکن میں نے ہر طرف دیکھا مجھے کوئی اونٹ دکھائی نہ دیا لیکن چیخوں کی عجیب آواز آ رہی تھی۔ وادی السلام خالی تھی۔ اتنے میں، میں متوجہ ہوا کہ وادی السلام کے دوسری طرف چند افراد چل رہے ہیں۔ میں نے سوچا شاید یہ لوگ اونٹ کو داغ رہے ہیں۔ میں آہستہ آہستہ ان کی طرف چل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ آواز وہیں سے آ رہی ہے لیکن جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں کوئی اونٹ نہیں ہے بلکہ وہ لوگ ایک میت لے کر آئے ہیں اور اسے دفن کرنا چاہتے ہیں اور یہ آواز اسی میت کی ہے جسے میں اتنی شدت سے سن رہا ہوں لیکن وہ نہیں سن پا رہے۔ میں وادی السلام کی دوسری طرف اس آواز کو سن رہا تھا اور خیال کر رہا تھا کہ اونٹ کو داغا جا رہا ہے، اب میں اس جگہ آ پہنچا ہوں اور یہاں بھی وہ آواز سن رہا ہوں لیکن یہ لوگ نہیں سن رہے۔

۵۔۲۔۹۔مجلسی اول کا واقعہ

مرحوم [علامہ باقر] مجلسی جو معروف ہیں ان کے والد مجلسی اول جو خود بھی ایک جلیل القدر انسان، عالم، متقی اور غیر معمولی شخصیت تھے اور شیخ بہائی کے شاگردوں میں سے تھے، نقل کرتے ہیں کہ شیخ بہائی کی وفات سے چھ ماہ پہلے ایک روز ہم ان کے ہمراہ تخت فولاد اصفہان میں موجود ایک قبرستان میں اہل قبور کی زیارت کے لیے گئے۔ یہ وہی قبرستان ہے جس میں بابا رکن الدین کی

بھی قبر ہے، شاید اب بھی ہو۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ انھوں نے ہماری طرف رخ کر کے کہا: کیا تم نے کچھ نہیں سنا؟ میں نے کہا: نہیں۔ پھر وہ خاموش ہو گئے اور انھوں نے کوئی بات نہ کی۔ چلتے رہے اور واپس آ گئے۔ اس روز کے بعد ہم نے دیکھا کہ شیخ [بہائی] کی حالت منقلب ہو گئی ہے، وہ زیادہ تر اپنے ہی حال میں کھوئے رہتے ہیں، ان پر توبہ و انابت کی ایک کیفیت طاری ہو گئی ہے اور سابقہ حالت سے اب ان کی کچھ اور ہی حالت ہو گئی ہے۔ ہم سب طلبہ نے اندازہ لگایا کہ جو کچھ بھی ہے یہ اُسی روز پیش آیا ہے۔ مجلسی اول کہتے ہیں کہ دیگر طلبہ کی نسبت میں کچھ زیادہ جرأت والا تھا۔ طے پایا کہ میں ان سے پوچھوں گا کہ آپ کی حالت میں اس تبدیلی کا سبب کیا ہے۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ اس روز جب میں ایک قبر کے پاس سے گزر رہا تھا تو میں نے اس قبر سے یہ آواز سنی: ''شیخ! اپنی فکر کرو، تمھاری موت نزدیک ہے، کیوں ہوش میں نہیں آتے ہو'' شیخ اس واقعے کے چھ ماہ بعد فوت ہو گئے۔[۱]

۵۔۲۔۱۰۔ مولانا رومی کا نظریہ

راہ عرفان کے بعض جادہ پیماؤں نے اس نظریے کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کو ایسے افکار بیان کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

جملهٔ ذرات عالم در نهان
با تومی گویند روزان و شبان
ماسمیعیم و بصیریم و هشیم
باشما نا محرمان ما خا مشیم
چون شما سوی جمادی می روید
محرم جان خدادان کی شوید

کائنات کے تمام ذرات تم سے دن رات یہ کہتے ہیں کہ ہم سنتے ہیں،

---

۱) آشنائی با قرآن (تفسیر سورۂ نور) ج ۴۔ مرتضیٰ مطہری انتشارات صدرا، چاپ اول، ۱۳۶۹ھ ش، ص ۱۷۵ تا ۱۷۷

دیکھتے ہیں اور شعور رکھتے ہیں لیکن تم لوگ چونکہ ہم سے نامحرم ہو، اس لیے
ہم تمھارے لیے خاموش ہیں۔ تمھارا رُخ چونکہ جماد کی طرف ہے اس لیے
خدا کی معرفت رکھنے والی جان کے تم کیونکر محرم ہو سکتے ہو۔

ہماری اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز ایک خاص طرح کا شعور اور ایک خاص طرح کی حیات رکھتی ہے۔ مادی ذرائع علم کی اس شعور و حیات تک دسترس نہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس راز اور عالم غیب کی اس حقیقت سے ضرورت اور اپنی حکمت کے مطابق آگاہ فرما دیتا ہے۔ یہ شعور و حیات حیوانات، نباتات اور جمادات سمیت ہر چیز میں موجود ہے اور اسی لیے ہر چیز کا اللہ کی تسبیح کرنا، حقیقی تسبیح کا مفہوم رکھتا ہے۔

۵۔۲۔۱۱۔ نبیؐ پر درود

قرآن حکیم میں ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا[1]

یقیناً اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود بھیجو اور ان کے حضور سر تسلیم خم کر دو۔

''ملائکہ کی حقیقت'' ایک الگ موضوع ہے لیکن ہم صرف اتنا اشارہ کیے دیتے ہیں کہ بعض روایات کے مطابق کائنات کا کوئی مقام ایسا نہیں جہاں کوئی فرشتہ موجود نہ ہو۔ اگر ''تدبیر امور کائنات'' ملائکہ کے ذمہ ہے تو پھر ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

ملائکہ کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ کائنات اپنی وسعت کے باوجود ان کے لیے تنگ پڑ گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے یہ تمام فرشتے نبی کریمؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ فرشتوں کے درود بھیجنے کی کیفیت اور نوعیت کیا ہے اور فرشتوں کی انواع کیا ہیں، ہمیں اس کا تو علم نہیں لیکن اس امر میں کوئی شک نہیں کہ

[1]) ۳۳۔احزاب:۵۶

نبی کریمؐ پر درود اللہ کی تسبیح وتحمید ہی کا ایک مصداق ہے کیونکہ نبی پر ایمان توحید پر ایمان ہی کا نتیجہ ہے اور خالص توحید پورے وجود کے ساتھ اللہ کی تسبیح وتحمید کا ناگزیر تقاضا ہے۔ یہ موضوع اپنے مقام پر بہت وسیع ہے اس لیے یہاں اتنے ہی اشارے پر اکتفا کرتے ہیں۔ البتہ مندرجہ ذیل روایات پر نظر ڈالنے سے موجودات عالم میں نبی کریمؐ پر درود کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے:

۵۔۲۔۱۲۔ بے شمار فرشتے

امام صادقؑ نے فرمایا ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا ہے:

> اللہ کی مخلوقات میں سے کوئی موجود ایسا نہیں جس کی تعداد ملائکہ سے زیادہ ہو۔ ہر روز یا ہر رات ستر ہزار فرشتے زمین پر نازل ہوتے ہیں جو کعبہ کا طواف کرتے ہیں پھر میرے پاس اور پھر امیرالمومنینؑ کے پاس جاتے ہیں سلام کرتے ہیں، پھر حسینؑ کے پاس جاتے ہیں رات ان کے پاس رہتے ہیں یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ہے، پھر وہ ان کے لیے آسمان کی طرف ایک مقام مقرر کرتے ہیں جس کی طرف وہ چلے جاتے ہیں اور پھر کبھی زمین پر واپس نہیں آتے۔[1]

۵۔۲۔۱۳۔ ہر واقعے میں فرشتے دخیل ہیں

علامہ طباطبائی کا نظریہ ہے:

> قرآن واحادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی اہم یا غیر اہم حادثہ یا واقعہ ایسا نہیں کہ جس میں ایک یا چند فرشتے واقعے یا حادثے کی جہت یا جہات کے اعتبار سے دخالت نہ رکھتے ہوں اور ان پر موکل نہ ہوں۔[2]

۵۔۲۔۱۴۔ حروف والفاظ کا معاملہ

اس مرحلے میں داخل ہو کر ہم یہ سوال اٹھانا چاہتے ہیں کہ کیا حروف اور الفاظ جاندار ہیں یا

---

۱) تفسیر نور الثقلین، ج ۴، ص ۳۵۰، ح ۲۰ (سورہ فاطر کی آیت ۱ کے ذیل میں)

۲) تفسیر المیزان، ج ۱۷، ص ۱۲

بے جان؟ ظاہر ہے ہمارا سوال جاندار اور بے جان کے اس معنیٰ سے متعلق نہیں جو سائنس کا ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے۔

اس مقام پر ہم اتنا کہہ کر آگے بڑھتے ہیں کہ مادی کائنات کے اصول وقوانین اگرچہ غیر مادی کائنات پر محیط نہیں ہو سکتے لیکن کیا غیر مادی کائنات کے حقائق مادی کائنات کے قوانین میں تصرف کر سکتے ہیں؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب واضح نہ ہونے سے آراء کا ایسا معرکہ وجود میں آیا کہ ابھی تک طرفین میں فیصلہ نہیں ہو سکا۔ جسے اہل دین معجزہ کہتے ہیں، اس کی حقیقت کے بارے میں اختلافِ رائے کی اصل بنیاد یہی سوال ہے۔ معجزات کے ظواہر کو اسی طرح مان لیا جائے جس طرح قرآن حکیم جیسی غیر متبدل کتاب نے بیان کیا ہے تو مذکورہ سوال کا جواب ''ہاں'' میں دیے بغیر چارہ نہیں۔

شعور، ارادے اور حیات کے اس تصور کو قبول کر لینے کے بعد ہم یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا حروف اور الفاظ بھی جان رکھتے ہیں یا بے جان ہیں؟

سطور بالا میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن حکیم کے مطابق کائنات کی ہر شے اللہ کی تسبیح وتحمید کرتی ہے اور یہ تسبیح وتحمید حقیقی ہے۔ زبان حال سے ہی نہیں زبان قال سے بھی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حروف والفاظ ''شے'' کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں۔ اگر آتے ہیں تو پھر یہ بھی اللہ کی حمد وثنا کرتے ہیں، یہ بھی ارادہ وشعور رکھتے ہیں اور ارادہ وشعور کے ساتھ اللہ کی حمد وثنا کرتے ہیں اور اسی معنیٰ میں زندہ ہیں جس معنیٰ میں دیگر جمادات زندہ ہیں۔

مزید وضاحت کے لیے ہم عرض کرتے ہیں کہ کیا ایٹم (Atom) کو ہم ''شے'' کی تعریف میں شمار کرتے ہیں اور اسی طرح ایٹم سے چھوٹے ذرات جن سے ایٹم بنا ہے یعنی الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران؟ اگر یہ سب موجود اور شی کی تعریف کا مصداق ہیں تو پھر حروف والفاظ بھی شی ہیں اور وجود رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم فرماتا ہے:

اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ [1]

---

[1] ۱۷۔ بنی اسرائیل: ۴۴

کوئی شے ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح کے ساتھ اس کی حمد نہ کرتی ہو۔

اس موضوع کی وضاحت کے لیے ہم چند دیگر امور پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔

احادیث اسلامی کی کتب میں ایسی بہت سی روایات آئی ہیں جن میں حروف اور الفاظ کی حیرتناک تاثیر کا ذکر موجود ہے۔ اس سلسلے میں بعض تحیر انگیز واقعات بھی بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند امور کا مختصر ذکر کرتے ہیں:

۵۔۲۔۱۵۔ سورہ الحمد کے ذریعے شفا

شیعہ اور سنی معتبر کتب میں سورہ الحمد کے فضائل کے حوالے سے منقول ایسی بہت سی روایات ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ سورہ الحمد شفا کا ذریعہ ہے۔ اس سلسلے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول مندرجہ ذیل فرمودات ملاحظہ فرمائیں:

وفی کتاب محمد بن مسعود العیاشی باسنادہ ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال لجابر بن عبداللہ الانصاری یا جابر الااعلمک افضل سورۃ انزلھا اللہ فی کتابہ قال فقال لہ جابر بلی بابی انت و أمی یا رسول اللہ علّمنیھا قال فعلّمہ الحمد أمّ الکتاب ثم قال یا جابر الااخبرک عنھا قال بلی بابی أنت و أمی فاخبرنی فقال ھی شفاء من کل دآء الاالسام والسام الموت

محمد بن مسعود العیاشی نے اپنی کتاب میں اپنی اسناد کے ساتھ لکھا ہے کہ نبی ﷺ نے جابر بن عبداللہ انصاری سے کہا: اللہ نے اپنی کتاب میں سب سے افضل جو سورت نازل کی ہے کیا میں وہ تمھیں سکھاؤں؟

جابر نے کہا: جی ہاں یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، مجھے وہ ضرور سکھائیں۔

اس پر آپؐ نے انھیں سورۃ الحمد ام الکتاب کی تعلیم دی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: اے جابر کیا اس کے بارے میں میں تمھیں کچھ خبر دوں؟

جابر نے کہا: جی ہاں، میرے ماں باپ آپ پر قربان، مجھے اس کے بارے میں خبر دیں۔

اس پر آپ نے فرمایا: یہ سورت ہر بیماری کے لیے شفا ہے سوائے "سام" کے اور سام موت ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی بھی ایک روایت ملاحظہ فرمائیں:

وعن سلمة بن محرز عن جعفر بن محمد الصادق (ع): قال من لم يبرءه الحمد لم يبرءه شيء[1]

سلمہ بن محرز سے روایت ہے کہ امام جعفر بن محمد الصادق نے فرمایا:
جسے الحمد کے ذریعے نجات نہ ملے اسے کسی اور چیز سے نجات نہیں مل سکتی۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابوسعید الخدری﷜ کی ایک روایت صحیح بخاری سے نقل کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

قال البخاری فی فضائل القرآن حدثنا محمد بن المثنی حدثنا وهب حدثنا هشام عن محمد بن سعيد عن ابی سعيد الخدری قال كنا فی مسير لنا فنزلنا فجاءت جارية فقالت ان سيد الحی سليم وان نفرنا غيب فهل منكم راق؟ فقام معها رجل ما كنا نأبنه برقية فرقاه فبرأ فأمر له بثلاثين شاة و سقانا لبنا فلما رجع قلنا له أكنت تحسن رقية أو كنت ترقی؟ قال لا مارقيت الا بأم الكتاب قلنا لا تحدثوا شيئا حتی نأتی و نسأل رسول الله صلى الله عليه و آله و سلم فلما قدمنا المدينة ذكرناه للنبی صلى الله عليه و آله و سلم فقال "وما كان يدريه أنها رقية اقسموا و اضربوا لی بسهم"[2]

---

۱) طبرسی: مجمع البیان فی تفسیر القرآن (تہران، ایران، انتشارات ناصر خسرو، ۱۳۶۵ھ ش) ج ۱، ص ۸۸

۲) ص ۱۳

فضائل القرآن میں بخاری کہتے ہیں۔۔۔حضرت ابی سعید خدری سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم کہیں جا رہے تھے۔ایک منزل پر ٹھہرے تو ایک کنیز ہمارے پاس آئی اور کہنے لگی کہ ہمارے قبیلے کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا ہے اور ہمارے لوگ یہاں موجود نہیں۔آپ میں کوئی ایسا ہے جو جھاڑ پھونک کر سکے؟ ہم میں سے ایک شخص اٹھا اور ساتھ چل دیا۔اُس نے وہاں جا کر کچھ دم کر کے پھونکا تو وہ ٹھیک ہو گیا۔اس نے تیس بکریاں دیں اور بہت سا دودھ بھی ہماری مہمانی کے لیے بھیجا۔جب وہ واپس آیا تو ہم نے پوچھا: کیا تجھے جھاڑ پھونک کا کچھ علم تھا؟ اُس نے کہا میں نے تو صرف ام الکتاب (سورۃ الفاتحہ) پڑھ کر دم کیا ہے ہم نے کہا اس آئے ہوئے مال کو ابھی ہم نہیں چھیڑتے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچتے ہیں اور آپ سے اس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔جب ہم مدینہ پہنچے تو ہم نے یہ واقعہ آنحضرتؐ سے بیان کیا۔آپؐ نے فرمایا: اسے کیسے معلوم ہوا کہ یہ پڑھ کر دم کرنے کی سورت ہے۔(مزید فرمایا کہ) اس مال کے حصے کر لو ایک حصہ میرا بھی الگ کر لو۔

۵-۲-۱۶- دعاؤں کی تاثیر

دعاؤں کی تاثیر پر عموماً اہل دین کا عقیدہ ہے۔دعاؤں کے اثرات بندگانِ خدا کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔انبیاء کی مناجات اور دعاؤں کا بہت بڑا ذخیرہ مذہبی کتب میں محفوظ چلا آ رہا ہے۔قرآن حکیم میں جہاں دعا کرنے کی ترغیب دی گئی ہے وہاں انبیاء کرام کی بہت سی دعائیں بیان بھی کی گئی ہیں۔مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر دعا کی اہمیت کے قائل ہیں اور شب و روز منقول و ماثور دعائیں دہراتے رہتے ہیں۔دعا کسی خاص زبان کی بھی محتاج نہیں۔اللہ کے بندے اپنی زبان میں طرح طرح سے اپنے رب کو پکارتے رہتے ہیں۔بعض مشکل حالات اور بعض احتیاجات کے رفع کے لیے خاص طرح کی نمازیں اور دعائیں مسلمانوں کے ہاں منقول اور رائج ہیں۔طلب

باراں کے لیے نماز استسقاء انہی میں سے ایک ہے۔ نماز استسقاء دراصل دعا ہی کی ایک شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعا کی رغبت دلاتے ہوئے نہایت دل آویز پیرائے میں دعاؤں کی قبولیت کی بھی نوید سنائی ہے۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ [1]

اور جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو یقیناً میں قریب ہی ہوں پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں پس انھیں چاہیے کہ وہ مجھے پکاریں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ راہ پا جائیں۔

علامہ علی رضا فراہانی نے ''الادعیۃ الماثورۃ المشترکۃ'' کے عنوان سے ایک پوری کتاب مرتب کی ہے جو ادارہ تقریب بین المذاہب الاسلامیہ نے ''سلسلۃ الاحادیث المشترکۃ'' کی ایک جلد کے طور پر شائع کی ہے۔

۵۔۲۔۱۷۔قرآن شفاعت کرے گا

اسلامی متون میں ایسی بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جن کے مطابق قیامت کے دن قرآن حکیم اپنے قاریوں اور اپنے پیروکاروں کی شفاعت کرے گا۔ حضرت علیؑ نے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا:

وَاعْلَمُوا انہ شافع مشفع وقائل مصدق وانہ من شفع لہ القرآن یوم القیامۃ شفع [2]

جان لو کہ قرآن ایسا شفاعت کرنے والا ہے جس کی شفاعت قبول کی جائے گی اور وہ ایسا بات کرنے والا ہے جس کی تصدیق کی جائے گی اور یہ کہ

---

۱) ۲۔البقرہ:۱۸۶

۲) نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۷۶

قیامت کے دن قرآن جس کے حق میں شفاعت کرے گا وہ قبول ہوگی۔

مسند احمد بن حنبل اور مشکوۃ شریف میں نبی کریمؐ سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے:

الصیام والقرآن یشفعان للعبد۔ یقول الصیام: ای رب منعته الطعام والشهوات بالنهار فشفعني فيه۔ ويقول القرآن۔ منعته النوم بالليل فشفعني فيه فيشفعان [1]

روز قیامت روزہ اور قرآن بندے کی شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا کہ اے میرے رب! میں نے اسے دن کو کھانے اور لذات سے روکا پس میں اس کی شفاعت کرتا ہوں، جب کہ قرآن کہے گا کہ میں نے اسے رات کی نیند سے روکا پس میں اس کی شفاعت کرتا ہوں پس ان دونوں کی شفاعت قبول کر لی جائے گی۔

بعض خاص سورتوں اور آیتوں کا شفاعت کرنا بھی احادیث نبویؐ میں منقول ہوا ہے۔

ان تمام احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم بظاہر قرآن کو اس کے الفاظ کے ذریعے سے پہچانتے ہیں لیکن حقیقت قرآن ایک زندہ وجود سے عبارت ہے بلکہ اس کی آیات بھی زندہ وجود رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف سورتیں اور آیات بھی مومنین کی شفاعت کریں گی اور قرآن کی کسی آیت کی شفاعت پروردگار کے ہاں مسترد نہیں ہوگی۔ قرآن اور اس کی آیات وحروف کے زندہ وجود ہونے پر ان احادیث کی گواہی زیر بحث موضوع کی حقیقت تک پہنچنے میں ہماری مددگار ہو سکتی ہے۔

۵۔۲۔۱۸۔ پانی پر الفاظ کے اثرات، سائنسی نقطہ نظر

پانی پر الفاظ کے اثرات کے بارے میں مختلف سائنسدانوں کی تحقیقات کا سلسلہ 1990 کی دھائی سے زیادہ دقت نظر سے شروع ہوا۔ اس سلسلے میں جاپانی سائنس دان ڈاکٹر مشاروا یموتو کی تحقیقات کو دنیا میں خاص طور پر توجہ حاصل ہوئی بعد از اں مختلف سائنسدانوں نے ان کے نتائج تحقیق کا ناقدانا جائزہ بھی لیا جنھوں نے ڈاکٹر مشاروا یموتو کے بنیادی نظریات کی تائید کی

[1] مشکوۃ ۱۷۳

جس کے مطابق الفاظ، حروف، فکر، تحریر اور آواز وغیرہ کے پانی پر ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ جنھیں سائنسی آلات کے ذریعے زیر مطالعہ لایا جاسکتا ہے۔

ہماری دینی اور مذہبی دنیا میں تو یہ بات کوئی نئی نہیں ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ تاہم عالم محسوسات کے مطالعات بھی اب اس امر کی اصولی تائید کرنے لگے ہیں۔ ہم ڈاکٹر مشارو ایموتو کی تحقیقات کے بعض حصوں کا مختصر ذکر اپنے ایک محقق عزیز سید زکی عباس کے ایک تحقیقی مضمون ''پانی میں پنہاں پیغامات'' سے ماخوذ کر کے کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مشارو نے پانی کو برف بنانے اور تصاویر لینے کے دوران یہ دریافت کیا کہ خاص سوچوں اور خیالات کا پانی میں بالواسطہ اثر ہوتا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ صاف ندی نالوں کا پانی یا وہ پانی جس کے سامنے پیار بھرے الفاظ رکھے جائیں خوبصورت، شاندار اور پیچیدہ کرسٹلز کی شکل بناتا ہے۔ جبکہ گدلا پانی اور وہ پانی کا نمونہ جس کے سامنے منفی الفاظ یا جذبات رکھے جائیں نامکمل اور بے ترتیب کرسٹلز بناتا ہے۔

ڈاکٹر ایموتو کے مطابق انھوں نے اپنے یورپ میں سفر کے دوران پانی کے نمونوں کے سامنے ''شکریہ'' اور ''تم بیوقوف'' جیسے الفاظ جرمن زبان میں لکھ کر رکھے۔ جو لوگ ان نمونوں کی تصاویر بنا رہے تھے وہ جرمن میں ''تم بیوقوف'' جیسے الفاظ سے قطعی نابلد تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف مواقع پر ان دونوں الفاظ سے ایک جیسے پانی کے کرسٹل کے نمونے حاصل کیے تھے۔ گویا پانی پر بالواسطہ الفاظ کا اثر ہوتا ہے۔

اپنے تجربات کے دوران مشارو ایموتو نے ایک تجربہ یہ بھی کیا کہ پانی پر فاصلے کے اثرات ہوتے ہیں یا نہیں۔ مگر ان کے تجربات کی رو سے پانی پر نیک ارادوں اور دعاؤں کے نیک اور اچھے اثرات ہوتے ہیں ان کا فاصلے سے کوئی تعلق نہیں۔ ڈاکٹر مشارو کے مطابق:

فاصلے سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ اگر فرق پڑے گا تو دعا کرنے والوں کی نیک نیتی سے۔

مشارو کے کئی تجربات میں سے ایک تجربہ یہ بھی تھا کہ سترہ لوگوں کا ایک گروہ جنھوں نے پانی کے نمونے کے گرد دائرہ بنا رکھا تھا، نے اپنی اپنی مرضی کے خوبصورت الفاظ ادا کیے جیسے اتحاد،

پیار اور دوستی۔ مشارو نے اس تجربے کے بعد پانی کے کرسٹلز کی جب تصاویر لیں تو وہ خوبصورت کرسٹلز تھے۔

ڈاکٹر ایموتو کی کتاب ''پانی سے پیغام'' (The Message from Water) پڑھ کر مختلف لوگوں نے پانی کی بوتلوں پر مثبت الفاظ جیسے ''پیار'' لکھ کر اپنے پودوں اور پھولوں کو پانی دیا۔ اس طرح کرنے سے پھول زیادہ دیر تک تروتازہ رہے اور باغوں میں پودے زیادہ صحت مند دکھائی دیے۔

ڈاکٹر ایموتو نے تجربہ کیا کہ پانی کا وہ نمونہ جس کے چھوٹے چھوٹے کلسٹر بنتے ہیں وہ صاف پانی ہوتا ہے اور اس پر الفاظ کے اثرات بھی دیر پا ہوتے ہیں جبکہ عام پانی کے کلسٹر میں خلا پیدا ہوجاتا ہے جس میں چھوٹے چھوٹے خلیے گھس جاتے ہیں اور پانی کے اوپر ہونے والے الفاظ کے اثرات کو متاثر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ایموتو کے خیال میں زبان کو قدرت نے بنایا ہے یہی وجہ ہے کہ منہ سے ادا کیے گئے الفاظ اور لکھے گئے الفاظ کا ایک خاص ارتعاش ہوتا ہے جو پانی پر اثر انداز ہوتا ہے۔۔۔

انھوں نے پہلے پہل حروف تہجی کی آوازوں سے تجربات کا آغاز کیا اور اس کے بعد پیار (Love) جیسے الفاظ نے جگہ لے لی جس سے پانی کے نمونے کے قدرتی، شفاف اور چھ کونی کرسٹل بنے۔ اس بابت ایموتو کا کہنا ہے کہ وہ تمام چیزیں جو قدرتی نہیں ہیں یا ان میں منفی ارتعاش پایا جاتا ہے وہ چھ کونی یا مسدس کی شکل کے کرسٹل نہیں بنا سکتیں۔ چنانچہ جب ہم مصنوعی چیزوں کی جانب دیکھتے ہیں یا ان چیزوں کی طرف نگاہ کرتے ہیں جو قدرتی طور پر نہیں پائی جاتیں ان میں سے بہت سی چھ کونی (Hexagonal) شکل میں نہیں ہوتیں۔ اس کی وجہ منفی ارتعاش کے سوا کوئی نہیں ہوسکتی۔

یہی اصول اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ برے اور منفی الفاظ قدرت سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ مثلاً جن علاقوں میں منفی جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے اور منفی زبان کا استعمال عام ہوتا ہے وہاں جرائم کی شرح بھی زیادہ ہوتی ہے۔ مگر یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہر زبان دوسری زبان سے مختلف ہوتی ہے اور مختلف اثرات پیدا کرتی ہے یعنی امریکی اور جاپانی زبانیں ایک دوسرے

سے یکسر مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایموتو نے اریگاٹو (arigato) اور تھینک یو (Thank You) کے الفاظ کو پانی کے دو مختلف نمونوں کے سامنے دہرایا تو مختلف کرسٹلز بنے۔

ڈاکٹر ایموتو نے پانی پر تحقیق کرتے ہوئے روحانیت کے پہلو کو بھی مدنظر رکھا ان کے بقول حضرت آدمؑ اور اماں حواؑ کی طرح پانی کو بھی اللہ تعالیٰ کی آگہی تھی اور پانی کو اللہ کے اس ارادے کا بھی پتہ تھا کہ دنیا اور قدرت کی تخلیق میں پانی بنیادی عنصر ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں خدا کی تمام مخلوق کا عکس پانی میں نظر آسکے گا۔ جب اللہ عزوجل نے دنیا میں اماں حوا اور بابا آدم کو اتارا تا کہ وہ زمین کو آباد کر سکیں اور اس کا خیال رکھیں اس وقت سے پانی ایک خالی شیشے کی مانند ہوگیا جو انسانوں کے احساسات اور سوچوں کو منعکس کرنے لگا اور ایک ایسے آلہ کا کام کرنے لگا جو طاقت اور معلومات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکے۔[1]

۵۔۲۔۱۹۔ الفاظ وکلمات کی تاثیر، متون اسلامی سے چند مزید اشارات

الفاظ وکلمات ''بے جان'' نہیں ہوتے بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاثیر مرتب کرتے ہیں اس سلسلے میں ہم قرآن وحدیث سے چند مزید پہلو غور وفکر کے لیے پیش کرتے ہیں:

پاک کلمات عروج پاتے ہیں: پاک وطیب کلمات اللہ تعالیٰ کی طرف صعود وعروج پاتے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کی یہ آیہ مجیدہ ملاحظہ فرمائیں:

اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ[2]

پاک کلمات اس کی طرف بلند ہوتے ہیں اور نیک عمل انھیں رفعت دیتا ہے۔

ظاہر ہے یہ صعود ورفعت حقیقی معنی میں ہے۔ البتہ خود اس روحانی صعود ورفعت کی حقیقت کا موضوع الگ سے بحث طلب ہے۔ اس کے برعکس گندے کلمات اور برے عمل تنزل پاتے ہیں۔

---

[1] مقالہ نگار نے ان مطالب کو ان ویب سائٹس سے حاصل کیا ہے۔

http://www.watchthebleep.com/crystals

http://www.adhikara.com/water.html

[2] ۳۵۔ فاطر: ۱۰

کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ: کلمہ طیبہ کی حقیقت قرآن حکیم نے یوں بیان کی ہے:

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ [۱]

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح سے مثال بیان کرتا ہے کہ پاک کلمہ یوں ہے جیسے پاک درخت ہو جس کی جڑ ثابت اور مضبوط ہے اور جس کی شاخ آسمان تک پہنچی ہوئی ہے۔

اسی طرح کلمہ خبیثہ کے بارے میں قرآن حکیم بیان فرماتا ہے:

وَ مَثَلُ کَلِمَۃٍ خَبِیْثَۃٍ کَشَجَرَۃٍ خَبِیْثَۃِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَھَا مِنْ قَرَارٍ [۲]

اور ناپاک کلمہ یوں ہے جیسے ناپاک درخت ہو جس کی جڑ زمین کے اوپر ہی ہو اور جسے اکھاڑ لیا جائے اور اس کے لیے کوئی پائیداری نہ ہو۔

ہم اگر غور و فکر کریں تو اس دنیا میں بھی اچھی باتوں کے اچھے نتائج مرتب ہوتے ہیں اور بری باتوں کے برے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ آخرت میں بھی ایسے ہی نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بہشت کے باغات، پھل اور پھول دراصل انسان کی اچھی باتوں اور اچھے عملوں کا نتیجہ ہیں۔ حوریں بھی اچھی صحبتیں اختیار کرنے، اچھی مجلسیں اپنانے، اچھے ساتھی انتخاب کرنے اور اچھے انسانوں سے دوستی و محبت کا رشتہ استوار کرنے کا نتیجہ ہوں گی۔ اس کے برعکس جہنم بھی انسان اپنے کلماتِ خبیثہ اور اعمال سیئہ کے ذریعے بنا رہا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کی متعلقہ آیات کا کچھ گہری نظر سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

۵۔۲۔۲۰۔ غیبت کے اثرات

قرآن حکیم میں غیبت کرنے کا عجیب و غریب اثر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

---

۱) ۱۴۔ ابراہیم: ۲۴

۲) ۱۴۔ ابراہیم: ۲۶

وَلاَ يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ[1]

تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے پس تم اسے ناپسند کرتے ہو۔

غیبت کی حرمت پر متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں:

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے کہ سخت بدبو پھیلی تو آپ نے فرمایا: تم جانتے ہو یہ کیسی بدبو ہے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں''۔[2]

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت صفیہؓ کی کوتاہ قامتی کا تذکرہ کیا جس پر آپؐ نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

لقد قلت کلمة لو مزجت بماء البحر لمزجته [3]

تم نے ایسی بات کہی ہے کہ اگر اس کو سمندر کے پانی میں ملا دیا جائے تو سمندر کا پانی متغیر ہو جائے۔

۵۔۲۔۲۱۔حاصل کلام

یہ تمام مطالب جو سطور بالا میں پیش کیے گئے ہیں ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتے ہیں کہ الفاظ و حروف بے جان نہیں ہیں لیکن ان کا جاندار ہونا حواس خمسہ سے متعلق دنیا کے اعتبار سے بہت کم سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہ عالم روح و معنی سے متعلق امر ہے۔ عبارات، الفاظ اور حروف نہ فقط ایک خاص معنی میں زندہ ہیں اور شعور رکھتے ہیں بلکہ انھیں بروئے کار لانے والوں کے ارادے اور فکر کے

---

[1] ۴۹۔حجرات:۱۲

[2] مسند احمد، ۳/۳۵۱

[3] ابوداؤد

مطابق اثرات بھی مرتب کرتے ہیں۔ قرآن حکیم جیسی بے مثل آسمانی کتاب کے جملات، الفاظ اور حروف کے اپنے اثرات اور تاثیرات ہیں۔ انسانوں اور دیگر مخلوقات کے الفاظ وحروف کے اپنے اثرات ہیں۔ یہ نظریہ ہر انسان کے لیے سبق آموز بھی ہے۔ جب الفاظ وجملات پانی پر اثرات مرتب کرتے ہیں تو ہمارے اپنے ماحول اور اپنے وجود پر بھی ان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہمیں ایسی محفلوں سے بھی پرہیز کرنے کی ضرورت ہے جہاں گندی اور بری باتیں ہوتی ہیں۔ ہمیں ایسی مجالس میں بیٹھنا چاہیے جہاں اچھی باتیں ہوتی ہوں۔ وہ انسان جو ہمیشہ ذکر الٰہی میں محو رہتے ہیں اور جن کی زبان سے ہمیشہ پاک کلمات جاری ہوتے ہیں ان کے لیے قرآن حکیم میں نوید دی گئی ہے کہ پاک کلمات بلندی کی طرف جاتے ہیں۔ یہ پاک کلمات اور پاک ماحول کی روح پر تاثیر انسان کو بلند مرتبہ حقائق سے بھی آشنا کرتی ہے۔ جنت کا ماحول پاک انسانوں کی پاک باتوں، پاک تحریروں اور پاک نیتوں ہی کی بدولت پاک ہوتا ہے۔ اپنے لیے انسان جنت وجہنم خود بنا رہا ہوتا ہے اور اس میں الفاظ وحروف اپنا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ آج بحر و بر جو فساد اور برائی سے بھر گیا ہے کیا اس میں انسانوں کی نیتوں، ان کی تحریروں، تقریروں، فلموں، ڈراموں، بریکنگ نیوز، اشتہاروں اور خبرناموں کا کوئی عمل دخل نہیں؟ نہیں ان سب کا نتیجہ ہے جو ہم اپنے گردو پیش میں دیکھ رہے ہیں۔ اگر پانی کے ایک گلاس پر اچھے لفظ کا اچھا اثر ہوتا ہے اور برے الفاظ کا برا اثر بھی ہوتا ہے تو پوری دنیا پر ان حروف والفاظ کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے بزرگ پانی پر آیات قرآنی کے دم کی تاثیر سے بہت پہلے سے آگاہ تھے۔ وہ کاغذ پر اسمائے الٰہی یا آیات قرآنی لکھ کر دیتے اور اسے پانی میں تعویذ کے طور پر ڈال کر پینے کی تلقین کرتے تو وہ الفاظ وحروف کی تاثیر سے آگاہ تھے۔ بے جان حروف والفاظ جان انسانی پر کیسے اثر ڈال سکتے ہیں؟

۵۔۳۔نماز: فقہی، فلسفی اور عرفانی

۵۔۳۔۱۔خلاصہ

نماز مومن کی معراج ہے، اس عبادت کے مختلف پہلو ہیں۔ اس کے بارے میں علماء نے بہت کچھ کہا، فقہا نے اس کی فقہی باریکیوں کو بیان کیا تو فلاسفہ نے اس کے فلسفی پہلوؤں سے پردہ کشائی کی۔ عرفا اس عبادت کے عرفانی پہلوؤں کی جانب متوجہ کرتے رہے۔ مقصد سبھی کا یہی تھا کہ نماز کے بارے میں زیادہ سے زیادہ شعور و آگہی حاصل ہو، تا کہ انسان اپنے رب کے حضور آگاہی اور ادراک کے ساتھ حاضر ہو۔ زیر نظر مقالے میں ان تینوں پہلوؤں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۵۔۳۔۲۔نماز کی اہمیت

نماز کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے بات ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے ہاں فقہ کے باب الصلوۃ کی بڑی اہمیت ہے۔ نماز کے مختلف پہلوؤں پر فقہا کے فتاویٰ اور آرا موجود ہیں۔ نماز کے مقدمات پر بھی طویل فقہی بحثیں کی جا چکی ہیں اور کی جاتی رہتی ہیں۔ اسی طرح فلسفۂ نماز پر بھی بے شمار کتب شائع ہو چکی ہیں۔ یہاں فلسفے سے مراد وہ فلسفہ نہیں ہے جسے ہم الہیات یا علم فلسفہ کے تحت مطالعہ کرتے ہیں بلکہ یہاں فلسفۂ نماز سے مراد نماز کے مقاصد ہیں۔ نماز کے اخلاقی پہلو بھی عام طور پر اس کے مقاصد میں بیان کیے جاتے ہیں۔ نماز کے معاشرتی و جسمانی پہلو بھی اپنے مقام پر بیان ہوتے ہیں۔ البتہ ایک گروہ ایسا ہے جس کے نزدیک نماز کی حقیقت اس کے عرفانی پہلو میں پوشیدہ ہے اور اس کے نزدیک اصل نماز نمازِ عرفانی ہی ہے۔

مذکورہ بالا تمام موضوعات میں سے سب سے زیادہ نماز کے فقہی پہلو پر بات کی گئی ہے اور

سب سے کم نماز کے عرفانی پہلو پر لکھا اور کہا گیا ہے۔ نماز کے فقہی پہلو کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ نماز کا خارجی ڈھانچہ اور ظاہری شکل وصورت اسی پر استوار ہے۔ نماز کے مقدمات میں نجاسات وطہارات کا موضوع بھی بہت اہم ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ نماز کے لیے ضروری ہے کہ انسان کا بدن پاک ہو، لباس پاک ہو، نماز کی جگہ پاک ہو یا کم ازکم جس جگہ انسان سجدہ کرتا ہے، وہ جگہ پاک ہو۔ اس حوالے سے مختلف فقہا کے اقوال اپنے دلائل کے ساتھ موجود ہیں۔ اسی طرح لباس اور جگہ وغیرہ کا غصبی نہ ہونا بھی فقہی احکام میں بیان کیا جاتا ہے۔ طہارت اور وضو کے لیے استعمال کیا جانے والا پانی بھی غصبی نہیں ہونا چاہیے اور اس پانی کا پاک ہونا بھی ضروری ہے۔ خود نماز کے لیے گاہے غسل مقدمے کی حیثیت رکھتا ہے اور وضو تو بہر حال مقدمۂ نماز ہے۔

۵۔۳۔۳۔ قرآن اور نماز کے فقہی احکام

نماز کے بعض فقہی احکام کا مجمل ذکر قرآن کریم میں بھی موجود ہے اور بے شمار احادیث و روایات نماز کے احکام کو بیان کرتی ہیں جنھیں سامنے رکھ کر فقہا نماز کے احکام کی وضاحت کرتے ہیں۔ قیام، رکوع اور سجدے کا ذکر قرآن حکیم میں نماز کے ساتھ مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ نماز کو اس کے اوقات میں ادا کرنے کے حوالے سے بھی قرآن کریم میں ایک آیت موجود ہے۔ اسی طرح نماز کے لیے قبلہ رخ ہونے کا ذکر بھی قرآن حکیم میں آیا ہے۔ بعض آیات میں نمازوں کے اوقات اور ناموں کا بھی ذکر ہے اگرچہ رائج تمام نمازوں کے الگ الگ سے نام نہیں ہیں۔ نماز جمعہ کا ذکر بھی سورہ جمعہ میں موجود ہے۔ وضو، غسل اور تیمم کا حکم بھی قرآن پاک میں آیا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ نماز کے فقہی احکام کی بنیادیں خود قرآن نے فراہم کی ہیں اور سنت نے ان کی تکمیل کر دی ہے۔

۵۔۳۔۴۔ نماز کی شکل اور مسلمانوں کا تعامل

بعض دانشوروں کی رائے ہے کہ امت کے صدیوں سے مسلسل تعامل نے نماز کی مشترکہ ہیئت اور نماز کے دیگر پہلوؤں کو باقی رکھا ہے اور اس وقت مختلف مسالک میں رائج نماز کی ہیئت کے مشترکات ہی نماز کی اصل کو بیان کرنے کے لیے کافی ہیں اور اختلافی امور ان کے نزدیک نماز

کے حوالے سے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ موضوع کچھ تفصیل طلب ہے جس کی پیش نظر مضمون میں گنجائش نہیں۔

۵۔۳۔۵۔شکل وصورت کا صحیح ہونا

فقہی احکام میں سب سے اہم نماز ہی کو سمجھا جاتا ہے۔لہٰذا نماز سے متعلق ابواب نسبتاً زیادہ تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔نماز کی قبولیت اور صحت کے حوالے سے فقہی احکام کو کچھ اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ بیشتر مسلمانوں کی نماز میں توجہ، اس کی شکل صورت اور الفاظ کی ادائیگی پر مرکوز رہتی ہے۔رکعتوں، رکوع اور سجدے کی تعداد کے علاوہ نماز میں پڑھی جانے والی عبارتوں پر بھی نماز کے دوران میں توجہ رکھی جاتی ہے؟ کچھ اس طرح سے کہ اگر اس پہلو سے کوئی ایسی کمی بیشی ہو جائے جو فقہا کے نزدیک باعث بطلان نماز ہے تو پھر مکلف کو نئے سرے سے نماز ادا کرنا پڑتی ہے۔ایک عام مسلمان جب فقہی احکام کی روشنی میں نماز صحیح طور پر ادا کرلے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے نماز ادا کر لی ہے اور اگر فقہی طور پر اس نے نماز صحیح ادا نہیں کی تو اس کے دل میں کھٹکا رہتا ہے کہ گویا اس کی نماز ادا ہی نہیں ہوئی۔

۵۔۳۔٦۔اصل مقصد قربت الٰہی ہے

ہمیں تسلیم ہے کہ نماز کی ظاہری شکل وصورت بہت اہمیت رکھتی ہے اور اسے صحیح طور پر ادا کرنا چاہیے اور تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے فقہا کے فتووں کو سامنے رکھ کر نماز کو اس کی شرائط کے ساتھ ادا کریں لیکن نماز جو اللہ کی قربت کے لیے ہے اور جس کا مقصد بندے کو خدا سے ملانا ہے، جس نماز کو رسول اللہ (ص) نے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے، جس نماز کو آپ (ص) نے مومن کی معراج بتایا ہے اور اسی طرح جس نماز کو قرآن فحشا اور منکر سے بچنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے کیا وہ فقہی طور پر درست ادا کرنے سے ادا ہو جاتی ہے؟ یہی وہ سوالات ہیں جنھوں نے علماء، صالحین اور عرفا کو نماز کے مقاصد اور اس کے عرفانی پہلوؤں کو بیان کرنے پر ابھارا ہے۔

نماز کے مقاصد سے غفلت سے نماز کی شکل وصورت تو بن جاتی ہے لیکن یقینی طور پر وہ ایک بے روح نماز ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ جس قرآن وسنت نے نماز کے فقہی احکام بیان کیے ہیں

اسی قرآن وسنت نے نماز کے مقاصد اور اس کے عرفانی پہلوؤں کو بھی گاہے مجمل طور پر اور گاہے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نماز کی شکل وصورت اگر صحیح ہو تو وہ نماز مقبول بھی ٹھہرے گی، باعث اجر بھی ہو گی اور اللہ کے ہاں قربت کا ذریعہ بھی بنے گی۔ ان تمام لوگوں کو نماز کے حوالے سے اس سوچ اور ذہنی کیفیت سے نکلنا ہو گا جو نماز کو فقہی احکام کی روشنی میں صحیح ادا کر کے اس کے بارے میں بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ انھیں جاننا چاہیے کہ نماز فقط روایت اور حکایت پر منحصر نہیں بلکہ ایک حقیقت کی غماز ہے۔

چنانچہ قرآن حکیم کی بعض آیات اس امر کی طرف راہنمائی فرماتی ہیں۔ سورہ ماعون میں ہے:

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے، یہ وہی شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا پس ایسے نمازیوں کے لیے خرابی ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ یہ لوگ صرف دکھاوا کرتے ہیں اور ضرورت کی معمولی چیز بھی کسی کو نہیں دیتے۔[۱]

۵۔۳۔۷۔ اخلاقی اور سماجی نماز کے پہلو

یہ سورہ تمام تر اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان نمازیوں کی نماز ان کے منہ پر دے ماری جائے گی جو اپنی نماز کی حقیقت اور مقاصد سے غافل ہیں اور ان کی یہ غفلت اس وقت ظاہر ہو گی جب وہ معاشرے کے کمزور طبقوں سے بے نیاز زندگی گزار رہے ہوں گے، نہ یتیم پر ترس کھاتے ہوں گے، نہ کسی بھوکے کے لیے ان کا دل پسیجتا ہو گا اور نہ کسی ضرورت مند کی حاجت روائی کے لیے وہ قدم اٹھاتے ہوں گے۔ اگر ایسے افراد بظاہر پکے نمازی ہوں، نماز کو تمام فقہی شرائط کے ساتھ بجا لاتے ہوں تو بھی ان کے لیے ''ویل'' اور خرابی ہے۔ گویا ان کی نماز ان کے منہ پر دے

۱) سورہ ماعون

ماری جائے گی اور وہ نماز ان کے لیے وبال بن جائے گی کیونکہ یہ دکھاوے کی نماز قرار پائے گی۔ اللہ کی قربت کا وسیلہ بننے کے بجائے ان کے کندھوں پر بوجھ بن جائے گی۔

اسی طرح قرآن کریم فرماتا ہے کہ:

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ [1]

اور نماز قائم کرو یقیناً نماز برے کاموں اور نافرمانی سے روکتی ہے۔

گویا قرآن کی نظر میں حقیقی نماز وہی ہے جس کے نتیجے میں اسے ادا کرنے والا معاشرے میں ایک پاکباز انسان بن کے رہے۔ اگر وہ نماز ٹھیک ادا کرتا ہے اور فقہی اعتبار سے اس کی نماز میں کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا لیکن معاشرے میں وہ برے کاموں میں مبتلا ہوتا ہے اور اللہ کی نافرمانی سے نہیں چوکتا تو پھر گویا اس نے نماز قائم ہی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دانشوروں کا یہ کہنا ہے کہ نماز پڑھنے اور اسے قائم کرنے میں فرق ہے۔ یعنی نماز صحیح طور پر پڑھنا، نماز کو قائم کرنا نہیں ہے، نماز کا قیام انسان کی پوری زندگی سے وابستہ ہے کہ کیا وہ نماز ادا کرنے کے بعد اپنی نماز پر قائم ہے اور معاشرے میں دوسرے لوگوں سے میل جول میں وہ نماز کے تقاضوں کو ملحوظ نظر رکھتا ہے؟ اگر اس کا جواب ہاں ہے تو پھر اس نے صرف نماز ادا نہیں کی بلکہ اسے قائم کیا ہے۔

ان آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نماز کے ظاہری احکام اور شکل وصورت اس کے جسم سے عبارت ہیں اور روح نماز کچھ اور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض عرفاء یہ کہتے ہیں کہ اگر نماز بے روح ہو تو وہ نماز نہیں بلکہ نماز کا جنازہ ہے۔ جن دانشوروں نے نماز کے سماجی، معاشرتی اور انسانی پہلوؤں کی طرف توجہ کی ہے انھوں نے بھی بہت سے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے مثلاً علامہ اقبال کا یہ معروف شعر نماز کے انسانی مساوات کے فلسفے کی طرف اشارہ کرتا ہے:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

احادیث میں بھی اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ نماز تکبر کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اللہ اکبر سے

[1] عنکبوت:45

شروع ہونے والی نماز درحقیقت انسان کی طرف سے یہ اعتراف ہے کہ کبریائی اور عظمت اللہ ہی کو زیبا ہے۔ انسان جو اس کے حضور کھڑا ہے اور پھر اظہار خضوع کے لیے رکوع میں چلا جاتا ہے پھر انکساری اور تذلل کی آخری حد یعنی سجدے میں جا پہنچتا ہے وہ تو کمزور سا بندہ ہے، تکبر اس جھکے ہوئے اور سجدے میں پڑے ہوئے انسان کو کیسے روا ہو سکتا ہے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد معاشرے میں انسانوں میں اگر یہی شخص اپنے لیے خاص مقام کا قائل ہو جائے اور دیگر بندگان خدا پر اپنے آپ کو فوقیت دینے لگے اور بڑا بن بیٹھے تو پھر گویا اس نے اللہ اکبر کہا ہی نہیں۔ اس لیے کہ اللہ اکبر کہنے والا شخص اپنے آپ کو بڑا نہیں کہہ سکتا اور اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح نماز میں، نماز کی صف بندی میں، سب لوگ مساوی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں، بڑے اور چھوٹے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے، سب اس کے حضور بندے بن جاتے ہیں، سب ایک ہی طرح کی حرکات کر رہے ہوتے ہیں، وہ حرکات جو ایک کمزور اور عاجز سے بندے کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہیں اور دوسری طرف اللہ کی کبریائی، عظمت اور حمد و تعریف بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کے حضور پہنچ کر سب اس کے بندے بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے محبوب سید المرسلین (ص) کو بھی اس کا بندہ اور رسول کہہ رہے ہوتے ہیں تو پھر کسی اور کے لیے بڑائی کی گنجائش کہاں بچتی ہے۔ نماز کی اس روح کو بھی معاشرے کے اندر جلوہ گر ہونا چاہیے ورنہ نماز کی ادائیگی نماز کی اداکاری اور ریاکاری قرار پائے گی۔ جب انسان ایک عمل اس دنیا میں دوسروں کو دکھانے کے لیے انجام دے گا تو آخرت میں وہ اس کے اجر کی تمنا کیسے کر سکتا ہے کیونکہ اس نے آخرت کے لیے ایک عمل کیا ہی نہیں تو پھر اس کے اجر کی توقع بھی بے کار ہے۔ جنھیں دکھانا تھا انھوں نے دیکھ لیا اور جنھیں ظاہر کرنا تھا کہ میں نمازی ہوں تو ان پر ظاہر ہو گیا۔

۵۔۳۔۸۔عبادت کی روح

عبادت کی روح کو علماء نے ہمیشہ اس کی نیت میں بیان کیا ہے۔ انسان عبادت کر ہی نہیں سکتا اور انسان کا کوئی عمل عبادت قرار پا ہی نہیں سکتا اگر اس نے اللہ کی قربت اور رضا کا ارادہ نہیں کیا۔ عبادت ہے ہی وہ عمل جو اول اس انداز سے بجا لایا جائے جو انسان کو اللہ کے نمائندوں نے سکھایا

ہے اور ثانیاً اسے فقط اللہ کے لیے انجام دیا جائے۔ نماز چونکہ اللہ کی عبادت کی سب سے اہم اور خوبصورت ترین شکل ہے اس لیے اس کی ادائیگی میں اس نیت کا اہتمام زیادہ توجہ طلب ہے۔ یہ نیت پوری نماز پر حکم فرما رہنا چاہیے۔ انسان کو نماز کے تمام افعال انجام دیتے ہوئے اللہ کی قربت کے احساس اور تمنا سے سرشار رہنا چاہیے اور ادا کرنے کے بعد اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ کیا میں روحانی طور پر میں مولا اور آقا سے زیادہ قربت محسوس کر رہا ہوں کہ نہیں۔ انسان اپنے آپ کو سب سے زیادہ جانتا ہے، اس کا ضمیر ضرور اس سوال کا جواب دے گا۔

الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ [۱]

عرفا نے نماز میں ادا کیے جانے والے ہر لفظ اور نماز کی ہر ادا اور ہر رکن کے بارے میں بہت خوبصورت نکات بیان کیے ہیں۔ ان کے مطالعے سے انسان کے وجود پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور یقینی طور پر وہ حقیقی نماز ادا کرنے کے زیادہ قابل ہو جاتا ہے۔ عرفا نے جو کچھ کہا ہے اس کی بنیادیں پہلے سے قرآن و سنت میں موجود ہیں۔ ان کی نظر میں نماز اسلام کے تمام احکام، تعلیمات اور مقاصد کی بہترین آئینہ دار ہے۔ نماز انسان ساز ہے، نماز معاشرہ ساز ہے، نماز بندے کو خدا سے ملاتی ہے اور وہ بندہ جو نماز ادا کر کے اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے دل میں خدا کو دھڑکتا ہوا محسوس کرتا ہے وہ خدا کے بندوں کے لیے مہربان ہو جاتا ہے کیونکہ وہ بار بار نماز میں اعتراف کرتا ہے کہ اللہ مہربان و رحیم ہے وہ جانتا ہے کہ اللہ کی تخلیق کا سارا نظام رحم پر استوار ہے غضب پر نہیں، لہٰذا ایک حقیقی نماز گزار اللہ کے بندوں پر مہربان ہو جاتا ہے اور معاشرے میں ایک مہربان انسان کی حیثیت سے وقت گزارتا ہے اور قدم اٹھاتا ہے۔ اسی طرح نماز کے ہر کلمے کو اور نماز سے وابستہ ہر حکم کو خدا کے نیک اور صالح بندوں نے واضح کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔

۵۔۳۔۹۔ظاہری شکل وصورت کی معنویت

ظاہری شکل وصورت کی اہمیت پر مختصر بات کرنا یہاں مفید ہوگا۔ انسان اپنی فکری پرواز، معرفت الٰہی کے درجے اور اپنے اور خدا کے مابین ربط کی سطح کے مطابق اس کے حضور اظہار

---

[۱] قیامۃ: ۱۴

عبودیت کرتا ہے۔ یہ پرواز، یہ درجہ اور یہ سطح ہر انسان کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ دوسری طرف اللہ بندے سے کس طرح اظہار عبودیت چاہتا ہے یہ بات بھی اہم ہے اور پہلی سے زیادہ اہم ہے۔ اللہ کے خاص بندے اس کی اس طرح سے عبادت کرنا چاہتے ہیں جس طرح خود ان کا خدا چاہتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر مکمل کرنے کے بعد اس کے حضور التجا کی کہ پروردگار ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے دکھا۔

اَرِنَا مَنَاسِکَنَا[1]

یہ بندے کا اظہار عبودیت بھی ہے اور اللہ کی شانِ کبریائی کا اعتراف بھی۔ پھر ایک پیغمبر یہ بھی سمجھتا ہے کہ عبادت کے وہ طریقے جنھیں سب بندے اختیار کریں وہ عالمین کا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے اور وہی بتا سکتا ہے۔ اس حوالے سے یہ بات بھی اہم ہے کہ خود بندگانِ خدا کا اعتماد بھی مناسک کی ایسی شکل وصورت پر ہو سکتا ہے جس پر الٰہی ہونے کی مہر موجود ہو، اسی شکل وصورت کو عمومیت حاصل ہو سکتی ہے۔ اللہ کے خاص بندوں کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ وہ حضرت امام علی علیہ السلام کے لفظوں میں کہتے ہیں کہ پروردگار تو میرا ویسا رب ہے جیسے میں چاہتا ہوں۔

تو مجھے اپنا ویسا بندہ بنا دے جیسے تو چاہتا ہے۔

انت کما احب فاجعلنی کما تحب۔

چنانچہ حج ہو، عبادت ہو یا عبادت کی دیگر صورتیں جنھیں انبیاء نے اور پھر آخر کار آخری پیغمبرؐ نے بندگان خدا کو بتایا ہے، ان کے رواج، مقبولیت اور بقا کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انھیں الٰہی ہونے کی سند حاصل ہے۔ دوسری طرف جنھیں اللہ نے دانائی اور شعور کا ایک درجہ بخشا ہے وہ ان مناسک پر غور وفکر کریں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اظہار عبودیت کے لیے اور دیگر الٰہی، انسانی، معاشرتی اہداف کے حصول کے لیے خاص طور پر نماز اور حج کی اسلامی شکل وصورت سے بہتر کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بعض جزوی اختلافات کے باوجود، نماز اور حج کے رائج مشترکات ہمارے مقصد کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

[1] بقرہ:۲۸

عرفانی پہلو سے نماز کی شکل وصورت اور اس کے احکام پر نظر ڈالی جائے تو انسان ورطۂ حیرت میں کھو جاتا ہے، اس کے مقدمات بھی خوبصورت ہیں اور اس کی شکل وصورت بھی۔ یہ مقدمات اور شکل وصورت اظہار بندگی اور عاشقانہ کیفیات کے اظہار کے لیے حیران کن اور جاذب ترین ہیں۔

ایک بندے کا اپنے بدن کو پاک کرنا، لباس کو پاک کرنا اور خوشبو لگانا، پھر یکسو ہو کر اللہ کے حضور کھڑے ہو جانا، پھر اس کی طرف توجہ کے علاوہ کسی بھی چیز کی طرف توجہ کو حرام قرار دینا جس کا اظہار تکبیرۃ الاحرام سے ہوتا ہے اور پھر اس کے لیے اسی میں کھو جانا، اسی کی تعریف میں لگ جانا، اسی کے حضور اپنی بندگی اور سپاس کا اظہار کرنا جو اسے پسند ہے، اس کے راستے کی تمنا کرنا اور جو اسے اچھے نہیں لگتے ان سے بچ کر رہنے کی آرزو کرنا، یہ سب کیا ہے! اظہار محبت نہیں تو اور کیا ہے! اس کو راضی کرنے کی آرزو نہیں تو پھر کیا ہے! دوستی اور دشمنی کا معیار، اس کی دوستی اور دشمنی کو قرار دینا، اسے ہر حسن اور خوبی کا واجد و حامل کہنا، اس کے حضور دم بخود کھڑے ہو جانا اور پھر گویا اس امر کا اظہار کرنا کہ میں تیرے حضور کھڑا ہوں، تو مجھ سے راضی ہو۔ میرا کھڑا ہونا کافی نہیں تو میں کورنش بھی بجالاتا ہوں، میں جھک جاتا ہوں، میں اظہار خضوع کرتا ہوں، میں رکوع میں تجھے ہر عیب سے، ہر نقص سے اور ہر کمی سے مبرا اقرار دیتا ہوں۔ کائنات کے ذرے ذرے سے مل کر تیری تسبیح کے ساتھ تیری حمد بجالاتا ہوں۔ تو پاک ہے، سبحان ہے، ہر عیب اور کوتاہی سے پاک، ہر اچھائی اور خیر کا حامل۔ یہ اظہار کرنے کے بعد انسان کا اس یقین کے ساتھ کھڑا ہونا کہ جو سپاس گزاری میں نے کی ہے اور اس کے لیے جو لفظ ادا کیے ہیں وہ جانتا ہے اور اس نے سن لیے ہیں، پھر گویا اس کے دل میں آتا ہے کہ شاید نیازمندی کے اظہار میں کوئی کمی رہتی ہو تو میں اس کے قدموں کو چھو لیتا ہوں۔ میں اپنی سب سے بلند چیز یعنی اپنی پیشانی اس کے حضور خاک پر رکھ دیتا ہوں کہ اس بندۂ خاکی کی کوئی ادا شاید اس محبوب کو پسند آجائے۔ یہ گویا اس امر کا اظہار ہے کہ کبریائی بہرحال اسی کو زیبندہ ہے اور عجز و نیازمندی اس کے حضور، اس بندۂ خاکی کی معراج ہے۔ میں جتنا جھکتا چلا جاؤں گا، اس کے حضور اتنا ہی عروج پاؤں گا۔ میری یہ ساری ادائیں صاحب معراج کے بتائے ہوئے طریقے کے

مطابق انجام پا جائیں اور پھر ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو جائیں۔ کہنے کو کیا کچھ نہیں لیکن لفظ کب دل وجان کی کیفیتوں اور جذبوں کو شکل بخش سکتے ہیں تاہم ان اشارات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نماز کے کسی پہلو کو اس کے دوسرے پہلو سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ نماز کی شکل وصورت کو درست رکھنے کے لیے فقہی احکام کا اپنا ایک مقام ہے۔ تاہم انہی میں کھو جانا اور ان کے مطابق اٹھک بیٹھک کر کے مطمئن ہو جانا کہ ہم نے سر پر رکھا بوجھ اتار لیا ہے، ہرگز مطلوب نہیں۔ یہ نماز تو اس کی قربت کے لیے ہے، اسے پانے کے لیے ہے، اسے راضی کرنے کے لیے ہے۔ یہ بوجھ تو نہیں کہ جسے اتار پھینکنا مقصود ہے۔ یہ تو بندے کا اپنے محبوب آقا کے حضور اس کی کبریائی اور عظمتوں کے اعتراف کا وسیلہ ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ کیا اس کے لیے یہ جاننا کافی نہیں کہ یہ ادا مقبول ہو گی تو پھر سب کچھ قبول ہو جائے گا اور
یہ ٹھکرا دی گئی تو پھر پیش کرنے کے لیے کوئی چیز مقام قابلیت کی حامل نہ ہوگی۔ ان قبلت قبل ماسواھا، وان ردت، ردّماسواھا۔

بقول سعدی

روز محشر که جاں گداز بود
اولیں پرسش نماز بود

۵۔۴۔حج اور اس کی حکمتیں

۵۔۴۔۱۔پس منظر

حج سب عبادتوں کی ایک جامع عبادت ہے۔ یہ اسلام کی عالمگیریت کا بھی مظہر ہے۔ اسلام کی شوکت اور سیاست کو بھی آشکار کرتا ہے۔ انسانی مساوات کا پیغام بھی اس میں مضمر ہے۔ گو یا بیک وقت بہت سے پہلوؤں کا حامل ہے۔ پھر کعبہ کی مرکزیت اپنے مقام پر بے مثال اہمیت رکھتی ہے۔موسم حج کی آمد کے ایک موقع پر ہم نے اس کی چند حکمتوں کو قلم بند کرنے کی کوشش کی، ملاحظہ فرمائیے:

۵۔۴۔۲۔موسم حج اور کعبۃ اللہ کی یاد

موسم حج کی آمد نے خانہ کعبہ کے جلال و جمال کا منظر آنکھوں میں پھر زندہ کر دیا ہے۔ وہ ایسا سرچشمۂ فیض ہے جس کے آب حیات کا گھونٹ تشنگی کے ایک طوفان کو حرکت دیتا ہے۔اُس کا دیدار آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بے تاب کر دیتا ہے۔اُس کی جاذبیت دور والوں کو بھی اپنے گرد باندھے رکھتی ہے۔ وہ انسانی زندگی کا ایسا مرکزہ ہے جس کے گرد طواف سے پائے حیات تھکتے نہیں۔ وہ اپنے گرد طواف کرنے والوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے گرد یوں باندھ لیتا ہے کہ پھر کسی اور کے گرد طواف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اگر کوئی اُس کے گرد طواف کے بعد کسی اور مرکز کے گرد طواف کرتا دکھائی دے تو دونوں میں سے کوئی ایک طواف ضرور باطل ہے،ضرور دھوکا ہے۔

۵۔۴۔۳۔حج یعنی قصد

حج جس کا معنی قصد ہے اور قصد کرنے والے کو حاجی کہتے ہیں اگر اس قصد کی صداقت دلوں کے بھید جاننے والے کے ہاں قبول ہو جائے تو یہ واقعتاً حاجی ہے ورنہ نامراد مسافر، بھٹکا ہوا راہی،

آوارہ پنکھ اور بس۔ قصد کا تعلق زبان و بیان سے نہیں دل و دماغ ہے اور واقفِ رازِ دروں، جو رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے اُس سے انسان کا قصد چھپا ہوا نہیں رہ سکتا۔ یہ قصد جتنا خالص اور پاک ہوگا مہمان کی پذیرائی کا امکان بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

۵۔۴۔۴۔احرام کا پیغام

مومن کی نگاہ بصیرت لباس احرام سے بھی دانائیاں کسب کرتی ہے۔ وہ لباس کی یکسانیت پر غور کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ایک سے لباس نے امیر و غریب، حاکم و محکوم اور آقا و غلام کی تمیز مٹا دی ہے۔ سب بندے بن گئے ہیں، ایک خدا کے بندے بن گئے ہیں، بس وہی ہے جس کی بندگی میں افتخار ہے، اس کے سوا ہر کسی کی غلامی انسان کے لیے کسر شان ہے، بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اُس کی ازلی و ابدی بادشاہت کے سامنے ہر بادشاہت سرنگوں ہے۔ لباس کی سادگی نے شاہوں میں انکساری اور فقیروں میں اعتماد کی روح پھونک دی ہے۔

اس لباس نے قوم و ملت کا امتیاز ہی ختم نہیں کر دیا بلکہ رسم و رواج کے فرق کو بھی مٹا دیا ہے اور سارے انسانوں کو ایک جیسا بنا دیا ہے۔ یہاں انسان نے اپنے ہاتھوں سے کفن پہن لیا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ایک روز اسی بدن پر ایسا ہی اَن سلا لباس دوسرے ہاتھوں نے پہنانا ہے، آج میں نے خود اپنے ہاتھوں سے یہ لباس پہن لیا ہے۔ اُس روز دوسرے میرا بدن اُٹھائے توحید الٰہی کی شہادت دے رہے ہوں گے، آج میں خود اس مالکِ کبریا کے حضور حاضر ہوں اور اُسے پکار کر کہہ رہا ہوں کہ اے میرے مالک! میں تیرے حضور حاضر ہوں۔ یہاں **اللھم لبیک** کی صداؤں نے زبانوں کا فرق بھی مٹا دیا ہے۔ اصل تو زبانِ روح ہے جو روحِ کائنات سے اتصال کے لیے بے قراری کا اظہار کر رہی ہے۔ لبیک، **اللھم لبیک** کی تکرار تو اسی بے قراری کا اظہار ہے۔ یہ تو غم ہجراں سے گزرنے والے عاشق کی فریاد ہے۔ یہاں لفظ تو بس علامت کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ مقدس علامت جو جذبۂ اطاعت کی ترجمان ہے۔

۵۔۴۔۵۔زیارت بیت وطواف

جن آنکھوں کو بیت اللہ کی زیارت نصیب ہوئی ہے اور انھیں ایمان کی بینائی بھی بخشی گئی ہے

ان خوش نصیبوں کی آنکھیں اللہ کے گھر کو دیکھ کر ہر گھر سے بے گانہ ہو جائیں گی، کیونکہ یہ اُس کا گھر ہے کہ جس کی عظمت کے سامنے ہر بڑائی ہیچ ہے۔ حاجی احرام باندھے حرم الٰہی کی حرمت کا پاس کیے جب اُس گھر کا طواف کر رہے ہوں گے جس کا طواف انبیائے الٰہی اور اولیائے الٰہی کو نصیب ہوا، تو انھوں نے ضرور اس طواف کا یہ مطلب سمجھا ہوگا کہ اب مجھے کسی اور گھر کا طواف نہیں کرنا۔ بیت اللہ، اللہ کا گھر اور ہاؤس آف اللہ سے بڑھ کر کس کا بیت، گھر اور ہاؤس ہو سکتا ہے۔ اس گھر کے ساتھ ساتھ کسی اور گھر کا بھی طواف؟ الامان، یہی تو شرک ہے۔

۵۔۴۔۶۔ حجرِ اسود

اللہ کے گھر میں مومن کی نظر ایک کالے سے گھسے ہو پتھر کی زیارت کے لیے بھی بے قرار ہوتی ہے۔ یہ ''حجرِ اسود'' ہے۔ اس کا معنی ہے ''کالا پتھر''۔ یہ دیوارِ کعبہ میں نگینے کی طرح جڑا ہے۔ خوبصورتی کے ہمارے تمام دنیاوی معیارات یہاں ختم ہو گئے ہیں۔ مومن کے ہاتھ اسے چھونے کو بے چین ہیں۔ وہ بے قرار ہے کہ کاش لبوں کو اس کا بوسہ نصیب ہو سکتا۔ آنکھوں سے اسے دیکھ لینا بھی اسے کتنا لذت بخش معلوم ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے خوبصورت محل بنانے والا انسان، طرح طرح کے محراب اور طاق بنانے والا انسان، رنگارنگ پتھر تراشنے والا انسان اس سادگی اور سیاہی میں دل آویزی تلاش کر لیتا ہے۔ دنیا کے ہر وجود مادی سے زیادہ مقدس اور انمول پتھر، سیاہ پتھر مومن کو طرح طرح کے جانفزا پیغامات دے رہا ہے، اسے عظمتوں کے نئے معیارات سے آشنا کر رہا ہے۔

۵۔۴۔۷۔ سعی ہر کسی کو کرنا ہے

پھر ہر حاجی کو صفا و مروہ کے مابین سعی بھی کرنا ہوتی ہے، اس آگاہی کے ساتھ کہ ضروریاتِ حیات کی دستیابی کے لیے مجھے پوری طرح سعی کرنا چاہیے۔ سعی کرتے ہوئے ہر حاجی ضرور سوچے گا کہ جب زوجہ ابراہیمؑ اور مادر اسماعیلؑ یعنی ایک خاتون لق و دق صحرا میں بیٹے کی پیاس بجھانے کے لیے سعی کرتی ہے اور مایوس نہیں ہوتی تو مجھے سعی کرنا ہے اور مایوس نہیں ہونا اور یقین رکھنا ہے کہ **لیس للانسان الّا ما سعی** یعنی انسان کو ملنا تو سعی کے نتیجے میں ہی ہے۔ البتہ صفا و مروا کے

درمیان سعی کا پیغام یہ ہے کہ انسان کو ہر سعی اللہ کے بھروسے پر کرنا ہے۔ اللہ کے بھروسے پر کی گئی سعی کا نتیجہ بڑا عظیم اور بڑا پائیدار ہوتا ہے۔ سعی تو کافر کی بھی ضائع نہیں ہوتی لیکن مومن کی سعی اُس کے ایمان کی طرح پائیدار ہوتی ہے۔ ابلتا ہوا زمزم اسی حقیقت کی شہادت پیش کر رہا ہے۔ حاجرہؑ کی سعی یہ پیغام دیتی ہے کہ جدوجہد مرد وزن کو کرنا ہے، بے تکان کرنا ہے اور مایوس ہوئے بغیر کرنا ہے۔

۵۔۴۔۸۔ تیرے دربار میں سب ایک

جب ہم حرم خدا میں اللہ کے حضور کھڑے ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ کوئی مسلمان بھائی نماز کے دوران میں ہاتھ باندھے ہوئے ہے اور کسی نے ہاتھ کھول رکھے ہیں، کسی نے ناف پر باندھے ہوئے ہیں اور کسی نے سینے پر، کوئی اللہ اکبر کہتے ہوئے رفع یدین کر رہا ہے اور کوئی ہاتھ نہیں اٹھا رہا، کوئی الحمد کے بعد آمین کہہ رہا ہے اور کوئی نہیں کہہ رہا لیکن سب مل کر کھڑے ہیں، سب مل کر رکوع کر رہے ہیں اور سب مل کر سجدہ ریز ہو رہے ہیں۔ سب کی آنکھیں برس رہی ہیں، سب کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں، سب اللہ کے حضور اپنی حاضری کی قبولیت کے لیے بے قرار ہیں۔ یہی نہیں طواف میں ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی گورے رنگ کا ہے، کوئی کالے رنگ کا، کوئی سرخ ہے تو کوئی گندمی، مرد وزن بوڑھے، بچے اور جوان سب اللہ کی بارگاہ میں مل کر حاضر ہیں۔ سب کی ایک ہی پہچان ہے، سب کی ایک ہی قوم ہے، رنگ و زبان کا فرق ختم ہو گیا ہے، علاقے اور قوم کی تفریق مٹ گئی ہے، سب کا ایک ہی بادشاہ ہے، سب کا ایک ہی حکم ہے، سب ایک ہی کو پکار رہے ہیں اور سب اسی کو لبیک کہہ رہے ہیں۔

۵۔۴۔۹۔ میدانِ عرفات کا پیغام

حج کے مناسک ارکان و فرائض تقریباً تمام تر حدودِ حرم میں ادا کیے جاتے ہیں لیکن میدان عرفات کا وقوف و قیام اس سے مختلف ہے۔ شہر مکہ سے تقریباً اکیس کلومیٹر کے فاصلے پر یہ سرزمین مقدس واقع ہے۔ جو ایک عظیم تاریخی پس منظر رکھتی ہے۔ یہاں تک اسلامی روایات کے مطابق حضرت آدم اور حضرت حوا کی اس زمین پر پہلی ملاقات اسی میدان میں ہوئی اور انھوں نے ایک دوسرے کو پہچانا۔ ایک دوسرے کی اسی پہچان اور معرفت کی وجہ سے اسے عرفات کہا جاتا ہے۔

''عرفات'' نام کی اور بھی وجوہات نقل ہوئی ہیں اور کوئی بھی ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتی لیکن جس امر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ حصولِ عرفان الٰہی کے لیے اس سرزمین سے اہل اللہ نے ہمیشہ ہی بہت استفادہ کیا ہے اور اسی اعلیٰ ہدف پر نبی کریمؐ، آئمہ اہل بیتؑ اور دیگر اصحابؓ و اولیاء نے زیادہ زور دیا ہے۔

یہاں تمام عازمین حج احرام باندھ کر ۹ ذوالحجہ کو ظہر تک پہنچ جاتے ہیں اور انھیں غروب آفتاب تک اس عظیم میدان میں رہنا ہوتا ہے۔

اس سرزمین میں چند ساعتوں کا یہ وقوف حاجیوں کے لیے دعا، مناجات اور طلب مغفرت کا ایک بہت نادر موقع ہوتا ہے۔ جیسے مختلف میقات مقرر کیے گئے ہیں جہاں مختلف سمتوں سے آنے والے حاجی احرام باندھتے ہیں۔ میدان عرفات عملی طور پر ایک اجتماعی میقات کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے، کیونکہ ہر حاجی کا وہاں اس دورانیے میں موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تمام مرد و زن ایک میدان میں اکٹھے ہو کر لباس احرام زیب تن کیے، رو بہ حرم ہوتے ہیں۔ چند گھنٹوں کے لیے یہ عظیم میدان جو سال بھر بے آباد ویرانے کی طرح ہوتا ہے، اچانک خیموں سے آباد ہو جاتا ہے، دنیا میں کسی ویرانے کی اس طرح سے اچانک ہر سال آبادی اپنی مثال آپ ہے، یہ آبادی آج کل تین سے چار ملین افراد تک جا پہنچتی ہے، جس میں مرد و زن، بچے، بوڑھے سب شریک ہوتے ہیں۔ ہر نسل، ہر خطے، ہر زبان اور ہر رنگ کے بندگان خدا ایک مرکز کی طرف رخ کیے ہوئے، ایک خدا کو پکار رہے ہوتے ہیں۔ کسی کو حشر کے میدان کی کیفیت کا کچھ اندازہ کرنا ہو تو وہ اس آباد میدان عرفات کو دیکھ لے۔

اللہ تعالیٰ کس طرح سارے انسانوں کو ایک بنانا چاہتا ہے، ان کا رخ اور سمت ایک طرف کرنا چاہتا ہے، اس کا ظہور میدان عرفات میں ہوتا ہے۔ میدان عرفات میں یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ کون سے اختلافات انسانوں میں رہ جانا فطری ہیں اور ہمیں قابل قبول ہونا چاہئیں اور اسی طرح انسانیت کی وحدت و اتحاد سے کیا مراد ہے اور ایک عالمی دین کا وحدت بشریت سے منشا کیا ہے! یہ بھی میدان عرفات میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ کن امور میں مساوات ممکن ہے اور کن میں ممکن نہیں، اس

کا مشاہدہ میدان عرفات میں کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف رنگ روپ کے لوگ، مختلف قد کاٹھ کے افراد اس میدان میں اکٹھے ہوتے ہیں لیکن ان اختلافات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ان اختلافات کو وہ ایک دوسرے کی پہچان سے زیادہ وقعت نہیں دے رہے ہوتے لیکن سب کا رُخ اللہ کے گھر کی طرف ہوتا ہے۔ سب اللہ کے بندے بنے ہوئے اس کے حضور سر بسجود ہوتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کا احترام کر رہے ہوتے ہیں۔ سب ایک جیسا لباس پہنے ہوتے ہیں۔ امیر اور غریب کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ قوموں اور جغرافیوں کا اختلاف عنقا ہو جاتا ہے۔ جنسی تفاخر کا بھی نام ونشان نہیں رہتا، سب گویا اپنے وجود سے اپنے باپ ابراہیم کی طرح پکار رہے ہوتے ہیں:

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ[1]

یقیناً میں نے اپنا رُخ یکسو ہو کر اس ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

۵۔۴۔۱۰۔ شیطانوں پر سنگ باری

میدان عرفات کا قیام عرفان الٰہی اور مقاصد حج کی معرفت کے لیے ہے۔ وہاں سے حاجی مشعر الحرام یا مزدلفہ میں پہنچتے ہیں۔ یہاں کنکر جمع کیے جاتے ہیں تاکہ منیٰ میں پہنچ کہ ''شیطان'' کو سنگسار کیا جائے۔ یہ کیا ہے؟ پتھروں کے تین ستون۔ شیطان پر کنکر برسانے کے اس واجب عمل کو ''رمی جمرات'' کہا جاتا ہے۔

کیا پتھروں کا ستون شیطان ہے؟
کیا یہ پتھروں کا ڈھیر خدا اور انسان کا دشمن ہے؟
کیا یہ پتھر اسلام کے خلاف سازش کرتے ہیں؟
ان بے جان پتھروں کا کیا قصور ہے کہ لاکھوں لوگ ہر سال ان پر سنگ باری کرتے ہیں؟

---

[1] سورہ انعام، ۷۹

یہ سنگ باری کتنا عجیب عمل ہے؟

کیا یہ بات سوچنے کی نہیں کہ بے جان، بے روح، بے عمل پتھروں پر آخر سنگ باری کیوں کی جاتی ہے؟

کیا مسلمان صدیوں سے ایک مہمل اور بے مقصد کام کرتے چلے آرہے ہیں؟

کیا اسلام نے واقعی صرف پتھروں کے ان ستونوں سے نفرت اور اظہار بیزاری کا حکم دیا ہے؟

یہ حکمِ اسلام کتنا عجیب ہے۔ اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کیا فائدہ ہے؟

اس میں دین کی کیا بھلائی ہے؟

کیا رمی جمرات کا حکم واقعاً ایک حکیم و دانا خدا کی طرف سے ہے؟

اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس عمل میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

کیا پتھروں کے اسی ستون کے بارے میں ''قرآن حکیم'' کہتا ہے: '' اِنَّ الشَّیطٰنَ لِلْاِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِینٌ '' یقیناً شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

کیا پتھروں کا یہ ڈھیر انسان کا کھلا دشمن ہے؟

اس نے کب اور کیسے انسان سے دشمنی کی ہے؟

کیا مسلمانوں نے اور بالخصوص حاجیوں نے اپنے اس عمل پر غور کیا ہے؟

وہ جو پتھروں کے ڈھیر پر چند کنکر برسا کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں نے شیطان کو مار لیا، اپنے آپ پر، اپنے اس عمل پر اور اپنی اس فکر پر غور کرے۔۔۔ کیونکہ قرآن بار بار غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

اسلام کے بہت سے احکام علامتی ہیں۔

کعبہ کو خدا کا گھر کہتے ہیں۔ کیا خدا اس میں رہتا ہے؟

ہرگز نہیں۔ خدا تو زمان و مکان سے ماوراء ہے۔

یہ کعبہ تو خدا کی طرف توجہ کے لیے ایک محسوس علامت ہے۔

پتھروں کا ستون جسے شیطان کہہ کر کنکر مارے جاتے ہیں، وہ بھی شیطان نہیں بلکہ شیطان

کی علامت ہے۔

''شیطان'' کا لفظی معنی ہے ''ضرر رساں وجود''۔ ہر ضرر رساں اور نقصان دہ موجود اور وجود کو شیطان کہتے ہیں۔

کیا مسلمان سوچتے نہیں کہ پتھروں کا ایک ستون شیطان نہیں ہوسکتا بلکہ یہ تو اشارہ ہے اس بات کی طرف، راہنمائی ہے اس حقیقت کی طرف کہ اے حاجی! تجھے ہر شیطان، ہر ضرر رساں وجود سے اتنی ہی شدت سے نفرت کرنا چاہیے جتنی نفرت سے تو ان پتھروں کے ستونوں کو شیطان سمجھ کر کنکر مار رہا ہے۔

اے حاجی! کوئی بھی شیطان دوستی اور بھروسے کے قابل نہیں۔

اے حاجی! ہر شیطان شدید نفرت کے قابل ہے۔

اے حاجی! ہر شیطان پر ٹوٹ پڑ، ہر شیطان پر نفرت کے پتھر برسا، آرام سے نہیں پوری قوت اور شدید نفرت کے ساتھ۔

لیکن شیطان پر کنکر برسانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اسے پہچانا جائے، اسے سمجھا جائے، اس کے طرز عمل کی شناخت کی جائے اور اس کے حربوں اور ہتھکنڈوں پر نظر کی جائے۔

ضروری ہے کہ یہ حقیقت بھی سمجھی جائے کہ ہر دور کا ایک ہی شیطان نہیں ہوتا بلکہ ہر دور میں مختلف شیطان موجود ہوتے ہیں۔ اسی لیے تین طرح کے شیطانوں پر کنکر برسائے جاتے ہیں۔

ضروری ہے کہ ہم آج کے شیطانوں کو پہچانیں۔ خاص طور پر شیطانوں کے سرغنہ کو پہچانیں۔ شیطان اعظم کی شناخت کریں تاکہ اس کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے۔ اس کے خلاف عملی جہاد کا آغاز کیا جائے۔ ہر محاذ پر اس کا مقابلہ کیا جائے۔ اس شیطان اعظم کے ساتھیوں اور ایجنٹوں کو بھی پہچاننے کی ضرورت ہے، سب سنگ باری کے قابل ہیں۔

۵۔۴۔۱۱۔ حج اور قربانی

قربانی کا مقصد تقرب الٰہی کے لیے کسی چیز کو قربان کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ ہم عید قربان حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند صالح حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے واقعے کی یاد میں مناتے ہیں۔

قرآن حکیم میں اس واقعہ کو سورہ صافات میں یوں بیان کیا ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ○ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ○ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ○ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗؤُا الْمُبِيْنُ ○ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ○

جب اسماعیل اُن کے ساتھ دوڑ کر چلنے کی عمر کو پہنچ گئے تو ابراہیم نے کہا: اے میرے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں تو سوچ کر کہو کہ تمھاری کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا: ابا جان! جس چیز کا آپ کو حکم ملا ہے وہ کر ڈالیے، ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ پھر جب دونوں اللہ کی رضا کے سامنے جھک گئے تو ابراہیم نے انھیں پیشانی کے بل لٹا دیا اور ہم نے انھیں آواز دی کہ اے ابراہیم! تم نے واقعی اپنا خواب سچ کر دکھایا ہے۔ ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک بہت کھلی آزمائش تھی اور ہم نے ایک ذبح عظیم کو اس کا بدل قرار دیا۔

ہم جو عید قربان مناتے ہیں وہ ان دونوں عظیم توحید پرستوں کی اللہ کے حضور اپنا سب کچھ قربان کر دینے کی اسی مثال کی یاد میں ہے۔ دراصل بندے کا ساری دنیا سے رخ موڑ کر خدا کی طرف لوٹ آنا ہی اس کے لیے حقیقی عید ہے۔

روایات میں ہے کہ نبی کریمؐ جتنا عرصہ مدینہ منورہ میں رہے آپؐ ہر سال قربانی کرتے تھے۔ جیسا کہ ترمذی کی اس روایت میں بتایا گیا ہے:

اقام رسول اللہ بالمدینۃ عشر سنین یضحی۔

رسول اللہ دس برس مدینہ میں رہے اور قربانی کرتے رہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قربانی کا تعلق صرف حج کرنے والے سے نہیں ہے بلکہ عید قربان پر قربانی پیش کرنا نبی کریمؐ کی سنت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں مسلمان ہر سال عیدالاضحیٰ کے موقع پر حسب توفیق کوئی نہ کوئی قربانی اللہ کی رضا کے لیے پیش کرتے ہیں اور اس موقع پر توحید پرستوں کے عظیم پیشوا حضرت ابراہیمؑ کی یاد تازہ کرتے ہیں جو اپنی عزیز ترین متاع حیات اللہ کی رضا کے لیے قربان کرنے کو تیار ہو گئے۔ آپ نے قربانی پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ حقیقی خدا پرست وہ ہے جو ہر چیز خدا کی خوشنودی کے لیے فدا کرنے پر ہمیشہ کمر بستہ ہو۔ انھوں نے توحید پرستی کے راستے میں اسماعیلؑ جیسے بیٹے کی محبت کو بھی حائل نہیں ہونے دیا۔ جبکہ دوسری طرف حضرت اسماعیلؑ کا اپنی زندگی میں شعور و بلوغ کی پہلی منزل پر بھی رضائے الٰہی کے لیے خوشی خوشی اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کر دینا توحید پرستی کی ایک لازوال مثال ہے۔

خدا کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا یہی سبق نبی کریمؐ عیدالاضحیٰ کے موقع پر اس وقت دوہرایا کرتے تھے جب قربانی کے لیے جانوروں کو لٹادیا جاتا تھا۔ آپ اس موقع پر یوں گویا ہوتے تھے۔

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ عَلٰی مِلَّۃِ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَ لَکَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَ اُمَّتِہٖ بِسْمِ اللّٰہِ وَ اللّٰہُ اَکْبَرُ

بے شک میں نے اپنا رخ اس ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا، ملت ابراہیم پر یکسو ہو کر اور میں مشرکوں میں سے نہیں۔ بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ یا اللہ! تجھ سے اور تیرے لیے محمدؐ کی طرف سے اور ان کی امت کی طرف سے۔ پھر کہتے: بسم اللہ واللہ اکبر۔[1]

[1] یہ روایت مسند احمد، سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ سنن دارمی اور مشکوۃ شریف میں موجود ہے۔

اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قربانی پیش کرتے ہوئے نبی کریمؐ نے اپنی امت کو بھی فراموش نہیں کیا اور خاص طور پر اپنی امت کے ان غریب ونادار افراد کو ان مواقع پر یاد رکھا جو قربانی نہیں کرسکتے۔ امت کو بھی چاہیے کہ قربانی پیش کرتے ہوئے اپنے محسن اور کریم ہادی سید المرسلینؐ کو یاد رکھے۔ جیسا کہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے بارے میں ہے کہ ہر سال آپ ایک قربانی نبی کریمؐ کی طرف سے پیش کیا کرتے تھے۔

۵۔۴۔۱۲۔قربانی: ہوا وہوس کی گردن پر چھری پھیرنے کا نام ہے

حضرت ابراہیم خلیل اللہ اپنی بہترین متاع حیات اللہ کے حضور قربان کرنے کے لیے آخری حد سے گزر گئے۔ یہاں تک کہ آسمان سے یہ صدا گونج اٹھی کہ ابراہیم! آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ ابراہیم ایثار اور قربانی کی بہترین علامت ہیں، ایک خالص اور پاکیزہ علامت۔ وہ قربانی و ایثار کا استعارہ بن چکے ہیں۔ ہم چاہے سرزمین حرم سے دور عید قربان پر قربانی کر رہے ہوں یا سرزمین حرم پر، ہر وقت ابراہیم خلیل اللہ ہماری آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔ ابراہیم نے اسماعیل کی گردن پر چھری نہیں چلائی بلکہ دنیاوی زندگی اور آرزو کی ہر شکل کو ذبح کر دیا۔ ابراہیم اسی لیے ابراہیم ہیں۔ ابراہیم کی یاد اسی لیے منانا ضروری ہے۔ مادی ہوس اور آرزو کو ذبح کر کے اللہ کی قربت کا مقام حاصل کرنے کا سبق واقعتاً ابراہیم سے سیکھنا چاہیے۔ عید قربان سب کچھ اللہ کے لیے قربان کر کے اس کی قربت کی تمنا کے عملی مظاہرے کا دوسرا نام ہے۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے یہ سب اگر سچ ہے تو پھر یہ بھی سچ ہے کہ ہوس اور ایثار اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایثار تو ہے ہی ہوس کی گردن پر چھری پھیر دینے کا نام۔ ایسے میں اگر ہم اپنی ذات میں جھانک کر دیکھیں تو ایسی کئی قربانی کی عیدیں ہماری زندگی میں گزر گئی ہیں لیکن ہوس کا گھوڑا ہے کہ زیادہ منہ زور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کون ہے جو اپنے گریبان میں جھانک کر عید کی شام کو یہ اعلان کر سکے کہ آج میں نے اپنی کسی ہوس پر کسی دوسرے کو قربان نہیں کیا بلکہ اپنی ہوس کو اللہ کی رضا کے لیے کسی بندے کی خاطر قربان کر دیا ہے۔ اے کاش ایسا ہو سکے۔ جس خوش نصیب کا ضمیر عید کی شام یہ گواہی دے سکے وہ جذبۂ شکر و تشکر کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں جھک جائے کہ اسے

واقعاً عید قربان میسر آگئی ہے۔ اس نے واقعاً ''بڑی عید'' کو پالیا ہے۔

۵۔۴۔۱۳۔ حرم امن

حرم امن الٰہی اور مومن کا کیسا نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے۔ ایمان امن اور مومن ساتھ ساتھ ہیں، یہ حقیقت کیسے خانۂ خدا میں منجم ہو جاتی ہے اور ایک عملی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں تو انسان کے ہاتھوں سے کیڑے مکوڑے بھی محفوظ ہیں اور درختوں کے پتے بھی اس کی دستبرد سے مامون ہیں، انسان کی جان تو بہت دور کی بات ہے۔ یہاں سب انسان مامون ہیں، سب محفوظ ہیں، سب کو امان حاصل ہے۔ یہاں عزت وحرمت اور ناموس بھی محفوظ ہے۔ گویا اللہ اور اللہ کا گھر انسانیت کو امن و سلامتی کا پیغام دیتا ہے۔ اللہ انسان کی جان کو گراں بہا جانتا ہے، اُس خالق نے جانِ انسانی کو تکریم عطا کی ہے، اس نے اسے احسنِ تقویم میں پیدا کیا ہے، اُسے گوارا نہیں کہ اس کا خون بہایا جائے۔ اُس کے رسولؐ نے بہت عظیم بات کہی کہ میرے لیے ساری زمین کو مسجد بنایا گیا ہے۔ رحمۃ للعالمین کا پیغام ساری زمین کے لیے رحمت ہے اور ساری زمین کا احترام مسجد کی طرح قائم ہونا چاہیے۔ سارے انسانی معاشرے کو امن وسلامتی کا گہوارا ہونا چاہیے۔

مردوزن اکٹھے طواف کرتے ہیں، اکٹھے سعی کرتے ہیں اور سب کی توجہ اپنے اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ جب سب کی توجہ اللہ کی طرف ہو تو عزتیں محفوظ ہوتی ہیں، جانیں امان میں ہوتی ہیں اور اموال کا کھٹکا نہیں ہوتا۔ یہاں سے مومن یہ قانون اخذ کرتا ہے کہ دنیا کے لیے امان توجہ الی اللہ میں ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ پوری دنیا میں ظلم و بے اعتدالی توجہ ہی کے بھٹک جانے کا نتیجہ ہے اور جونہی توجہ یکسو ہو جائے، ایک اللہ کی طرف ہو جائے تو امن وسکون اور اطمینان کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔

۵۔۴۔۱۴۔ حرم الٰہی میں مظلوموں کی یاد

حرم الٰہی کی فضاؤں میں پہنچ کر انسان سراپا دعا بن جاتا ہے۔ ہمہ وقت خدا کے حضور اپنی محرومیوں کا ذکر کرتا ہے اور انھیں دور کرنے کی التجا کرتا ہے لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو یاد آتی ہے کہ وہ اس اللہ کے گھر میں آئے ہیں جو رب العالمین ہے۔ جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اُس سے مانگنے میں کنجوسی کیوں کی جائے۔ وہاں جا کر تو اللہ کے سارے محروم بندوں کو یاد کرنا

چاہیے۔اُن سب کو یاد کرنا چاہیے جنھیں زندگی کے آرام اور چین سے محروم کر دیا گیا ہے۔جن کے وسائل لوٹ لیے گئے ہیں اور جنھیں لوٹا جارہا ہے۔صرف محروم لوگوں کی نجات کی دعا ہی کیوں مانگی جائے، وہاں پر ظالموں اور ستمگروں کی نابودی کی دعا بھی کی جانا چاہیے۔

اللہ کے گھر میں پہنچ کر ابراہیمی جذبوں سے سرشار ہونا چاہیے۔یہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا بنایا گیا گھر ہے۔وہ خالص اللہ کے بندے تھے۔ابراہیمؑ نے غیر اللہ کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔وہ نمرود کے سامنے ڈٹ گئے تھے۔نمرود جو طاغوت زمانہ تھا،اُس کی اطاعت سے انکار کر دیا تھا۔اُس کے سامنے ابراہیم نے توحید کا پرچم لہرایا تھا۔وہ پورے بت پرست معاشرے کے سامنے سینہ سپر ہو گئے تھے۔انھوں نے آگ میں کود جانا گوارا کر لیا لیکن طاغوت اور کسی بت کے سامنے سر جھکانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔خانہ کعبہ میں پہنچ کر اپنے دور کے طاغوت کے خلاف عزم صمیم کیا جانا چاہیے۔وہاں پہنچ کر بندوں کو بتوں کی غلامی سے نجات دلانے کا جذبہ پانا چاہیے۔

دعا کی ہمہ گیریت کا سبق بھی حضرت ابراہیمؑ سے پانا چاہیے۔انھوں نے خانہ کعبہ کی تکمیل کی تو اپنے اللہ کے حضور اس عمل کی قبولیت کی دعا کی اور پھر اپنی دعا میں سب کو شریک کیا۔وہ اللہ کے حضور عرض کرنے لگے:

> اے میرے رب:
> مجھے اپنی عبادت کے راستے پر قائم رکھ میری ذریت اور اولاد میں سے بھی ایسے ضرور ہوں جو تیری عبادت کے راستے میں قیام کریں (اور تیری توحید پرستی کا پرچم بلند رکھیں) اور اے ہمارے پالنے والے! ہماری فریاد رسی کر، ہماری دعا قبول فرما۔اے ہماری پرورش کرنے والے! حساب کا دن آئے تو مجھے بخش دینا، میرے والدین کی مغفرت فرمانا اور سارے مومنین کو بھی بخش دینا۔

خانہ کعبہ میں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ کی مانگی ہوئی ایک ایک دعا یاد آتی ہے اور دل کی گرہیں کھولتی جاتی ہے۔

۵۔۴۔۱۵۔حج اور عالم اسلام کا نوحہ

آج کا مسلمان جب حج کرنے جاتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر وہ عالم اسلام کے زوال وتنزل کا نوحہ نہ پڑھے اور اللہ کے حضور اُس کی پس ماندگی سے نجات کی دعا نہ مانگے۔ کیسے ایک بیدار مسلمان عالم اسلام کے پارہ پارہ اور زخمی زخمی بدن کا احساس کر کے اللہ کے حضور اُس کی چارہ گری کی فریاد نہ کرے۔ کیونکر ممکن ہے کہ وحشی استعماری درندوں کے قدموں میں پامال مسلمانوں کی یاد اللہ کے گھر میں ابراہیمؑ ومحمدیؐ مسلمان کو بے تاب نہ کر دے۔

اتنا ہی نہیں رحمت عالمین کا ماننے والا تو سارے ستم رسیدہ انسانوں کی نجات کی دعا کرے گا اور ان کی نجات کے لیے قدم اٹھانے کے لیے اللہ سے حوصلے اور مدد کا بھی طلب گار ہوگا۔

۵۔۴۔۱۶۔حج پر ناروا پابندیاں نہ لگاؤ

قرآن کریم میں بڑی صراحت سے مسجد حرام کا راستہ روکنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ کس قاریٔ قرآن کو قرآن حکیم کی یہ آیات یاد نہیں:

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ الَّذِیۡ جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَۨ الۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَ الۡبَادِ ؕ وَ مَنۡ یُّرِدۡ فِیۡہِ بِاِلۡحَادٍۭ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡہُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ۝ وَ اِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰہِیۡمَ مَکَانَ الۡبَیۡتِ اَنۡ لَّا تُشۡرِکۡ بِیۡ شَیۡئًا وَّ طَہِّرۡ بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَ الۡقَآئِمِیۡنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ ۝ وَ اَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَّ عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ ۝[1]

جو لوگ کافر ہیں اور (لوگوں کو) خدا کے راستے سے اور مسجد محترم سے جسے ہم نے لوگوں کے لیے یکساں (عبادت گاہ) بنایا ہے روکتے ہیں خواہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے اور جو اس میں شرارت سے کج روی (وکفر) کرنا چاہے اس کو ہم درد دینے والے عذاب کا مزہ چکھائیں

[1] الحج:۲۵تا۲۷

گے (اور ایک وقت تھا) جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ کعبہ کو مقرر کیا (اور ارشاد فرمایا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا اور طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو صاف رکھا کرو اور لوگوں میں حج کے لیے ندا کر دو کہ تمھاری طرف پیدل اور دبلے دبلے اونٹوں پر جو دور دراز رستوں سے چلے آتے ہیں (سوار ہو کر) چلے آئیں۔

اسی طرح قرآن حکیم میں یہ بھی فرمایا گیا ہے:

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ رَسُوْلُهٗ[1]

اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن انسانوں کو پکار کر یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہیں۔

اسی سورہ توبہ میں یہ بھی فرمایا گیا ہے:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ[2]

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد الحرام کی آبادی کو اس کا جیسا سمجھ لیا ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور راہ خدا میں جہاد کرتا ہے ہرگز یہ دونوں اللہ کے نزدیک برابر نہیں اور اللہ ظالم قوم کی ہدایت نہیں کرتا۔

۵۔۴۔۱۷۔حج کی تکمیل کے بعد ایک جائزہ

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کی پکار پر لبیک کہی۔ اس کی کبریائی کے زمزمے گنگنائے اور اس کے

---

[1] التوبہ:۳

[2] التوبہ:۱۹

گھر کا طواف کیا۔ کیا اس کی آواز پر لبیک کہنے کے بعد اب اس کے غیر کی آواز پر لبیک کہنا جائز ہے؟ اس کی کبریائی کا زمزمہ دل وجاں کے ساز پر گنگانے کے بعد اب کسی غیر کی عظمت وقوت کا گیت گایا جاسکتا ہے؟ اس کے گھر کا طواف کرنے کے بعد اس کے غیر کے گھر کا طواف کرنا روا ہے؟

جس پیغمبر اعظمؐ نے فرمایا تھا کہ حج گناہوں کو یوں دھو دیتا ہے جیسے پانی میل کچیل کو صاف کر دیتا ہے۔ اس کے فرمان کے مطابق اگر اپنی روح کی میل کچیل صاف کر لی جائے حج ادا ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے حج کے مختلف مراحل اور مناسک کا ایک جائزہ لیا ہے اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حج فقط چند مناسک اور اعمال کا نام نہیں بلکہ یہ عظیم الٰہی اجتماع دین اسلام کی عظمت کو آشکار کرتا ہے، یہ انسانی مساوات کا عملی سبق دیتا ہے، یہ مرد وزن دونوں کی اس اہمیت کو آشکار کرتا ہے جو اسلام نے انھیں عطا کی ہے۔ حج دین کی آفاقی تعلیمات کا ترجمان ہے۔ یہ شیطان وطاغوت کے خلاف مسلمانوں کے عزم جہاد کا نقیب ہے۔ توحید پرستی کا سمبل ہے اور اللہ کے راستے میں ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

ہمیں حج کی تکمیل کے بعد اپنا جائزہ بھی لینا ہے کہ کیا ہم اپنے وجود میں حج کی حکمتوں کو جلوہ گر دیکھ رہے ہیں اور کیا ہم نے حج کو اس کے اعلیٰ مقاصد کے مطابق انجام دیا ہے۔ اسی طرح ہمیں حج سے حاصل کیا ہوا سبق اپنی سرزمینوں پر واپس آ کر اپنے اہل وطن اور توحید پرستوں تک بھی پہنچانا ہے۔

باب ششم

****

آئینہ مستقبل

□

۶۔۱۔احیائے امت کا خواب

احیائے امت کا خواب نیا نہیں۔مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے یہ آرزو سامنے آتی رہی ہے۔خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد جب مسلمانوں کا سیاسی زوال ہمہ گیر ہو گیا تو یہ آرزو مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور شخصیات کے سینے میں مچلتی رہی کہ کسی طرح سے مسلمان پھر ایک عالمی طاقت بن کر ابھریں۔بعض لوگوں کے نزدیک احیائے امت کا یہی ایک طریقہ ہے۔

یورپی استعماری طاقتوں کا بلاواسطہ غلبہ مسلمانوں کی سرزمینوں پر رفتہ رفتہ کمزور ہوتا گیا اور مسلمانوں کی چھوٹی بڑی ریاستیں نئے سرے سے آزاد ہونا شروع ہوئیں۔احیائے امت کا خواب کبھی اسلامی خلافت کے احیاء کے عنوان سے سامنے آیا اور کبھی مختلف احیائی تحریکوں کے عنوان سے۔ اخوان المسلمین، جماعت اسلامی، حزب التحریر اور ان جیسی دیگر تنظیمیں دراصل امت اسلامیہ کے اندر ایک بیداری اور اسلام کے سیاسی غلبے کی تحریکیں کہلا سکتی ہیں۔

کس طرح سے عالم اسلام اکٹھا ہو، کیسے پھر وہ ایک امت اور ایک عالمی اسلامی قوت کے طور پر دنیا میں پہچانا جائے اس کے لیے مختلف تجاویز سامنے آتی رہی ہیں۔علامہ اقبال کی بھی رائے تھی کہ جوں جوں مسلمان ریاستیں آزاد ہوں وہ آپس میں مل کر ایک مرکز پر اکٹھی ہو جائیں۔ہمارے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ خلافت کا قدیم ادارہ اب زندہ نہیں ہو سکتا اور خلافت کا کلاسیکی تصور عصر حاضر میں قابل قبول بھی نہیں ہو سکتا۔ان کی رائے یہ ہے کہ ایک وفاقی حکومت قائم کی جانا چاہیے جس میں موجودہ تمام اسلامی ممالک شامل ہو کر اپنا تشخص بھی برقرار رکھ سکیں لیکن ایک فیڈریشن کے تقاضوں کے مطابق بعض شعبے مرکزی حکومت کو تفویض کر دیں۔

او آئی سی مسلمانوں کے موجودہ ممالک کے ایک اتحاد ہی کے پلیٹ فارم کے طور پر معرض وجود میں آیا۔اس کی بنیاد مسلمانوں کو درپیش خارجی چیلنجز کے مقابلے میں ایک سیاسی قوت کا اظہار

ہی تھا۔ بعد ازاں اسے عالم اسلام کے اقتصادی اور دیگر شعبوں میں باہمی تعاون کے لیے بھی بروئے کار لانے کی قراردادیں منظور ہوتی رہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ پلیٹ فارم مسلمانوں کی ناکام آرزوؤں کا عنوان بن کر رہ گیا بلکہ اب تو او آئی سی کے ممبر ممالک کے سربراہوں کا اجلاس منعقد ہونے لگتا ہے تو دل دھڑکنے لگتا ہے کہ اللہ عالم اسلام کی خیر کرے۔

بعض لوگوں کی یہ رائے رہی کہ عالم اسلام کو ایک فوجی اتحاد قائم کرنا چاہیے۔ کچھ عرصہ پہلے سعودی عرب کے ایما پر ایک فوجی اتحاد کی داغ بیل ڈالی گئی لیکن دنیا جانتی ہے کہ یہ اتحاد خود عالم اسلام کے اندر نفاق کی علامت کے طور پر معرض وجود میں آیا ہے۔ یہ مسلمانوں پر حملہ آور کسی بیرونی قوت کے مقابلے کے لیے نہیں بنا۔ اس سے ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی کہ یہ کوئی گولی مسلمانوں کے بیرونی دشمن پر بھی چلائے گا۔

دیکھا جائے تو القاعدہ اور داعش جیسی تنظیمیں ،ان کے اپنے دعوی کے مطابق، عالمی سطح پر مسلمانوں کے ادارۂ خلافت کے احیاء کے لیے ہی معرض وجود میں آئی ہیں۔ داعش نے تو اپنے سربراہ کا عنوان ہی خلیفہ رکھ لیا ہے۔ یہ دونوں تنظیمیں جو آج عالم اسلام کے اندر خوف اور وحشت کی علامت بن چکی ہیں اپنے آپ کو کسی ایک خطے تک محدود نہیں رکھتیں بلکہ ان کا ادعا ہے کہ وہ عالمی سطح پر اسلامی خلافت قائم کریں گی۔ پہلے مرحلے پر انھوں نے مسلمانوں کے اندر حکومتوں کو تبدیل کرنے اور ملکوں پر قبضہ کرنے کے لیے کارروائیاں شروع کر رکھی ہیں۔ ان کا اصل میدان جنگ مسلمانوں کے ممالک ہی ہیں۔ اگرچہ کوئی نہ کوئی کارروائی کبھی کبھار عالم اسلام سے باہر بھی ان سے منسوب ہو جاتی ہے لیکن ہم سے پوشیدہ نہیں کہ انھوں نے افغانستان، شام، عراق، لیبیا اور دیگر اسلامی ملکوں کو اپنے لیے رزم گاہ کے طور پر منتخب کر رکھا ہے۔ پاکستان بھی ان کی کارروائیوں سے محفوظ نہیں۔ اسی طرح دیگر کئی ملکوں کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ ان تنظیموں نے ابھی تک کوئی کارروائی اسرائیل کے خلاف نہیں کی جو بالکل عالم عرب کے بیچ میں واقع ہے۔

احیائے امت کے نام پر سرگرم بعض تنظیمیں پرامن انتخابی جدوجہد کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کرتی ہیں۔ بعض ایسی بھی ہیں جن کا کہنا ہے کہ جب وہ اس قدر عوامی قوت اکٹھی کرلیں گی کہ

جس کے جمع ہونے سے حکومت سے غیر مسلح ٹکراؤ کے ذریعے نظام تبدیل کیا جا سکے، وہ اس وقت میدان میں اتریں گی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایسی ساری تنظیموں میں طریقہ کار کا اختلاف ضرور ہے لیکن ان کا مقصد بہر حال ایک ہی ہے۔

دوسری طرف قومی ریاستیں پوری دنیا میں معرض وجود میں آ چکی ہیں جن کی اپنی سرحدیں ہیں، اپنی اپنی حکومتیں ہیں، اپنے اپنے آئین ہیں اور اپنے اپنے قوانین۔ عالم اسلام بھی ان سے مختلف نہیں ہے۔ وہ بھی کم و بیش 57 ریاستوں میں منقسم ہے اور یہ سب ریاستیں آزاد مملکتوں کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی رکن ہیں۔ ان کے اپنے اپنے قومی شناختی کارڈ اور اپنے اپنے پاسپورٹ ہیں۔ چھوٹی بڑی فوجیں ہر ملک نے بنا رکھی ہیں۔ ان میں سے بعض ممالک میں بظاہر جمہوری حکومتیں قائم ہیں اور بعض میں خاندانی بادشاہتیں یا آمریت کی دیگر شکلیں موجود ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے نسبتاً بڑے ممالک میں آئینی اور کسی حد تک جمہوری حکومتیں قائم ہیں۔ ان میں سے انڈونیشیا، ملائیشیا، بنگلہ دیش، پاکستان، ایران اور ترکی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

اس صورت حال کے تناظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا احیائے امت کی کوئی قابل عمل صورت پیدا ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس سوال پر سنجیدگی سے غور نہ کیا جائے اور اس کا کوئی قابل عمل حل نہ نکالا جائے مسلمانوں کے اندر شدت پسندی کے رجحان کے لیے موجود امکانات پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ خارج میں یا معروضی طور پر کوئی امت ہی موجود نہیں تو ہم کہیں گے کہ امت کو تشکیل دینے والے طاقت ور مظاہر موجود ہیں جو کسی وقت بھی ایک خاص رخ اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان مظاہر کو کسی صورت ختم نہیں کیا جا سکتا۔ احیائے امت کا خواب فقط ماضی کی طرف پلٹنے کا نام نہیں بلکہ ان مظاہر کی بنیاد پر ایک نئی عمارت تعمیر کرنے کا نام ہے۔ مثال کے طور پر سارا سال مسلمان خانہ کعبہ کی طرف حرکت میں رہتے ہیں، کبھی عمرہ کی نیت سے اور کبھی حج کی نیت سے۔ ہر روز مسلمان اپنے اسی محسوس مرکز کو طرح طرح سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی طرف پاؤں کر کے سونے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس کی طرف منہ کر کے کئی مرتبہ نماز پڑھتے ہیں۔ ہر

روز مسلمانوں کے گلی محلوں سے ایک ہی طرح کی اذان گونجتی ہے۔ یہ اور ایسے دیگر مظاہر مسلمانوں کو ایک ہونے کا شعوری یا لاشعوری پیغام دیتے رہتے ہیں، جب اس کے ساتھ تاریخی افق بھی نمایاں ہو جاتا ہے تو ایک مسلمان کے دل میں اپنی عالمی وحدت کا تصور ابھرنے لگتا ہے۔ وہ وحدت جو زمان و مکان سے بے نیاز ہوتی ہے اور جس کا تشکل سیاسی اور عسکری قیادت کی صورت میں اسے نظر آتا ہے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بظاہر قومی ریاستوں کے وجود اور احیائے امت کے خواب کے مابین ایک تضاد دکھائی دیتا ہے۔ امت کی قیادت کا حق اسی فرد یا ادارے کو حاصل ہوگا جو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق احیائے امت کے خواب کے لیے قابل عمل اور قابل قبول راستہ تجویز کر سکے۔ البتہ ایک ایسا راستہ جو غیر مسلموں کو ٹکراؤ کا پیغام نہ دیتا ہو بلکہ دنیا کے سب مستضعفین اور محرومین کے دل میں بھی امید کا چراغ روشن کر دیتا ہو۔

۶۔ ۲۔ عالمگیریت کی طرف پیش رفت

۶۔ ۲۔ ا۔ پس منظر

اس سرزمین پر سب انسانوں کے ایک ہونے کا نظریہ نیا نہیں۔ دنیا میں بہت سے مصلح، مفکر، نبی، فلسفی اور سیاست دان ایسے آئے جنھوں نے انسان کو بحیثیت انسان دیکھا۔ جغرافیہ، زبان، رنگ اور نسب کی تقسیم کو انھوں نے عوارض میں سے شمار کیا اور انسان کے جوہر کو ایک مانا۔ علم منطق نے انسان کو جب بحیثیت انسان دیکھا تو اسے حیوانِ ناطق قرار دیا اور اسے بحیثیت نوع جنس حیوان سے عقل کے مابہ الامتیاز کی بنیاد پر جدا جانا۔ فلسفی تو دیکھتے ہی کلیات کو ہیں جو خارج میں ظہور نہیں رکھتیں لیکن انھیں ان کے تصورات کے مجرد ہونے کے باوجود انہی سے سروکار ہے۔ رہی بات نبی کی تو اُس کا تعلق کائنات کے پروردگار سے ہوتا ہے، وہ پروردگار جو سب انسانوں کا ایک ہی طرح سے رب ہے چونکہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کی اولاد، اس لیے وہ سب کے لیے ایک جیسا ہے اور سب اُس کے لیے ایک جیسے ہیں۔ نبی چونکہ اُس خدا کا نمائندہ ہوتا ہے اس لیے وہ اس کی نظر سے بندوں کو دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک فضل وفضیلت انسان ہونے کے لحاظ سے نہیں، اچھا انسان ہونے کے لحاظ ہے۔ بعض سیاستدان اور حکمران ساری زمین پر اپنی حکومت کے قیام کا خواب دیکھتے رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے بعض نے کوششیں بھی کی ہیں اور ان میں سے بعض جزوی طور پر کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

بہت سے نظریات، افکار، نظام، مذاہب، ادیان اور تہذیبیں بھی سرحدوں اور نسلوں سے ماوراقلب ونظر کو تسخیر کرتی رہی ہیں اور معاشرے کو اپنے زیر اثر لاتی رہی ہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔

بظاہر دنیا مختلف حوالوں سے تقسیم ہے لیکن اس کے باوجود عالمیت اور عالمگیریت کا تصور رفتہ

رفتہ پروان چڑھ رہا ہے۔ دورِ حاضر میں یہ عمل نسبتاً تیز رفتار معلوم ہوتا ہے۔

عالمگیریت کے عمل کی ماضی میں چند مثالیں ذکر کر کے ہم آگے بڑھتے ہیں:

۶۔۲۔۲۔ سکندر اعظم

سکندر اعظم 365 قبل مسیح میں پیدا ہوا، بیس سال کی عمر میں حکمران بنا اور 10 جون 323 قبل مسیح تک مقدونیہ کا حکمران رہا۔ ارسطو جیسا نامور فلسفی اُس کا استاد تھا۔ کم عمری میں تخت پر بیٹھا۔ پہلے اس نے یونان کی شہری ریاستوں کو فتح کیا، پھر مصر اور فارس کو زیرِ نگیں کیا اور کئی ایک دیگر ملکوں کو فتح کرتا ہوا ہندوستان تک آ پہنچا۔ اس طرح یورپ کے ایک قابلِ ذکر علاقے کے ساتھ ساتھ ایشیا کا بھی ایک بڑا رقبہ اس کے زیرِ نگیں آ گیا۔ پہلے مرحلے میں اُس کی فوج نے مسلسل جنگوں سے اُکتاہٹ کی وجہ سے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور واپسی پر وہ راستے ہی میں بیمار ہو کر 33 سال کی عمر میں چل بسا۔ تیرہ سالہ دورِ حکمرانی میں دو براعظموں کے اتنے بڑے رقبے پر حکمرانی قائم کر لینا تاریخ انسانی کا ایک بڑا واقعہ ہے۔

۶۔۲۔۳۔ رومی سلطنت

ماضی کی عظیم سلطنتوں میں سے ایک رومی سلطنت بھی ہے۔ دو حصوں میں تقسیم ہونے سے قبل روم اس کا دارالحکومت تھا۔ انگلستان، اسپین، فرانس، اٹلی، یونان، ترکی اور مصر اس سلطنت کا حصہ تھے۔ یہ حکومت کئی سو سال تک قائم رہی۔ اسی سلطنت کے ایک بادشاہ کنسٹنٹائن نے چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں مسیحی مذہب اختیار کر لیا جس کی وجہ سے مسیحیت ایشیا سے نکل کر یورپ میں جا پہنچی اور جب امریکہ دریافت ہوا تو برطانوی باشندوں کے ذریعے وہاں بھی اس نے اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا اور آج مسیحیت دنیا کے تمام براعظموں میں موجود ہے۔

۶۔۲۔۴۔ اسلامی سلطنت

ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلام آیا۔ مسلمانوں کی حکومت وسیع ہوتے ہوتے ایشیا کے بہت بڑے خطے پر پھیل گئی۔ افریقہ کے وسیع خطوں کو بھی مسلمانوں نے تسخیر کر لیا۔ سپین پر کئی سو سال مسلمانوں کی حکومت رہی۔ ایک ہزار سال تک مسلمانوں کا اقتدار تین براعظموں کے بہت

بڑے خطے پر قائم رہا۔ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار گذشتہ تمام بین الابراعظمی حکومتوں سے وسیع تر ثابت ہوا۔ آج وہ سیاسی اقتدار تو مسلمانوں کو حاصل نہیں تاہم اب بھی دنیا کا ہر چوتھا شخص مسلمان ہے اور دنیا کے تمام براعظموں میں اسلام کے پیروکار موجود ہیں۔

تمام رنگوں اور نسلوں میں خاص مذاہب وعقائد اور افکار ونظریات کا پھیلاؤ اور مقبولیت ان کے اندر موجود عالمگیر نظریاتی عناصر کی نشاندہی کرتے ہیں۔

جدید دنیا اور ماضی قریب سے بھی چند مثالیں بہت اہم ہیں۔

۶۔۲۔۵۔ استعماری دور کا آغاز

پہلے زمانے میں جنگیں عالمی نہیں ہوتی تھیں لیکن اقتصادی وسائل اور جنگی مشینری کی ترقی نے نام کے بغیر بعض قوموں کے اندر عالمی سلطنت کا ارمان پیدا کر دیا۔ اس کے نتیجے میں استعماری اور کالونیل قوتیں معرض وجود میں آئیں۔ سب سے کامیاب برطانیہ رہا جس نے اپنا اقتدار اتنا پھیلا لیا کہ اُس میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ فرانس نے بھی دنیا کے بہت سے ملکوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ بعض دیگر قوموں نے بھی معرکہ آرائی میں حصہ لیا۔ جرمنی اور جاپان نے بھی انگڑائیاں لینا شروع کیں۔ عالمی تسلط کی اس دور کے نتیجے میں بیسویں صدی میں دو عالمی جنگیں ہوئیں۔ ایک اس صدی کے آغاز میں اور دوسری نصف اول کے آخری حصے میں۔

۶۔۲۔۶۔ عالمی اداروں کا قیام

انہی عالمی جنگوں کے نتیجے میں عالمی اداروں کا تصور اُبھرا۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو اس کے فوراً بعد انگلستان، فرانس، جرمنی، ڈنمارک اور ناروے میں ایسی انجمنیں معرض وجود میں آئیں جو دنیا میں ہمیشہ کے لیے جنگ کے خاتمے اور امن کے قیام کی پرچم بردار تھیں۔ ان کی آواز آہستہ آہستہ ایک ایسی عالمی تنظیم کی خواہش میں تبدیل ہوگئی جو دنیا میں بقائے امن کے لیے مربوط کوششیں کر سکے۔

۶۔۲۔۷۔ لیگ آف نیشنز کا قیام

مذکورہ کوششوں کے نتیجے میں یکم جنوری 1920 کو جمعیت اقوام (League of Nations) قائم ہوئی۔ مختلف ملکوں نے اس کی رکنیت اختیار کر لی جن کی تعداد 60 تک جا پہنچی۔

یہ انجمن کچھ عرصہ قائم رہی۔ اس نے چند ایک قضیوں کے حل میں بھی اپنا کردار ادا کیا تاہم بڑی طاقتوں کی مفاد پرستی اور عالمی وسائل پر قبضے میں مقابلے کی روش نے اس پلیٹ فارم کو قضائے مبرم سے دوچار کر دیا۔ 18 اپریل 1946 کو اس کا آخری اجلاس ہوا۔

علامہ اقبال نے لیگ آف نیشنز کے قیام پر بہت بلیغ تبصرہ کیا تھا، وہ کہتے ہیں:

برفتد تا روشِ رزم درین بزم کہن
دردمندانِ جہان طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدی چند
بہر تقسیم قبور انجمنی ساختہ اند[۱]

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس انجمن کہن اور پرانی دنیا میں دنیا کے دردمندوں نے جنگ کی ایک نئی طرح کا آغاز کیا ہے اور میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ چند کفن چوروں نے قبور کی آپس میں تقسیم کے لیے ایک انجمن بنائی ہے۔

اس جمعیت اقوام میں تقسیم قبور ہی کے مسئلے پر جھگڑے پیدا ہونا شروع ہوئے۔ جرمنی اور اٹلی نے اسے خیر باد کہہ دیا اور بعد ازاں روس کو خود انجمن کے خود سروں نے اس میں سے نکال دیا۔ علامہ اقبال نے اس انجمن کی وفات حسرت آیات کی بھی پیش گوئی کی تھی:

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیران کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے[۲]

---

۱) کلیات اقبال فارسی، ص ۳۶۳، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، فروری ۱۹۷۳

۲) کلیات اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۶۱۸

۶۔۲۔۸۔گذشتہ مطالب پر ایک نظر

یہاں تک ہم نے جو مطالب پیش کیے ان کا خلاصہ یہ ہے:

اس سرزمین پر سب انسانوں کے ایک ہونے کا نظریہ نیا نہیں۔ دنیا میں بہت سے مصلح، مفکر، نبی، فلسفی اور سیاست دان ایسے آئے جنھوں نے انسان کو بحیثیت انسان دیکھا۔ بعض سیاستدان اور حکمران ساری زمین پر اپنی حکومت کے قیام کا خواب دیکھتے رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے بعض نے کوششیں بھی کی ہیں اور ان میں سے بعض جزوی طور پر کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ بہت سے نظریات، افکار، نظام، مذاہب، ادیان اور تہذیبیں بھی سرحدوں اور نسلوں سے ماورا قلب ونظر کو تسخیر کرتی رہی ہیں اور معاشرے کو اپنے زیر اثر لاتی رہی ہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ بظاہر دنیا مختلف حوالوں سے تقسیم ہے لیکن اس کے باوجود عالمیت اور عالمگیریت کا تصور رفتہ رفتہ پروان چڑھ رہا ہے۔ دور حاضر میں یہ عمل نسبتاً تیز رفتار معلوم ہوتا ہے۔ عالمگیریت کے عمل کی ماضی میں چند مثالیں بھی ہم ذکر کر چکے ہیں اس سلسلے میں کچھ مزید مثالیں اور پیش رفت آج کی سطور میں ذکر کرتے ہیں۔ گفتگو کا سلسلہ لیگ آف نیشنز کے قیام تک پہنچا تھا جو بعدازاں ختم ہوگئی اور پھر دوسری جنگ عظیم برپا ہوئی۔

۶۔۲۔۹۔اشتراکی انقلاب

روس کو لیگ آف نیشنز سے نکال دیا گیا لیکن کمیونسٹ انقلاب نے روس کو ایک نئے عالمی انقلاب کا پرچم بردار بنا دیا تھا۔ سوویت یونین کی تشکیل کے بعد اس نے دنیا کے دیگر خطوں میں پیش رفت شروع کی اور تیسری دنیا کے بہت سے ممالک میں اس کے زیر اثر کمیونسٹ پارٹیاں معرض وجود میں آگئیں۔ سوویت یونین کا اثرورسوخ اتنا بڑھا کہ امریکہ کی قیادت میں سرمایہ داری نظام کے مراکز نے اسے اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھنا شروع کر دیا۔ دوسری عالمی جنگ تو جاپان کے دو شہروں پر ایٹمی بمباری کے بعد ختم ہوگئی لیکن دنیا میں ایک نئی سرد جنگ کا آغاز ہوگیا۔

۶۔۲۔۱۰۔اقوام متحدہ کی تشکیل

اس دوران میں دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر ایک مرتبہ پھر بڑی طاقتوں نے اپنے آپ

کوتاہی سے بچانے اور عالمی سطح پر اپنے حق میں طاقت کا ایک توازن قائم کرنے کے لیے ایک نیا عالمی ادارہ قائم کیا جس کا نام سابق امریکی صدر روز ویلٹ کی تجویز پر تنظیم اقوام متحدہ United Nations Organization رکھا گیا۔ یہ پلیٹ فارم 24 اکتوبر 1945 کو معرض وجود میں آیا۔ اسی کے قیام کے بعد باقاعدہ لیگ آف نیشنز کے خاتمے کا بھی اعلان ضروری سمجھا گیا۔

اقوام متحدہ نے دنیا کے انسانوں کو بہت امیدوار کیا۔ تاریخ انسانی کا یہ سب سے بڑا عالمی ادارہ اور عالمی نیٹ ورک بن کر ابھرا۔ آج دنیا میں کوئی قابل ذکر ریاست خواہش کے باوجود سوچ تک نہیں رکھتی کہ اس کے دائرہ رکنیت سے باہر رہے۔

اس کے چارٹر کی تمہید میں لکھا ہے کہ ہم اقوام متحدہ کے لوگوں نے مصمم ارادہ کیا ہے کہ آنے والی نسلوں کو جنگ کی لعنت سے بچائیں گے جو ہماری زندگی میں بنی نوع انسان پر دو مرتبہ بے انتہا مصیبتیں لا چکی ہے۔ انسانوں کے بنیادی حقوق پر دوبارہ ایمان لائیں گے اور انسانی اقدار کی عزت اور قدر و منزلت کریں گے۔ مرد اور عورت کے حقوق برابر ہوں گے اور چھوٹی بڑی قوموں کے حقوق برابر ہوں گے۔ ایسے حالات پیدا کریں گے کہ عہد ناموں اور بین الاقوامی آئین کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو نبھایا جائے، آزادی کی ایک وسیع فضا میں اجتماعی ترقی کی رفتار بڑھے اور زندگی کا معیار بلند ہو۔

یہ مقاصد حاصل کرنے کے لیے رواداری اختیار کریں۔ ہمسایوں سے پرامن زندگی بسر کریں۔ بین الاقوامی امن اور تحفظ کی خاطر اپنی طاقت متحد کریں۔ نیز اصولوں اور روایتوں کو قبول کر سکیں، اس بات کا یقین دلائیں کہ مشترکہ مفاد کے سوا کبھی طاقت کا استعمال نہ کیا جائے۔ تمام اقوام عالم اقتصادی اور اجتماعی ترقی کی خاطر بین الاقوامی ذرائع اختیار کریں۔

اقوام متحدہ کی شق نمبر 1 کے تحت اقوام متحدہ کے مقاصد درج ذیل ہیں:

مشترکہ مساعی سے بین الاقوامی امن اور تحفظ قائم کرنا۔

قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بڑھانا۔

بین الاقوامی اقتصادی، سماجی، ثقافتی اور انسانوں کی بہتری سے متعلق گتھیوں کو سلجھانے کی

خاطر بین الاقوامی تعاون پیدا کرنا۔

☐ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے لیے لوگوں کے دلوں میں عزت پیدا کرنا۔

☐ ایک ایسا مرکز پیدا کرنا جس کے ذریعے قومیں رابطہ عمل پیدا کر کے ان مشترکہ مقاصد کو حاصل کر سکیں۔

آرٹیکل نمبر 2 کے تحت تمام رکن ممالک کا مرتبہ برابری کی بنیاد پر ہے۔

انسانی حقوق کا شعور پیدا کرنے میں اس ادارے کا بہت بڑا کردار ہے۔ انسانی مسائل کے بہت سے شعبوں میں اس کی قابل قدر خدمات ہیں۔ آفتوں کا مقابلہ کرنے اور بحالی صحت کے شعبوں میں بھی اس کی وسیع خدمات ہیں۔ بعض عالمی جھگڑوں کو نمٹانے میں بھی اس کا کردار ہے لیکن افسوس کہ ان خدمات کے باوجود اس ادارے پر دنیا کے زیادہ انسان اپنا اعتماد کھو چکے ہیں۔ اسے بڑی طاقتوں کے مفادات کا نگہبان اور ترجمان ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی جنرل اسمبلی جس کے تمام ممالک رکن ہیں، محض نمائشی اور بے اختیار ادارہ ہے۔ اس میں عالمی راہنما صرف آزادی سے تقریر کر سکتے ہیں۔ اس کا با اختیار ادارہ سلامتی کونسل ہے۔ تمام فیصلوں کا اختیار اس کے پاس ہے جس میں پانچ بڑی طاقتوں کے پاس ویٹو کا اختیار ہے۔ اس سلامتی کونسل نے بہت سے ظالمانہ فیصلے کیے ہیں۔ غریب اور پس ماندہ قوموں کا اس میں کوئی پرسان حال نہیں۔ خاص طور اس وقت یہ ادارہ امریکہ کا دم چھلہ بن چکا ہے۔ امریکہ اپنی فوجی اور اقتصادی طاقت کے بل پر اس میں بھی من مانی کرتا ہے، یہاں تک کہ عراق پر حملے میں سلامتی کونسل میں جرمنی اور فرانس کے ساتھ نہ دینے پر اس نے دھمکی دی کہ اگر میرا ساتھ نہ دیا تو ہم نئی اقوام متحدہ بنالیں گے۔ اقوام متحدہ کے تمام اہم اداروں پر انہی طاقتوں کو اجارہ داری حاصل ہے۔ یہ طاقتیں جیسا چاہتی ہیں یہ ادارے کردار ادا کرتے ہیں۔ یا کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے ان میں سے کوئی ایک طاقت نہ چاہے تو اقوام متحدہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ عالمی ایٹمی توانائی ایجنسی اور عالمی عدالت انصاف کا کردار اتنا غیر منصفانہ ہے کہ دنیا کے عام لوگوں کا اعتماد اقوام متحدہ سے متزلزل کر دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ بات دنیا پر آشکار ہو چکی ہے کہ یہ ادارہ دنیا میں منصفانہ امن کے قیام اور حقیقی طور پر تمام قوموں کی نمائندگی کرنے میں

ناکام ہو چکا ہے۔ اس میں موجود بڑی طاقتوں نے بہت سے خطوں میں جنگ کے شعلے بھڑکانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے اور اقوام متحدہ کا ادارہ فقط دیکھتا رہ گیا ہے۔ اس میں منظور کی گئی قراردادوں اور فیصلوں کے خلاف دنیا بھر میں مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔

۶۔۲۔۱۱۔ عالمی اداروں اور نظاموں کا زوال اور گروپس آف نیشنز کا قیام

اقوام متحدہ اپنے زوال کی طرف بڑھ رہی ہے اور اسی دوران میں دنیا کے دو بڑے معاشی نظاموں میں سے ایک زوال کا شکار ہو چکا ہے۔ سوویت یونین ٹوٹ چکا ہے۔ اشتراکیت کا رومانس جو دنیا کے طول و عرض میں کئی دہائیوں تک رہا، دم توڑ چکا ہے۔ اُسے پھر سے زندہ کرنے کی کوششوں کے لیے عوامی پذیرائی دکھائی نہیں دیتی۔

اقوام متحدہ کی شکل میں جو عالمگیریت معرض وجود میں آئی تھی اس کی بنیاد ''اقوام'' کو بنایا گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام کا تصور بھی خاصا کمزور پڑ گیا ہے۔ دنیا میں حاکم طاقتیں اب قومیں نہیں ہیں بلکہ چند قوموں کے گروپس ہیں۔ سب سے پہلے تو خود ریاست ہائے متحدہ امریکہ (United States of America) معرض وجود میں آیا جو پچاس ریاستوں کا ایک وفاق ہے۔ پھر دنیا میں فوجی اتحاد بھی معرض وجود میں آئے۔ ان میں سے نیٹو ابھی تک پوری قوت سے باقی ہے۔ یورپ کی بڑی ریاستوں نے بھی یورپی یونین بنالی جس کی اپنی پارلیمنٹ ہے اور یہ یونین بہت سے فیصلے مشترکہ طور پر کرتی ہے۔ اس کی اپنی کرنسی بھی دنیا کی اہم ترین کرنسیوں میں شمار ہونے لگی ہے۔ اگرچہ اس وقت برطانیہ نے اس سے جدا ہونے کا فیصلہ کیا ہے تاہم یورپی یونین ایک قابل ذکر طاقت کے طور پر باقی ہے۔ اس کے علاوہ بعض جگہ علاقائی اتحاد بھی اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔ ان میں مشرق بعید کے ممالک کا اتحاد آسیان اور شنگھائی کارپوریشن آرگنائزیشن اہم پلیٹ فارم ہیں۔ اصولی طور پر دیکھا جائے تو اکیلی ریاست کا تصور مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ کے عمل بھی ہوتے رہتے ہیں تاہم مجموعی طور پر دنیا اب گروپس آف نیشنز کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ صرف وہ ممالک ان اہم گروپس کا حصہ نہیں یا اہم حصہ نہیں جو بڑی طاقتوں کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں اور جدید استعماریت کی گرفت سے ابھی باہر نہیں آئے۔

۶۔۲۔۱۲۔عالمگیریت اور مذہب کا مستقبل

اس ساری بحث میں ابھی تک مذہب کے کسی محسوس کردار کا تذکرہ نہیں ہوا۔آئندہ ہم جدید عالمگیریت کے ظہور پر بات کریں گے اور اس امر کا جائزہ لیں گے کہ اس پس منظر اور پیش منظر میں مذہب کہاں کھڑا ہے اور کیا مذہب آئندہ کی تشکیلاتِ عالم میں کوئی کردار ادا کرے گا یا نہیں۔

۶۔۲۔۱۳۔نئی عالمگیریت کا ظہور

دنیا میں انفارمیشن ٹیکنالوجی اور مواصلات کی ترقی نے عالمگیریت کے نئے عناصر سے روشناس کروانا شروع کر دیا ہے۔دنیا کے انسانوں کی اکثریت ہم فکر اور ہم آواز ہوتی چلی جا رہی ہے۔ایک خطے کے لوگوں کی آواز دوسرے خطے میں جلد پہنچ جاتی ہے اور اپنے اثرات مرتب کرنا شروع کر دیتی ہے۔عالمگیریت کی ایک شکل دنیا کی بڑی عسکری اور اقتصادی طاقتوں کے مفادات کی ترجمان ہے۔وہ طرح طرح کے عالمی قوانین، عالمی اداروں اور فوجی اتحاد کے سہارے اپنے مفادات کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہے اور دوسری طرف دنیا میں عوام عالمی اداروں سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔لوٹ کھسوٹ کے عالمی نظام کے خلاف ردعمل پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔بڑی طاقتوں کی چھوٹے ممالک پر فوجی یلغار کے خلاف نفرت بھی منظم ہو رہی ہے۔اس کا ایک بہت بڑا مظاہرہ 2003 میں اس وقت دیکھنے میں آیا جب امریکہ و برطانیہ نے عراق پر چڑھائی کا منصوبہ بنایا۔امریکہ، یورپ اور بھارت میں دسیوں لاکھ انسان جارحیت پر مبنی اس منصوبے کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔ایک مسلمان ملک پر چڑھائی کے خلاف یہ عظیم ردعمل غیر مسلمان ملکوں میں دیکھنے میں آیا۔یہ عالمی رائے عامہ کے منظم ہونے کی ایک علامت تھی۔

اس کے بعد 2010 کے آخر میں تیونس میں انقلاب کا شعلہ بھڑکا جس نے شمالی افریقہ اور مشرق وسطی کے بہت سے ممالک کو اپنی گرفت میں لے لیا۔یہ لہر اس علاقے میں جاری تھی کہ امریکہ میں عوام وہاں کے سرمایہ داری نظام کے خلاف باہر نکل آئے۔وال سٹریٹ قبضہ اس نئے مظہر کی ابتدا تھی جو امریکہ کی مختلف ریاستوں میں پھیلنے کے بعد یورپ کے بڑے بڑے ممالک میں جا پہنچا اور اب اس کے اثرات دیگر براعظموں میں بھی محسوس کیے جا رہے ہیں۔دنیا کے چالیس

سے زیادہ ممالک کے تقریباً ایک ہزار شہروں میں بے انصافی اور ظلم کے خلاف بیک وقت مظاہروں کا ہونا پوری تاریخ انسانی میں ایک منفرد واقعہ ہے۔ یہ صورت حال عالمگیریت کی ایک نئی شکل ہے۔ اسے وقتی طور پر اگرچہ دبا لیا گیا ہے یا بعض جگہوں پر اس کا رخ پھیر لیا گیا ہے تاہم یہ کسی اور صورت میں زیادہ طاقت کے ساتھ نمودار ہو سکتی ہے۔

بہر حال یہ بات بالکل ثابت ہوگئی ہے کہ دنیا کے موجودہ حکمران نظام سے دنیا کے عوام کی اکثریت نالاں ہے۔ ظلم اور ظالم کی پہچان بھی علاقے، قوم اور رنگ و نسل سے ماورا ہے اور مظلوم و محروم انسانوں کی مشترکہ آواز بھی ایسی تقسیم سے بے نیاز ہے۔ اتنا ہی نہیں اس عالمی ابھار میں ادیان و مذاہب کا اختلاف بھی بظاہر پیچھے رہ گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آئندہ انسانوں کی تقسیم شاید ادیان اور اقوام کی بنیاد پر نہ رہے بلکہ ظالم و مظلوم کے مابین تقسیم کا تصور ابھرے۔ بعض لوگوں کے خیال میں حقیقی دین وہی ہے جو مظلوم کا حامی اور ظالم کا مخالف ہے۔

اس ساری عالمی کیفیت سے کیا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ دنیا ایک ایسے عالمی نظام یا عالمی مرکز یا عالمی حکومت کی طرف بڑھ رہی ہے جو تمام انسانوں کے ساتھ بلاتفریق عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے؟

کیا یہ انسانوں کے دل کی آواز ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر دنیا قوموں کے اتحاد کے طرف نہیں بنی آدم کے اتحاد اور بنی آدم کے عالمی مرکز کی طرف بڑھ رہی ہے۔ شاید اسی عالمی اتحاد کی ضرورت کی طرف علامہ اقبال نے اپنی مختصری نظم ''مکہ اور جنیوا'' میں اشارہ کیا ہے:

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم!
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم!
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟!

۱) کلیات اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۵۱۹ و ۵۲۰

یاد رہے کہ لیگ آف نیشنز کا ہیڈ کوارٹر نیو یارک نہیں بلکہ جنیوا ہوا کرتا تھا۔ مکے کا ذکر یہاں خانہ کعبہ کی وجہ سے کیا جا رہا ہے۔ خانہ کعبہ علامتی طور پر اللہ کا گھر ہے۔ اللہ کو تو کسی گھر کی ضرورت نہیں لیکن اللہ کا گھر بندوں کے مرکز کے عنوان سے اہمیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ [1]

کعبہ جو حرمت والا گھر ہے اُسے اللہ نے انسانوں کے قیام اور اُٹھ کھڑا ہونے کے لیے بنایا ہے۔

کعبہ میں قوموں کی نمائندگی نہیں ہوتی بلکہ وہاں سب انسان بغیر کسی تفریق کے اکٹھے ہوتے ہیں۔ مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف رنگ و نسل کے لوگ، ایک اللہ کے گھر کے گرد طواف کر رہے ہوتے ہیں۔ کسی کو وہاں پر ویٹو پاور حاصل نہیں۔ سب اللہ کے بندے یکساں ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال اسی لیے کہتے ہیں کہ وہاں جانے سے پہلے رنگ و نسب کا غبار جھاڑ دینا چاہیے:

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مُرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا [2]

یہ امر قابل توجہ ہے کہ کعبۃ اللہ کی اس حقیقت تک فکری رسائی کے لیے ضروری ہے کہ اس وقت جزیرہ نمائے عرب میں حکمران خاندان اور اس کے طرز حکومت و سیاست کو معیار نہ بنایا جائے کیونکہ جس تیز رفتاری سے اس خطے میں تبدیلیاں آ رہی ہیں ان کے نتیجے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم یہاں فقط خانہ کعبہ کی معنوی اور روحانی حیثیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

جب انسانوں کو ایسا مرکز میسر آ جائے تو اُنھیں پھر قیادت بھی ایسی درکار ہے جو:

☆ راہِ راست کی شناسا ہو۔

☆ انسانوں میں رنگ و نسب، زبان و جغرافیہ، دولت و طاقت کی بنیاد پر تفریق کی قائل نہ ہو۔

---

۱) مائدہ: ۹۷

۲) کلیات اقبال، بانگ درا، نظم طلوعِ اسلام، ص ۲۷۳

☆مظلوم کی مددگار رہو اور ظالم کے لیے شدید ہو۔

☆مساوی قانون اور قانونی مساوات کی علمبردار ہو۔

قوموں کے موجودہ تصور کے خاتمے اور ایک عالمی حکومت کی تشکیل کا تصور عالمی مفکرین و مدبرین کے ذہن میں بیسویں صدی میں سائنس کی ہوشربا ترقی کی وجہ سے زیادہ ابھر کر سامنے آیا۔ اس کی بنیاد مذہب نہ تھی بلکہ سائنسی ترقی کے نتیجے میں جو مسائل اور وسائل پیدا ہوئے ان کے پیش نظر ان کا خیال یہ رہا کہ اگر عالمی حکومت قائم نہ ہوئی تو سائنس کی مزید پیش رفت سے مزید مسائل پیدا ہوں گے اور دنیا مزید ناامن ہو جائے گی۔ یہ واضح ہے کہ عالمی حکومت کے قیام سے قوموں کی موجودہ تقسیم اور قومی ریاستوں کا وجود ختم ہو جائے گا اور دنیا کی تقسیم نئی انتظامی بنیاد پر مرکزی یا عالمی حکومت کرے گی۔ اس حکومت کا نظام کیا ہوگا، بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ ایک وفاقی حکومت ہوگی البتہ آنے والے حالات اس کی شکل وصورت کا فیصلہ کریں گے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ حکومت کو تمام علاقوں اور تمام قوموں (قوم جس معنی میں بھی لیا جائے) کا اعتماد حاصل ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسی حکومت ہر دین و مذہب کے ماننے والے کے لیے عدل و انصاف کا اہتمام کرے۔ ان بڑے مدبرین میں برٹرنڈرسل بھی شامل ہیں جنھوں نے سائنس کی پیش رفت کی بنیاد پر ایک عالمی حکومت کے قیام کا ذکر واشگاف الفاظ میں 29 نومبر 1949 کو رائل سوسائٹی آف لندن میں لیکچر دیتے ہوئے کیا۔ یہ لیکچر ان کی کتاب ''The Impect of Science on Society'' میں آخری لیکچر کے طور پر شامل کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے ''Can a Scientific Society be Stable?''۔

ان کے الفاظ ملاحظہ کریں:

> My conclusion is that a scientific society can be stable given certain conditions. The first of these is a single government of the whole world, possessing a monopoly of armed force and therefore able to enforce peace. The second condition is a general diffusion of prosperity, so that there is no occasion for

envy of one part of the world by another. The third condition (which supposes the second fulfilled) is a low birth rate everywhere, so that the population of the world becomes stationary, or nearly so. The fourth condition is the provision for individual initiative both in work and in play, and the greatest diffusion of power compatible with maintaining the necessary political and economic framework.

The world is a long way from realizing these conditions, and therefore we must expect vast upheavals and appalling suffering before stability is attained. But, while upheavals and suffering have hitherto been the lot of man, we can now see, however dimly and uncertainly, a possible future culmination in which poverty and war will have been overcome, and fear, where it survives, will have become pathological. The Road, I fear, is long, but that is no reason for losing sight of the ultimate hope.

اس کا ترجمہ بشیر احمد چشتی نے اردو میں یوں کیا ہے:

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر چند شرائط پوری کر دی جائیں تو سائنسی معاشرہ مستحکم ہوسکتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ دنیا میں واحد حکومت قائم ہو جس کے پاس مسلح افواج کی اجارہ داری ہوتا کہ وہ امن قائم رکھ سکے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ خوش حالی عام ہوتا کہ دنیا کے ایک حصے کو دوسرے سے حسد کرنے کا موقع نہ ہو۔ تیسری شرط (جس میں دوسری شرط کا پورا ہو جانا فرض کرلیا گیا ہے) یہ ہے کہ شرح پیدائش کم ہوتا کہ دنیا کی آبادی ایک جیسی رہے، یا تقریباً ایک جیسی۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ افراد کو کام اور کھیل دونوں میں ترقی کرنے کے مواقع میسر ہوں اور طاقت کی تقسیم اتنی زیادہ ہو

کہ وہ سیاسی اور معاشی ڈھانچے کے قیام کے ساتھ مطابقت کرے۔

دنیا ان شرائط کو بہت عرصے تک پورا نہیں کر سکتی، اس لیے استحکام کے حصول سے پیش تر بڑے پیمانے پر ہمیں انقلابات اور خوف ناک مصائب کی توقع رکھنی چاہیے۔ انقلابات اور مصائب ہمیشہ انسان کی تقدیر رہے ہیں لیکن اب ہم مستقبل میں ایک ممکن الحصول معراج دیکھ سکتے ہیں (چاہے وہ کتنا ہی غیر واضح اور غیر یقینی کیوں نہ ہو) جس میں افلاس اور جنگ پر غلبہ پا لیا جائے گا اور اگر کہیں خوف کا عنصر باقی رہا بھی تو اسے امراض میں شمار کیا جائے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ راستہ بہت لمبا ہے لیکن امید کا دامن چھوڑ دینے کی یہ کوئی وجہ نہیں ہے۔[1]

برٹرنڈ رسل کی کسی بات سے اختلاف رائے بھی کیا جا سکتا ہے مثلاً ممکن ہے کہ آبادی کے کم کرنے کا فیصلہ یا کسی مرحلے پر اسے روک دینے کا فیصلہ یا ایک خاص تدریج میں اس میں اضافے کا فیصلہ حالات کے تناظر میں کیا جائے برٹرنڈ رسل نے یہ بات اپنے دور کی غذائی اور دیگر پیداواری پہلوؤں کو سامنے رکھ کر کی ہے۔ البتہ عمومی عدل وانصاف اور دولت کی منصفانہ تقسیم اور اسی طرح سے اختیارات کی نچلی سطح پر تفویض کے نکات جو انھوں نے بیان کیے ہیں نہایت قابل قدر ہیں۔

البتہ ہماری رائے میں عالمگیر حکومت کائنات اور انسان کے بارے میں جامع شناخت کے بغیر پائیدار نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حکومت معنوی اور روحانی طور پر بھی مضبوط ہو۔ ایسی حکومت کا عدل وانصاف اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر ایمان نہایت ضروری ہے۔ کعبۃ اللہ کی مرکزیت کے حوالے سے جو نکات ہم نے سطور بالا میں پیش کیے ہیں وہ اسی فکری پس

[1] برٹرنڈ رسل: معاشرے پر سائنس کے اثرات، مترجم: بشیر احمد چشتی، لاہور مجلس ترقی ادب، جولائی 2014
نوٹ: ترجمے میں جہاں پر ''خوش حالی عام ہو'' ترجمہ کیا گیا ہے وہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ کیا جائے: ''خوش حالی کا پھیلاؤ عمومی ہو''۔

منظر میں ہیں۔

اگر ہمارا یہ فہم درست ہے تو پھر یہ بھی درست ہے کہ مسالک و مذاہب کی تقسیم عالمگیریت کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ دین و مذہب کے نام پر رائج خرافات کا خاتمہ اس ساری کشمکش میں یقینی معلوم ہوتا ہے تاہم یہ بات اتنی آسان بھی نہیں کیونکہ ایک طرف بڑی سرمایہ دارانہ طاقتیں جن کی دولت و عظمت کا انحصار انسانوں کو باہم تقسیم کرنے اور لڑانے پر ہے،ان کے پاس مذہب ایک بہت بڑا ہتھیار ہے اور دوسری طرف ان کا مقابلہ کرنے والی قوتیں اگر چہ وہ بظاہر ابھی کمزور ہوں مذہب پر ہی انحصار کرتی ہیں۔ ابھی تک مذہب سخت جانی اور سخت کوشی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ فرقہ پرست عناصر بھی بڑی طاقت رکھتے ہیں۔ بہت سے ملکوں میں اقتدار کا راستہ عوام کو مذہب کی بنیاد پر جذباتی کرنے سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ صورت حال کتنی دیر تک قائم رہے گی اور کن مرحلوں سے گزر کر ختم ہوگی، ابھی پیش گوئی کرنا ممکن دکھائی نہیں دیتا لیکن مندرجہ بالا نظائر یہ اطمینان دلاتے ہیں کہ اگر عام انسانوں پر حقائق آشکار ہو جائیں، جو مواصلات و روابط کی ترقی سے ممکن ہے، تو پھر بہر حال دنیا کو بدلنا ہے۔

استعماری طاقتوں کی ماہیت، مذہب کو اپنے خاص مقاصد کے لیے استعمال کرنے والوں کی ماہیت، بے رحم سرمایہ داروں کی ماہیت اور انسانوں کو تقسیم کرنے والی اور لوٹ مار کرنے والی طاقتوں کی ماہیت آشکار ہو جائے تو صورتحال بہر حال تبدیل ہو جائے گی۔ ہماری اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا بدل جائے، عدل و انصاف کی بالادستی ہو، قانونی مساوات پوری دنیا پر رائج ہو جائے، شرف انسانی کا احترام ہونا شروع ہو جائے تو پھر ہمیں دنیا کے سامنے حقائق ہی کو آشکار کرنے کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا میں وہ دین ہی باقی رہے گا جو آفاقی ہوگا ، انسان دوست ہوگا اور عدل و انصاف کا نگہبان ہوگا۔ ایسی خدا پرستی قبول کرنے میں کسی سادہ دل انسان کو مشکل پیش نہیں آئے گی۔

یہ بحث یہاں ختم نہیں ہوتی، تصور کائنات کا موضوع اس بحث کا حصہ ہے، خالص مادی تصورِ کائنات کسی اور نتیجے تک پہنچاتا ہے اور روحانی تصورِ کائنات کسی اور منزلِ فکر تک۔ ادیان میں

منقول ہوکر آنے والی پیش گوئیوں میں بھی آنے والے دور کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ان میں سے مہدی یعنی ہدایت یافتہ انسان کی قیادت کا تصور ہمارے نتیجہ فکر سے زیادہ ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے جس کے بارے میں متواتر اور پھیلی ہوئی پیشگوئیاں موجود ہیں جو اس نکتے پر آ کر متفق ہو جاتی ہیں:

وہ دنیا کو عدل وانصاف سے یوں بھر دے گا جیسے وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔[1]

یعنی صحیح دینی رہبر وہی ہوگا جو عدل انسانی کا پرچم بردار ہوگا اور ظلم کے خلاف قیام کرے گا۔

[1] شیخ صدوق، کمال الدین وتمام النعمۃ، ص ۲۸۷، باب ۲۵، ح ۴، سجستانی، سنن ابی داؤد، ج ۲، ص ۳۰۹، کتاب المہدی، ح ۴۲۸۲

معاصر مذہبیات: عناوین مطالب

۶۔باب ششم:آئینہ مستقبل